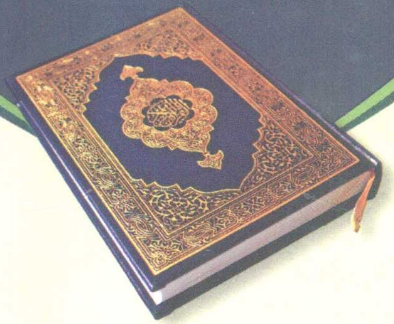
اعراب القرآن وتفسیره

(تیسواں پارہ، سوالاً جواباً)



اشراف

شیخ الحدیث حافظ محمد شریف حفظہ اللہ

پروفیسر نجیب اللہ طارق حفظہ اللہ

اعداد

عثمان علی، حافظ ابو بکر عثمان

حافظ احسان اللہ

نظر ثانی

شیخ الحدیث حافظ عبد العزیز علوی حفظہ اللہ

دار التربیۃ للنشر والتالیف

گلستان کالونی فیصل آباد

اعراب القرآن وتفسیرہ

(تیسواں پارہ، سوالاً جواباً)

اشراف
شیخ الحدیث حافظ محمد شریف حفظہ اللہ
پروفیسر نجیب اللہ طارق حفظہ اللہ

اعداد
عثمان علی، حافظ ابوبکر عثمان
حافظ احسان اللہ

نظر ثانی
شیخ الحدیث حافظ عبد العزیز علوی حفظہ اللہ

دار التربیۃ للنشر والتالیف
گلستان کالونی فیصل آباد

إعراب القرآن وتفسیرہ

(تیسواں پارہ [illegible])

اِشراف

شیخ الحدیث حافظ محمد شریف حفظہ اللہ

پروفیسر نجیب اللہ طارق حفظہ اللہ

اِعداد

عثمان علی، حافظ ابوبکر عثمان

حافظ احسان اللہ

نظر ثانی

شیخ الحدیث حافظ عبد العزیز علوی حفظہ اللہ

ناشر

دار التربیۃ للنشر والتالیف

گلستان کالونی فیصل آباد

اشاعت

2014ء

مطبع

مکتبہ اسلامیہ پرنٹنگ پریس لاہور

0300-8661763

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور: غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد

041-2631204 - 2641204

Email: maktabaislamiapk@gmail.com, Visit on Facebook page: maktabaislamiapk

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

مقدمہ

قرآن کریم اللہ رب العزت کی وہ عظیم نعمت ہے جسے بندوں کی ہدایت وتذکیر کے لیے نازل کیا گیا۔جس میں علیم وحکیم ہستی نے بیش بہا علوم ومعارف کا خزینہ ودیعت فرمایا ہے۔قرآن کریم کے علوم اور اس میں پنہاں حکمتیں ابدی اور لازوال ہیں۔صدیاں بیت جانے کے بعد بھی اس کے عجائب اور حقائق بالکل تازہ اور ہر دور کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں،ان سے ہر کوئی اپنی استطاعت وصلاحیت اور ظرف کے مطابق استفادہ کر رہا ہے۔

ابدی اور لازمی حقیقت یہ ہے کہ روئے زمین پر آج اگر کسی کے پاس اللہ تعالیٰ کا کلام اپنی اصلی صورت میں موجود ہے تو وہ خوش بخت صرف مسلمان ہیں،دنیا کے مختلف نظاموں اور طبقات کے ظلم وستم سے پسی ہوئی انسانیت کے لئے اگر کوئی مژدہ جانفزا اور نجات دہندہ ہوسکتا ہے تو وہ اسی کتاب ہدایت کا بتایا ہوا دستور کامل ہے جو ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی آخری کرن اور مشعلِ راہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر اس دور کا بڑا المیہ یہ ہے کہ اسی کتاب کے حاملین نہایت کسم پرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں مسلمانوں کے لئے قرآن مجید میں غلبہ واقتدار اور نصرت کی جو بشارتیں سنائی گئی ہیں آج وہ نظر نہیں آرہی ہیں اس انحطاط اور پستی کے اسباب میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا قرآن مجید کے ساتھ تعلق محض رسمی رہ گیا ہے اور بمصداق حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رفعت وعظمت اور پستی وتنزلی کا سبب تو یہی کتاب ہے،یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان اپنی عظمت کے ہر نشان سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

زمانہ نزول قرآن سے تاہنوز مفسرین اور مفکرین اس چمنستان ہدایت سے خوشہ چینی کرتے رہے ہیں ہر کسی نے اپنی رغبت اور دلچسپی کے مطابق قرآنی متن اور وحی ربانی کی تفسیر وتشریح میں اپنا حصہ ڈالا،جس سے علوم ومعارف کی نئی نئی جہات سامنے آئیں اور ہر مشرب کے لوگ برابر اس سے استفادہ کرتے رہے،سلف صالحین کی یہ تمام تر مساعی لوگوں تک اس پیغام ہدایت کو واضح طور پر پہنچانے کے لیے تھیں۔آج بھی اس کتاب ہدایت کی مختلف انداز سے خدمت کرنے والے سعادت مند لوگوں کی کمی نہیں ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود مالک کائنات نے اٹھائی ہے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ

لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹) کی نوید سے سارا سلسلہ وحی محفوظ ہو گیا اور مدتوں بعد بھی کوئی اس کتاب کی نظیر لا سکا اور نہ ہی اس کے الفاظ میں تحریف کر سکا، لیکن مختلف طبقات اور گروہوں نے اپنی اپنی مقصد برآوری کے لیے قرآن پاک کی معنوی تحریف کا سہارا لیا۔ جس کی بہت واضح مثالیں ہمیں صوفیاء، باطنیہ اور روافض کی تفاسیر میں نظر آتی ہیں۔ عصر حاضر میں گمراہ فرقوں کا اپنے مخصوص مسائل کو قرآن کریم کی متشابہ آیات سے کشید کرنا بھی تحریف معنوی ہی کے زمرہ میں آتا ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ خدمت قرآن کے شوق میں کچھ نا اہل اور فہم قرآن کی صلاحیت سے بے بہرہ لوگ بھی اس میدان میں گھس آئے ہیں جو تفسیر قرآن کے نام سے عجیب گل کھلا رہے ہیں۔ جس کا ایک نمونہ حال ہی میں شائع ہونے والا ترجمہ ''بیان الفرقان'' ہے۔ جس میں آیات کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جس کا عربی زبان ومحاورے سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں مثلاً ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ کا ترجمہ ''دنیا کی طلب میں دوڑنے والے جو ہانپ اٹھتے ہیں'' ﴿فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا﴾ کا ترجمہ ''پس اس دولت کو چھپا چھپا کر جمع کرتے ہیں'' ﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا﴾ کا ترجمہ ''پھر صبح کے وقت دیر تک سوتے ہیں'' کیا گیا۔ اسی طرح ﴿وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ کا ترجمہ ''اوران کے ہاتھیوں کے مقابلے میں تیز رفتار اونٹوں کے جھنڈ بھیجے'' کیا گیا۔ اس طرح کی کئی اور امثلہ موجود ہیں جن میں صریح لغوی اور معنوی تحریفات دیکھی جا سکتی ہیں۔ علم وبصیرت سے عاری ایسی کاوشوں پر خاموشی بھی ایک جرم ہے جس کو علماء برداشت کر رہے ہیں۔

ہماری نظر میں قرآن کریم جیسی عظیم کتاب کے متعلق ایسی روش اور جرأت کا اصل سبب قرآن کریم کے فہم وبصیرت میں حد درجہ انحطاط ہے، ایک بڑا طبقہ چند عصری علوم کو ہر چیز سمجھ بیٹھا ہے اور وحی ربانی کی طرف بالکل التفات نہیں کرتا، عصری تعلیم کے مراکز قرآن کا فہم وبصیرت پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں، آخر کار تکیہ اسلامی مدارس پر ہی رہ جاتا ہے جو اس گئے گزرے دور میں بھی دینی تعلیم اور عربی زبان وادب کی مقدور بھر خدمت اور اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہاں چند سالوں میں لفظی ترجمہ اور مخصوص تفسیری مباحث تو پڑھا دی جاتی ہیں لیکن اس سے ہمارے طلباء میں وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو قرآنی علوم سے حقیقی استفادہ کے لیے درکار ہے، اکثر وبیشتر طلبہ قرآن کے مشکل مقامات کے حل کی استعداد نہیں رکھتے اور قرآن فہمی اور علمی رسوخ کا معیار اس سے بہت فروتر ہو گیا ہے جو ہمارے اسلاف نے قائم کیا تھا۔

مجھے عرصہ پندرہ سال سے جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں ترجمہ قرآن کی تدریس کا موقعہ ملا، ترجمہ خود ایک فن ہے جس کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اس دوران بعض تفاسیر کے مطالعہ سے ایسے نحوی، صرفی، لغوی اور تفسیری نکات سامنے آئے جن کو ملاحظہ کر کے شدت سے احساس ہوا کہ علم تفسیر کے طلباء کے لئے ان نکات سے واقفیت انتہائی ضروری

ہے لیکن دوران تدریس یہ نکات طلباء کو بیان نہ کئے جا سکے، اسی شدت احساس کے تحت دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اپنی اور طلباء کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے سوالاً جواباً ایک ایسا کتابچہ تیار کیا جائے جس سے طلباء کو قرآن کریم کے عام مشکل الفاظ اور مقامات کے متعلق آگاہی حاصل ہو، اور وہ جان سکیں کہ لفظ کا لغوی اور اصطلاحی معنی، مادہ، محل اعراب اور وجہ اعراب کیا ہے؟ نیز مطالعہ قرآن کے دوران جو شکوک وشبہات در آتے ہیں یا جو شکوک وشبہات بزعم خویش مفسرین کے پیدا کردہ ہیں ان کا روایت ودرایت کے اصولوں کی روشنی میں بہترین حل پیش کیا جا سکے۔

طلباء اگر اس نہج پر محنت کر کے قرآنی علوم پر عبور حاصل کریں تو معاشرے میں ایک بہترین مفسر کے طور پر سامنے آسکتے ہیں۔ مزید برآں ان شاء اللہ وہ ان تمام جدید فتنوں کا بھی مقابلہ کر سکیں گے جو قرآن کریم کے متعلق پھیلائے جا رہے ہیں۔

ہمارے اس کام کے اولین ہدف طلباء کرام اور عام اساتذہ ومدرسین عظام ہیں جو اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے اس لیے متقدمین ومتاخرین کی اہم تفاسیر کو سامنے رکھ کر سوالاً جواباً یہ کتابچہ تیار کیا گیا ہے جس میں جدید شکوک وشبہات کا ازالہ، قرآن کریم کی صرفی ونحوی ابحاث، لغوی واصطلاحی مطالب کے علاوہ اہم تفسیری نکات کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتداءً صرف سوالنامہ شائع کیا گیا تھا جسے طلبہ واساتذہ کے درمیان تقسیم کیا گیا، بہت سے مدارس میں ہم نے خود پہنچایا، پھر اس کے بعد وفاق المدارس السّلفیہ کی سالانہ میٹنگ کے موقع پر حاضرین میں اسے تقسیم کیا گیا اور ان سوالات کے جوابات تیار کر کے بھیجنے والوں کے لئے انعام کا اعلان کیا گیا، جس کی بدولت دینی مدارس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور اسلامک ایجوکیشن انسٹیٹیوٹ مہنتانوالہ ضلع اوکاڑا کے طلبہ نے مختصر انداز میں مکمل جوابات تیار کئے اور انعام وصول کیا۔

اب ان سوالات کے جوابات شائع کیے جا رہے ہیں جن پر نظر ثانی شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی ﷾ نے فرمائی اور اگر کسی جگہ علمی کمزوری یا لغزش محسوس کی تو ہماری رہنمائی فرمائی، بعد ازاں ماہر علوم وفنون شیخ الحدیث حافظ محمد شریف ﷾ نے اس کو حرفاً حرفاً پڑھا اور بہت سے مقامات پر مفید تبدیلیاں اور اضافے کروائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین صلہ عطاء فرمائے۔ ان کے علاوہ شیخ التفسیر حافظ مسعود عالم ﷾ اور محقق العصر مولانا ارشاد الحق اثری ﷾ کی بیش قیمت آراء سے بھی گاہے بگاہے استفادہ کیا گیا۔

یہ بات بھی ضرور پیش نگاہ رہے کہ اس سلسلہ خدمت کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ عزیز طلباء کو شوق دلایا جائے

اور اس قابل بنایا جائے کہ وہ نہ صرف بہتر انداز سے قرآنی علوم کی مثبت خدمت اور ترویج میں حصہ لے سکیں بلکہ وہ جدید فتنوں اور تحریفانہ روش کا مسکت اور مدلل جواب بھی دے سکیں۔

اس موقع پر میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کو حقیقی طور پر جامعہ سلفیہ سے فارغ التحصیل میرے نہایت عزیز طلباء، متعلمین مرکز التربیہ الاسلامیہ عثمان علی (امسال پنجاب یونی ورسٹی سے ایم فل کر رہے ہیں)، حافظ ابوبکر عثمان اور حافظ احسان اللہ نے سرانجام دیا ہے۔ ابتدائی طور پر عثمان علی نے ''پارہ عمّ'' اور ابوبکر عثمان نے ''پارہ الٓمٓ'' پر جامعہ سلفیہ میں شہادۃ العالیہ کے حصول کے لئے علمی مباحث لکھیں، بعدازاں احسان اللہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ میں نے اس کام کی محبت اور تڑپ ان کے دل میں پیدا کی جس سے وہ اس علمی سفر میں گامزن رہے، اس طرح تین سال کی محنت شاقہ کے بعد الحمدللہ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس موقع پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کام کو انجام دینے والے طلبہ، اس کی مراجعت کرنے والے شیخ الحدیث حافظ عبدالعزیز علوی ﷾ اور حافظ محمد شریف ﷾ اور دیگر شیوخ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں، نیز ادارہ جامعہ سلفیہ، مرکز التربیہ، لائبریرین جامعہ سلفیہ و مرکز التربیہ، ان کے مہتمم حضرات، جناب احسان دانش (مکتبہ طارق اکیڈمی)، ادارہ بیت القرآن لاہور اور ڈاکٹر ارشد صاحب، محمد قاسم صاحب، شیخ محمد اسحٰق صاحب اور رائے محمد سلیم صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا حسن تعاون، مالی تعاون اور جذبہ خدمت ہر لمحے ہمارے لئے معاون و مددگار رہا۔

ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہیں کہ وہ ہم سب کا شمار خادمین قرآن میں کرے اور اس کام کو ہمارے اساتذہ کرام، والدین، جملہ معاونین اور ہمارے لیے صدقہ جاریہ اور ذریعہ نجات بنائے۔ آمین یا رب العلمین

حسن خاتمہ کا طالب

نجیب اللہ طارق

مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد

۱۳-۰۹-۱۴۳۵ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سوال: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا قواعد کالحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کریں۔

جواب: ''صرف اللہ کے نام سے جو بے حد رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے (میں قرات کرتا ہوں یا میرا قرات کرنا)۔''

سوال: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟

جواب: اس مسئلہ میں تین طرح کی بحث ہے: (۱) اس کا مقدر خاص ہے یا عام، (۲) مقدر فعل ہو گا یا اسم، (۳) مقدر مقدم ہو گا یا مؤخر۔

مقدر خاص ہے یا عام:

اس کا مقدر خاص یا عام دونوں ہو سکتے ہیں۔ عام طور پر اس کا مقدر ''اَشْرَعُ'' نکالا جاتا ہے، اگرچہ اس سے جملہ کی تکمیل ہو جاتی ہے لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ خاص فعل مقدر مانا جائے جس کام کی آپ ابتدا کر رہے ہیں۔ اگر قرات کا ارادہ ہے تو اَقْرَأُ، پینے کا ارادہ ہے تو اَشْرَبُ اور اگر لکھنے کا ارادہ ہے تو اَكْتُبُ مقدر نکالا جائے۔ اس سے کلام میں اختصاص، عمدگی اور نفاست پیدا ہوتی ہے۔

مقدر اسم یا فعل:

فعل مقدر ماننے سے کلام میں کوئی نقص تو نہیں آتا لیکن اسم کو مقدر ماننے سے کلام جملہ اسمیہ خبریہ ہو گی اور اس بات پر تمام نحاۃ کا اتفاق ہے کہ جملہ اسمیہ جملہ فعلیہ سے بدرجہا مختص اور مؤکد ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ﴾ (ہود: ٦٩) فرشتوں کا سلام منصوب یعنی سَلَّمْنَا سَلَامًا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سلام مرفوع سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ہے۔ فرشتوں کا جملہ فعلیہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سلام جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ علماء نحاۃ اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سلام فرشتوں کے سلام سے افصح اور احسن ہے۔ کیونکہ ان کا سلام جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ جملہ فعلیہ میں ثبوت نہیں بلکہ حدوث ہوتا ہے اور ثبوت حدوث سے قوی ہوتا ہے۔

مقدر مقدم یا مؤخر:

اگر مقدر مقدم مانیں تب بھی کلام میں کوئی نقص لازم نہیں آتا لیکن مؤخر ماننے سے کلام میں حصر اور اختصاص پیدا ہوگا۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِبْتِدَائِي" ترجمہ یوں ہوگا: صرف اللہ رحمان رحیم کے نام سے میری ابتدا ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں۔

اِسْم، الله، الرَّحْمٰن، الرَّحِيْم۔

جواب: اِسْم: "سَمَا يَسْمُو سُمُوًّا" (ن) سے مصدر ہے۔ اصل میں سِمْوٌ تھا۔ واو کو خلاف قیاس آخر سے حذف کیا اور اس کے عوض شروع میں ہمزہ وصلی بڑھا دیا۔ مادہ: س، م، و۔ معنی: نام۔

الله: اَلِهَ يَاْلَهُ اِلَاهَةً (ع) سے مصدر بمعنی اسم مفعول (مَاْلُوْهٌ: مَعْبُوْدٌ) ہے۔ اصل میں اِلَاهٌ تھا، جس پر الف لام تعریف کا داخل ہوا، اَلْاِلَاهُ ہوا، تو پہلے ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دی اور اجتماع ساکنین کی وجہ سے اسے گرا دیا اور لام کا لام میں ادغام کر دیا، پھر دوسرے لام کے بعد والے الف کو بھی کثرت استعمال کی وجہ سے گرا دیا تو الله ہوگیا۔ مادہ: ا، ل، ہ۔ (اعراب)

الرَّحْمٰنِ: رَحِمَ يَرْحَمُ رَحْمَةً وَرُحْمًا (ع) سے فَعْلَان کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ مادہ: ر، ح، م۔ معنی: بے حد رحم کرنے والا۔

الرَّحِيْمِ: رَحِمَ يَرْحَمُ رَحْمَةً وَرُحْمًا (ع) سے فَعِيْلٌ کے وزن پر اسم مبالغہ یا صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ر، ح، م۔ معنی: نہایت مہربان۔ (اعراب)

سوال: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کیا "الرَّحْمٰن" اور "الرَّحِيْم" میں کوئی فرق ہے؟

جواب: الرَّحْمٰن فَعْلَان کے وزن پر ہے، اس وزن میں معنی کی کثرت تو ہوتی ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ بھی رہے، مثلاً "عَطْشَانُ" بہت زیادہ پیاسا، "غَضْبَانُ" غصے سے بھرا ہوا۔ گویا الرَّحْمٰن کا معنی وہ ذات ہے جو سراسر رحمت ہے۔

الرَّحِيْم فَعِيْلٌ کے وزن پر ہے، جو کسی چیز میں مفہوم کے لزوم، دوام اور ہمیشگی کے لئے آتا ہے، وہ صفت اس سے جدا نہیں ہوسکتی، مثلاً عَلِيْمٌ، سَمِيْعٌ وغیرہ۔ یعنی الرَّحِيْم وہ ذات جس کی رحمت دائمی ہے، کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔

"الرَّحْمٰن" اور "الرَّحِيْم" دونوں صفتوں کے ملنے سے صفت رحمت کی وسعت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کا دوام بھی۔ (تفسیر القرآن الکریم: سورۃ الفاتحہ)

سُوْرَةُ النَّبَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣ كَلَّا
سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝٧
وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝٨ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝٩ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝١٠ وَّجَعَلْنَا
النَّهَارَ مَعَاشًا ۝١١ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝١٢ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝١٣
وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝١٤ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝١٥ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝١٦
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝١٧ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝١٨ وَّفُتِحَتِ
السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝١٩ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝٢٠ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ
مِرْصَادًا ۝٢١ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝٢٢ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝٢٣ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا
شَرَابًا ۝٢٤ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝٢٥ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝٢٦ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝٢٧
وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝٢٨ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝٢٩ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا
عَذَابًا ۝٣٠ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝٣١ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۝٣٢ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۝٣٣ وَّكَاْسًا
دِهَاقًا ۝٣٤ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝٣٥ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝٣٦ رَّبِّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝٣٧ يَوْمَ يَقُوْمُ
الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝٣٨ ذٰلِكَ
الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝٣٩ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ
يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝٤٠

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سورۃ النبا اور مرسلات دونوں میں قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل دیئے گئے ہیں اور مکذبین قیامت کو

خبردار کیا گیا ہے۔اسی طرح دونوں سورتوں میں جنت کی نعمتوں کی انواع اور جہنم کے عذابوں کی اقسام کا بھی تذکرہ ہے۔ نیز سورۃ المرسلات میں قیامت کے بارے قدرے اجمال ہے اور سورۃ النبا میں اس اجمال کی کچھ تفصیل ہے۔(المنیر)

سوال: اس سورت کا مضمون وموضوع کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع ومضمون احوال قیامت ہے۔اس روز متقین اور فجار کا انجام اور جزاوسزا کا تذکرہ ہے۔(المنیر)

سوال: ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ "عَمَّ" کی اصل بتائیں اور تعلیل کریں نیز بتائیں "يَتَسَآءَلُوْنَ" کیا صیغہ ہے؟

جواب: لفظ "عَمَّ" اصل میں "عَنْ مَا" تھا۔نون کو میم سے بدل کر میم میں ادغام کیا۔میم کا الف اس وقت حذف کیا جاتا ہے جب مَا استفہامیہ پر حرفِ جر داخل ہو، تاکہ "ما" استفہامیہ اور غیر استفہامیہ میں فرق کیا جا سکے ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾(الطارق:۵)

"يَتَسَآءَلُوْنَ" باب تفاعل 'تَسَاءَلَ يَتَسَاءَلُ' سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔مادہ: س، ء، ل۔

سوال: اگر "ما" سے قبل حرف جر آجائے تو کبھی "ما" کا الف حذف ہوتا ہے جیسے ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ اور کبھی الف حذف نہیں ہوتا جیسا کہ سورۃ الحج آیت نمبر ۲ میں ہے ﴿عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ اسی طرح "عَمَّاذَا" اور "لِمَاذَا" میں بھی "مَا" پر حرف جر داخل ہوا ہے لیکن الف حذف نہیں ہوا، اسکی وجہ ذکر کریں۔

جواب: جب "ما" موصولہ پر حرف جر داخل ہو تو اس کا الف حذف نہیں کیا جاتا مثلاً ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾(البقرۃ:۱۴۹) اور ﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾(الحج:۲) وغیرہ۔لیکن جب "ما" استفہامیہ پر حرف جر داخل ہو تو اس کا الف گرا دیا جاتا ہے تاکہ "ما" موصولہ اور "ما" استفہامیہ میں فرق کیا جا سکے مثلاً ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ ﴿قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى﴾(طٰہٰ:۱۲۵) ﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴾(النازعات:۴۳) وغیرہ۔

جب "ما" استفہامیہ کے بعد "ذا" ہو یعنی "ماذا" ہو جائے تو اس وقت اگر اس پر حرف جر داخل بھی ہو جائے تب بھی "ما" کا الف حذف نہیں ہوتا۔

سوال: ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ سوال کرنے والے کون لوگ تھے؟ اور وہ لوگ کس شخصیت سے سوال کرتے تھے یعنی "يَتَسَآءَلُوْنَ" کا مفعول بہ کیا ہے؟

جواب: سوال کرنے والے کفار مکہ تھے۔جو آپس میں بھی بعث بعد الموت کے بارے سوال کرتے تھے اور بطور استہزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بھی اس بارے سوال کرتے تھے۔قرآن کریم میں کئی مقام پر ان کے سوال وجواب کا ذکر

موجود ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيۡمٌ﴾ (یٰس: ۷۸) ''کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟'' باب تفاعل عموماً لازم استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کبھی متعدی بھی استعمال ہوجاتا ہے۔ (کشاف، روح المعانی)

سوال: کیا ﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ﴾ کو ''ما'' استفہامیہ سے بدل بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: بعض علماء کے ہاں ﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ﴾ کو ''ما'' استفہامیہ سے بدل بنانا جائز ہے البتہ بدل کی نسبت ﴿عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ﴾ کو فعل محذوف ''يَتَسَآءَلُوۡنَ'' کے متعلق کرنا بہتر ہے۔ (المنیر، انوار، البحر المحیط)

سوال: ﴿النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ﴾ سے مراد قیامت اور روز جزا ہے۔

سوال: ''النَّبَا'' اور ''الخبر'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: بعض کے نزدیک دونوں مترادف ہیں جب کہ امام راغب نے فرق ذکر کیا ہے کہ خبر عام ہے اور ''النَّبَا'' فقط اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کا قائل سچا ہو، وہ خبر عظیم فائدے پر محیط ہو اور اس سے علم (یقینی) یا ظن غالب حاصل ہو۔ (التحریر)

سوال: ﴿الَّذِىۡ هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿الَّذِىۡ هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ﴾ محل جر میں ہے، کیونکہ ''النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ'' کی صفت ہے۔ ''هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ'' کا کوئی محل اعراب نہیں۔ کیونکہ یہ ''الَّذِىۡ'' اسم موصول کا صلہ واقع ہو رہا ہے اور جو جملہ صلہ بن رہا ہو اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔

سوال: وہ کون سے جملے ہیں جن کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا؟

جواب: مندرجہ ذیل سات جملوں کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا: (الجمل التی لا محل لها من الإعراب)

(۱) الجملة المستأنفة: ﴿اَلۡمُؤۡمِنُ الۡقَوِىُّ خَيۡرٌ وَّاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِ الضَّعِيۡفِ﴾ (مسلم: ۶۷۷۴)

یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ اس لیے اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

(۲) الجملة المعترضة: ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ﴾ (الواقعہ: ۷۶)

''قَسَمٌ'' اور ''عَظِيۡمٌ'' موصوف صفت ہیں۔ ان کے درمیان ''لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ'' جملہ معترضہ ہے۔ اس لیے اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

(۳) الجملة المفسرة: ﴿فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا﴾ (المؤمنون: ۲۷) میں ''اَنِ اصۡنَعِ

الْفُلْكَ" جملہ مفسرہ ہے۔

(۴) جواب القسم: ﴿یٰسٓ ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ○ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (یٰس:۱، ۲، ۳) "اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ" جواب قسم ہے۔ اس لیے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

(۵) اگر جملہ ایسی شرط کا جواب واقع ہورہا ہے جو شرط غیر جازم ہو (یعنی ایسی شرط جو اپنے جواب کو جزم نہیں دیتی، جیسے: لو، لولا، لما اور کیف ہے) یا شرط جازم کا جواب ہو لیکن اس پر "فاء" یا "إذا" فجائیہ داخل نہ ہو تو اس کا بھی کوئی محل اعراب نہ ہوگا۔ مثلاً "لَوْ أَنْفَقْتَ لَرَبِحْتَ" میں "رَبِحْتَ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ "رَبِحْتَ" شرط غیر جازم کا جواب ہے اور "إِنْ تَقُمْ أَقُمْ" میں "أَقُمْ" شرط جازم کا جواب تو ہے لیکن اس پر "فاء" یا "إذا" فجائیہ داخل نہیں۔

(۶) اسم موصول کا صلہ یا موصول حرفی کا صلہ۔ مثلاً ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (الطلاق:۱۲) میں "خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ "اَلَّذِیْ" اسم موصول کا صلہ ہے، موصول حرفی جیسے "یَسُرُّنِی اَنْ تَفْرَحَ" یہاں اَنْ موصول حرفی ہے اور تَفْرَحَ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے کیونکہ یہ اَنْ موصول کا صلہ بن رہا ہے۔

(۷) مندرجہ بالا چھ جملوں کا تابع جملہ۔ مثلاً "جَاءَ الَّذِی ضَرَبَهٗ وَشَتَمَهٗ" میں "شَتَمَهٗ" کا بھی کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جملہ "ضَرَبَهٗ" کا تابع ہے اور "ضَرَبَهٗ" کا بھی کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ وہ اسم موصول کا صلہ ہے۔

سوال: ﴿الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ﴾ سے کون سے لوگ مراد ہیں؟ اور ان کے اختلاف کی نوعیت ذکر کریں۔

جواب: ﴿الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ﴾ سے مراد کفار ہیں۔ کیونکہ وہ قیامت کے بارے میں اختلاف کرتے تھے۔ بعض روزِ قیامت کے منکر تھے۔ کچھ اس روز جزا و سزا کے منکر تھے۔ (روح)

سوال: ﴿كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ﴾ "كَلَّا" کون سا حرف ہے اور کلام میں کس لئے لایا جاتا ہے؟

جواب: سیبویہ کے ہاں "كَلَّا" حرف ردع وزجر ہے جس کا اور کوئی معنی نہیں ہوتا۔

ابن فارس کے ہاں یہ کلام میں چار مقاصد کے لئے بولا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی بات کے رد کے لیے۔

۲۔ زجر و توبیخ کے لیے۔

۳۔ قسم کے لئے صلہ بن کر۔

۴۔ افتتاح کلام کے لئے جب یہ "أَلَا" کے معنی میں ہو۔ (معجم النحو، مغنی اللبیب)

سوال: ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ﴾ میں تکرار کا کیا مقصد ہے؟

جواب: (۱) ان جملوں میں تکرار کا مقصد محض تاکید اور مضمون کی پختگی ہے۔ (التحریر) چونکہ کفار روز جزا کا سختی سے انکار کرتے تھے اسی لئے ان کا رد بھی سختی ہی سے کیا گیا ہے۔ کفار تو حید ربوبیت کو مانتے تھے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صادق وامین مانتے تھے لیکن ان میں سے اکثر حیات بعد الممات کا تو وہ سرے سے ہی انکار کرتے تھے اور اسکو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن مجید میں سختی سے بیان کیا ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کیا کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور بالضرور بتایا جائے گا جو تم نے کیا اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے) (التغابن: ۷) ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ﴾ (ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دے کیوں نہیں، قسم ہے میرے رب کی! وہ تم پر ضرور آئے گی) (سبا: ۳) ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (ترجمہ: ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے۔ پھر ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے) (التکاثر: ۳، ۴)

(۲) پہلے "كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ" کا مقصد یہ ہے کہ کفار قبروں سے اٹھیں گے اس وقت اپنا انجام اور خبر کی صداقت جان لیں گے اور دوسرے "كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے اللہ جل شانہ انکو سزا دیں گے اس وقت اپنا انجام جان لیں گے۔ (عنبر الیم فی تفسیر عم)

سوال: ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ﴾ "سَيَعْلَمُوْنَ" کا مفعول کیا ہے؟

جواب: "سَيَعْلَمُوْنَ" کا مفعول بہ راجح قول کے مطابق "أَنَّ وُقُوْعَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَقٌّ" ہے۔ یعنی "سَيَعْلَمُوْنَ أَنَّ وُقُوْعَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَقٌّ۔"

سوال: ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ میں "مِهٰدًا" کا ترجمہ "فرش یا بچھائی ہوئی" کیا جاتا ہے حالانکہ "مِهٰدًا" مصدر ہے اور یہ اسم مفعول (مُمَهَّدًا) کا ترجمہ ہے وضاحت کریں کہ "مِهٰدًا" کا یہ ترجمہ کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: "مَهْدٌ" اور "مِهٰدًا" دونوں مصدر بمعنی "مُمَهَّدًا" ہیں۔ (مفردات)

چونکہ مصدر اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں ہوسکتا ہے، اس لئے "مُمَهَّدًا" نہ لانے کا اعتراض نہیں رہتا۔ یہ تسمیۃ المفعول بالمصدر ہے۔ (کشاف)

سوال: ﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ "اَوْتَادًا" کس کی جمع ہے؟ اور اسکا معنی کیا ہے؟

جواب: "اَوْتَادًا" "وَتَدٌ" کی جمع ہے جس کا معنی "میخیں" ہے۔

سوال: ﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ کا معطوف علیہ ذکر کریں اور اس عطف کا اصطلاحی نام بھی بتائیں۔

جواب: ﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ کا عطف "الْاَرْضَ مِهٰدًا" پر ہو رہا ہے۔ اس عطف کو اصطلاح میں "اَلْعَطْفُ عَلٰی مَعْمُوْلَی عامل واحد" کہتے ہیں۔

سوال: ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾ کا معطوف علیہ ذکر کرتے ہوئے ترجمہ کریں۔

اس کا معطوف علیہ ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ ہے۔ چونکہ اس کے معطوف علیہ میں استفہام ہے اس لئے یہاں بھی لامحالہ استفہام موجود ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا: "کیا ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا نہیں کیا؟" اسی طرح آگے والی آیات میں بھی استفہام والا ہی معنی کریں گے۔ (اعراب، تدبر، البیان)

سوال: ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾ میں "اَزْوَاجًا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "اَزْوَاجًا" "كُمْ" ضمیر سے حال بننے کی وجہ سے منصوب ہے۔ بعض کے نزدیک "خَلَقْنَا" کا مفعول ثانی ہے۔

سوال: ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾ "أزواج" کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟

جواب: "أزواج" کا اطلاق ہر چیز کے جوڑے پر ہوتا ہے۔ ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (الذٰریٰت: ۴۹) لیکن اس جگہ "أزواج" سے مراد مرد اور عورت ہیں۔ (رازی، تدبر)

سوال: ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ○ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ کیا "جَعَلَ" اور "خَلَقَ" میں کوئی فرق ہے؟

جواب: "خلق" میں کسی ذات کی مکمل تخلیق ہوتی ہے جب کہ "جَعَلَ" میں ذات یا چیز کی مکمل تخلیق نہیں ہوتی بلکہ اس کی کسی حالت کی تخلیق کا تذکرہ ہوتا ہے۔ (التحریر) یہ عمومی قاعدہ ہے، ورنہ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ میں خَلَقَ کے معنی ہی ہیں۔

سوال: ﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ "سُبَاتًا" کا ترجمہ، صیغہ اور وجہ اعراب بتلائیں؟

جواب: "سُبَاتًا" مصدر ہے بمعنی "قطعا" تو معنی ہوگا "وجعلنا نومکم قطعاً لِعَمَلِ الجسد" ترجمہ: ہم نے تمہاری نیند کو جسمانی اعمال ختم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ (مفردات) "سُبَاتًا" آرام وراحت کے معنی میں بھی آتا ہے۔

"سُبَاتًا" "جَعَلْنَا" کا مفعول ثانی ہے۔

سوال: ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ "مَعَاشًا" کون سا صیغہ ہے؟

جواب: "معاش" باب "عَاشَ یَعِیْشُ" سے مصدر میمی ہے۔ مادہ: ع، ی، ش۔ چونکہ لغت میں "معاش" ظرف زماں کے طور پر مستعمل نہیں ہے، اس لیے اس سے پہلے لفظ "وقت" محذوف نکالیں گے یعنی "وَجَعَلْنَا النَّهَارَ وَقْتَ مَعَاشٍ" جیسا کہ کہا جاتا ہے "اٰتِيْكَ طُلُوْعَ الْفَجْرِ أَيْ وَقْتَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ" (اعراب)

سوال: ﴿وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ "شِدَادًا" کی واحد کیا ہے؟

جواب: "شِدَادًا" "شَدِيْدَةٌ" کی جمع ہے۔ (اعراب)

سوال: کیا "سَبْعًا شِدَادًا" سے پہلے کوئی موصوف محذوف نکالنے کی ضرورت ہے؟

جواب: "سَبْعًا شِدَادًا" سے پہلے "سمٰوٰتٍ" محذوف ہے، جس کی "سَبْعًا" صفت ہے۔

سوال: ﴿وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ میں لفظ "بَنَيْنَا" کیوں بولا حالانکہ یہ اس چیز کیلئے بولا جاتا ہے جس کی زمین میں کوئی بنیاد موجود ہو؟

جواب: یہاں آسمان کے لیے لفظ "بَنَيْنَا" اس لئے بولا گیا کہ جس طرح بنیاد آفتوں اور توڑ پھوڑ سے محفوظ رہتی ہے، اسی طرح آسمان کو ان آفات اور توڑ پھوڑ سے محفوظ قرار دینے کے لیے لفظ "بنينا" بول دیا گیا۔ (رازی)

سوال: ﴿وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا﴾ "وهّاج" کا ترجمہ اور صیغہ بتلائیں۔

جواب: وهّاج: "وَهَجَ يَهِجُ وَهْجًا" (ض) سے صفت مشبہ ہے اور اس سے مبالغہ مراد ہے۔ مادہ: و، ہ، ج۔
ترجمہ: "وهّاج" "بہت زیادہ روشن اور گرم چراغ" اس میں گرمی اور روشنی دونوں معانی پائے جاتے ہیں۔ (قاموس)

سوال: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ میں "مُعْصِرٰت" کیا صیغہ ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: "مُعْصِرٰت" "أَعْصَرَ يُعْصِرُ إِعْصَارًا" سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ع، ص، ر۔ جس کے معنی عرق ریزی اور نچوڑنے کے ہیں۔ معصرات معصرة کی جمع ہے جس کے معنی ہے: پانی سے بھرے ہوئے بادل جو برسنے کے قریب ہوں۔ اہل عرب "اعصرت السحابة" اس وقت کہتے ہیں جب بادل برسنے کے قریب ہوں۔ اعصر کے ہمزہ میں "ابھی، وقت" کا معنی متضمن ہے۔ باب افعال میں اکثر ایسا معنی ہوتا ہے جیسا کہ "احصد یا اجز الزرع" اس وقت کہا جاتا ہے جب کھیتی کے کاٹنے کا وقت قریب ہو۔ باب افعال کے اس ہمزہ کو "همزة حينونة" (وقت کو ظاہر کرنے والا ہمزہ) کہتے ہیں۔ یہ اس وقت لایا جاتا ہے جب کوئی چیز اس قابل ہوجائے کہ اس سے مطلوبہ فعل صادر ہوسکے۔ (تفصیل کیلئے: التحریر، روح، کشاف)

سوال: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ "ماءً ثجّاجا" سے کیسا پانی مراد ہے؟ نیز "ثجّاجا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "ماء ثجاجا" سے مراد زوردار موسلا دھار پانی (بارش) ہے۔ یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً ﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾ (بہنے والا پانی) اور متعدی بھی، مثلاً حدیث میں ہے ﴿وما الحج؟ قال: العج والثج﴾ ترجمہ: بلند آواز سے تلبیہ کہنا اور خون بہانا۔ (ابن ماجہ: ۲۸۹۶، حسن لغیرہ) (رازی، تدبر)

ثجاجا: ثَجَّ يَثِجُّ ثُجُوجًا (ض) سے اسم مبالغہ ہے۔ اگر یہ باب ضرب سے ہو تو اس وقت یہ لازم ہوگا اور اس کا معنی 'بہنا' ہوگا اور اگر یہ باب نصر سے ہو تو اس وقت یہ متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی 'بہانا' ہوتا ہے۔ مادہ: ث، ج، ج۔ (قاموس)

سوال: ﴿لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا﴾ "حَبًّا" اور "نبات" میں کیا فرق ہے؟ اور یہ کیا صیغے ہیں؟

جواب: جو چیز بھی زمین سے اُگتی ہے دو طرح کی ہو سکتی ہے: اس کا تنا ہوگا یا نہیں۔ اگر تنا نہیں ہوگا تو اس چیز پر غلاف ہو گا یا نہیں اگر غلاف ہوگا تو وہ "حب" ہے۔ اگر غلاف نہ ہوگا تو وہ گھاس ہوگی اسے "نبات" کہتے ہیں۔ (رازی)

حَبًّا: "حَبَّة" کی جمع ہے۔ اسکی جمع الجمع 'حُبُوب' آتی ہے۔ مادہ: ح، ب، ب۔

نباتا: "نَبَتَ يَنْبُتُ" سے مصدر ہے جو کہ اسم فاعل 'نَابِتٌ' کے معنی میں ہے۔ مادہ: ن، ب، ت۔ (التحریر، قاموس)

سوال: کسی کا ﴿لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا﴾ سے یہ استدلال کرنا درست ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے واسطے سے کوئی فعل سرانجام دیتے ہیں؟

جواب: کسی کا یہ استدلال کرنا باطل ہوگا۔ کیونکہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے اور اللہ نے ہماری سمجھ وفہم کے لئے اسباب مہیا کیے ہیں ورنہ اس سے اوپر کی آیات میں اللہ کی قدرت کے کئی مظاہر کا تذکرہ ہے جو اللہ بغیر کسی مثل اور نظیر کے ان چیزوں کی پیدائش کی قدرت رکھتا ہے وہ کسی واسطے کا کیونکر محتاج ہو سکتا ہے؟ (رازی)

سوال: ﴿وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا﴾ "ألفاف" کس کی جمع ہے؟ اور اس کا معنی کیا ہے؟

جواب: "أَلْفَافٌ" 'لِفٌّ' یا 'لَفِيفٌ' کی جمع ہے۔ اس کا معنی گنجان ہونا ہے۔ (مصباح اللغات، قاموس، اعراب)

البتہ شیخ عبدالسلام بھٹوی صاحب نے اسکی واحد 'لَفَّاء' اور جمع 'لُفٌّ' اور جمع الجمع 'أَلْفَافٌ' بتائی ہے۔ لسان العرب میں بھی اسکی طرف اشارہ موجود ہے۔

سوال: ﴿وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ تا ﴿وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا﴾ کا ماقبل مضمون سے کیا تعلق ہے؟

جواب: آیت نمبر ۶ تا ۱۶ میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے مظاہر منکرین قیامت کے لیے بطور استشہاد بیان کئے کہ جو ذات ان عظیم اشیاء پر قدرت رکھتی ہے اس کے لئے روز قیامت انسانوں کو جمع

کرنا کون سا مشکل کام ہے؟۔(تفہیم،تدبر)

سوال: ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا﴾ "میقات" کون سا صیغہ ہے؟اور منصوب کیوں ہے؟

جواب: "میقات" "وَقَتَ يَقِتُ وَقْتًا" (ض) سے ظرف زماں ہے۔مادہ: و،ق،ت۔اور "كَانَ" کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اصل میں مِوْقَات تھا،میزان والے قاعدے کے تحت واؤ کو کسرہ کی مناسبت سے یاء سے بدل دیا۔(انوارالبیان)

میقات کبھی زمان کے لیے آتا ہے مثلاً ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا﴾ اور کبھی مکان کے لیے آتا ہے مثلاً "میقات حج۔"(مفردات القرآن)

سوال: ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ میں "يَوْمَ" پر فتح کیوں آیا ہے؟

جواب: "يَوْمَ يُنْفَخُ" میں "يومَ" پر نصب اس لئے ہے کہ یہ "يَوْمَ الفصل" سے بدل ہے یا عطف بیان ہے۔ یا "میقاتاً" کا بدل ہے۔واللہ اعلم (انوارالبیان)

سوال: ﴿يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ اس جملہ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "يومَ" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ "صُوْر" سے کیا مراد ہے؟

جواب: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صُوْر سے مراد "قرن" یعنی سینگ ہے جس میں صور پھونکا جائے گا۔(الطبری،ابوداؤد: ۴۷۴۲،صحیح) اس زمانے میں دور تک آواز پہنچانے کے لئے "قرن" مشہور تھا اور اسکی آواز سن کر لوگ جمع ہوتے تھے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ میں ﴿فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿فَتَأْتُوْنَ أَفْوَاجًا﴾ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا "ینفخ" پر عطف ہے۔(اعراب)

سوال: "أفواجا" کی واحد ذکر کرتے ہوئے بتائیں کہ یہاں "أفواجا" جمع لانے میں کیا حکمت مضمر ہے؟

جواب: "أفواجا" کی واحد "فوج" ہے اور اسے جمع لانے کی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ روز قیامت لوگ مختلف جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں آئیں گے۔جس طرح قرآن پاک میں ہے: ﴿كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيْرٌ﴾ (الملک: ۸)۔(ترجمہ: جب کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا تو جہنم کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی

ڈرانے والا نہیں آیا؟) اسی منظر کی تصویر کشی ﴿فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا﴾ میں کی گئی ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا﴾ اور ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام:۹۴) میں تطبیق ذکر کریں۔

جواب: جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو ''فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا'' کی صورت میں پیش ہوں گے اور جب اللہ رب العزت کے روبرو پیش ہوں گے تو اس وقت ''جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى'' کی کیفیت ہوگی۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا﴾ ''أفواجًا'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: ''أفواجًا'' ''تأتون'' کی ''أنتم'' ضمیر سے حال ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: یعنی یہ آسمان جو آج نہایت محکم اور ایک گنبد بے در کی شکل میں نظر آ رہا ہے، اس دن اس طرح کھول دیا جائے گا کہ اس میں ہر طرف دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ ''فُتِحَتِ السَّمَآءُ'' کا محل اعراب کیا ہے؟ اور ''اَبْوَابًا'' منصوب کیوں ہے؟ نیز بتائیں کہ یہاں ''كَانَتْ'' کس معنی میں ہے؟

جواب: ''فُتِحَتِ السَّمَآءُ'' محل جر میں ہے کیونکہ ''ينفخ'' پر معطوف ہے۔ اور ''اَبْوَابًا'' كَانَتْ کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس آیت میں ''كَانَتْ'' ''صَارَتْ'' کے معنی میں ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ ''فَكَانَتْ اَبْوَابًا'' میں ''ف'' کون سی ہے؟ نیز ''ف'' کن معانی کیلئے آتی ہے؟

جواب: فاء عاطفہ ہے۔ اور فاء عموماً پانچ معانی کے لیے ہوتی ہے۔

الفاء العاطفة: جاء زيدٌ فَسَعْدٌ۔

الفاء الزائدة: ألذي يأتي فله درهم۔

الفاء السببية: ﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ﴾ (طٰہٰ:۸۱)

الفاء بجواب الشرط: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱)

الفاء الفصيحة: ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (البقرة:۶۰) أي فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ۔

فائے فصیحہ میں معطوف علیہ حذف کر دیا جاتا ہے کیونکہ معطوف خود محذوف علیہ پر دلالت کر رہا ہوتا ہے۔ (معجم النحو)

سوال: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ احوال قیامت کو صیغہ ماضی سے بیان کرنے کی حکمت واضح کریں۔

جواب: صیغہ ماضی کے ساتھ احوال قیامت بیان کرنے کا مقصد ''تحقق وقوع'' ہے گویا کہ قیامت واقع ہو چکی ہے۔

سوال: ﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ ''سَرَابًا'' کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: ''سراب'' سے مراد ہے کہ جب انسان صحرا میں چل رہا ہو تو دھوپ کے وقت انسان کو ریت کے ذرات پانی کی طرح نظر آتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ پانی نہیں ہوتا بلکہ انسان کا فریب نظر ہوتا ہے۔ (التحریر)

یہاں مراد یہ ہے کہ پہاڑ ریت بن جائیں گے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا﴾ (المزمل: ۱٤) اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔

سوال: ﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا﴾ ''مِرْصَادًا'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: مِرْصَادًا: ''رَصَدَ يَرْصُدُ رَصْدًا'' (ن) سے مِفْعَال اسم آلہ کے وزن پر ہے لیکن اس سے مراد مکان ہے جیسے ''منہاج'' اور ''مِشکوٰۃ'' ہے۔ (التحریر) صاحب اعراب کے نزدیک یہ مبالغہ کے وزن پر ہے۔ مادہ: ر،ص،د۔

سوال: ﴿لِلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا﴾ ''طاغین'' کی صرفی تحلیل کرتے ہوئے مکمل صیغہ بتائیں۔

جواب: ''طٰغِين'' ''طَغٰى يَطْغٰى طَغْيًا وَطُغْيَانًا'' (ف) سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ط،غ،ی۔ اصل میں ''طاغِيِين'' تھا۔ اس کی رفعی حالت ''طَاغُوْن'' ہے۔

سوال: ﴿لِلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا﴾ ''مَاٰبًا'' منصوب کیوں ہے؟ اور یہ کیا صیغہ ہے؟

جواب: ''مَاٰبًا'' ''کانت'' کی خبر ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ ''اٰبَ يَؤُوْبُ اَوْبًا وَاِيَابًا'' (ن) سے ظرف مکان ہے۔ اصل میں ''مَاْوَب'' تھا، واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن، واؤ کی حرکت ماقبل کو دے کر واؤ کو الف سے بدل دیا۔ مادہ: ا،و،ب۔

سوال: ﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ ''لٰبِثِيْنَ'' نصبی حالت میں کیوں ہے؟

جواب: کیونکہ یہ ''طاغین'' سے حال بن رہا ہے۔

سوال: ﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ ''اَحْقَابًا'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: ظرف زمان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ''لٰبِثِيْنَ'' کے متعلق ہے۔

سوال: ﴿لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾ "اَحْقَابًا" کیا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق کتنے زمانے پر ہوتا ہے؟

جواب: "اَحْقَابًا" "حُقُبٌ" کی جمع ہے۔ جس کا اطلاق عموماً ۸۰ سال پر ہوتا ہے اور "حُقُبٌ" "حِقْبَة" کی جمع ہے جو مطلق زمانے کو کہتے ہیں جس کی تحدید نہیں ہے۔ اس اعتبار سے "اَحْقَابًا" ایک لامتناہی زمانے کو کہتے ہیں کہ ایک حقب ختم ہوگا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔ (رازی، کشاف)۔ امام حسن بصری کے ہاں چونکہ جمع کی کوئی حد نہیں ہوتی اس لئے یہاں "اَحْقَابًا" لامتناہی زمانے کے معنی میں ہے۔ (لغات القرآن، انوار البیان)

سوال: ﴿لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾ کے مطابق کیا جہنمی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے یا کبھی ان کی سزا ختم بھی ہو جائے گی؟

جواب: ﴿لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ "حُقُب" ختم ہو جائیں گے اور تمام جہنمی جہنم سے نکل جائیں گے لیکن یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ کئی دوسری آیات میں بصراحت موجود ہے کہ کچھ جہنمی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (ترجمہ: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ) (الجن: ۲۳)

ویسے بھی "اَحْقَابًا" مجمل ہے اور قاعدہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل سے کی جاتی ہے، اس لئے مفصل آیات کے مطابق کچھ ایسے بدبخت ہوں گے جو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ (تفہیم، الثمین، تدبر، الکشاف)

سوال: ﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا﴾ جملہ "لَا یَذُوْقُوْنَ" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: جملہ "لَا یَذُوْقُوْنَ" "لٰبِثِیْنَ" کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا﴾ "برد" اور "شَرَابًا" کس معنی میں ہے؟

جواب: لفظ "بَرْدٌ" ٹھنڈک اور نیند دونوں معانی میں استعمال ہوسکتا ہے۔ اور "شَرَابًا" سے مراد ہے "ہر وہ چیز جو پینے کے قابل ہو" (المنیر، اعراب، التحریر)

سوال: ﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا﴾ میں استثناء متصل ہے یا منقطع؟

جواب: اگر "بَرْدًا" بمعنی نیند ہو تو یہ بالاتفاق استثناء منقطع ہے۔ (فتح القدیر، الثمین)

اگر "بَرْدًا" بمعنی ٹھنڈک ہو تو بعض کے نزدیک استثناء متصل ہے، یعنی "حمیما" "بَرْدًا" سے اور "غَسَّاقًا" "شَرَابًا" سے مستثنیٰ ہے، صاحب التحریر کے ہاں اس صورت میں بھی استثناء منقطع ہی ہے کیونکہ ان کی جنس مختلف ہے۔ صاحب اعراب کے ہاں "حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا" "شرابا" سے بدل ہیں۔ (اعراب، المنیر، انوار)

سوال: ﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا﴾ "حَمِیْمًا" اور "غسّاق" کیا صیغے ہیں اور ان سے کون سا عذاب مراد ہے؟

جواب: حمیم: "حَمَّ یَحُمُّ حَمًّا" (ن) سے واحد مذکر صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ح، م، م۔

غسّاق: "غَسَقَ یَغْسِقُ غَسْقًا" (ض) سے واحد مذکر اسم مبالغہ ہے۔ مادہ: غ، س، ق۔

حمیم: کھولتا ہوا پانی اور "غساق" سے مراد زخموں سے بہنے والا مادہ ہے جو پیپ کہلاتا ہے۔ (انوار، رازی)

"حمیم" کا لفظ اضداد میں سے ہے جس سے "ٹھنڈا اور گرم پانی" دونوں ہی مراد ہوتے ہیں۔ (لسان)

سوال: جہنم میں عذاب کتنی قسم کا ہوگا؟

جواب: جہنم میں عذاب کئی قسموں کا ہوگا۔ جن میں آگ اور ٹھنڈک کا بھی ہوگا جیسا کہ آیت میں ہے ﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا﴾ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ "جہنم دو سانس لیتی ہے ایک ٹھنڈک کا اور دوسرا حرارت کا۔" (بخاری: ۳۵۳۷، مسلم: ۱۴۰۱) (الثمین، الطبری)

سوال: ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ "جزاءً" منصوب کیوں ہے؟ اور "وِفاقًا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "جزاء" فعل محذوف "یُجْزَوْنَ" کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ "لَا یَذُوْقُوْنَ" کا مفعول لاجلہ بھی ہوسکتا ہے۔ (اعراب)

وفاقًا: باب مفاعلہ "وَافَقَ یُوَافِقُ مُوَافَقَةً" سے مصدر سماعی ہے۔ مادہ: و، ف، ق۔ (اعراب)

سوال: ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ وَّكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا﴾ جہنمیوں کے عذاب کی صرف دو وجوہات کیوں بیان کی ہیں حالانکہ ان کے جرائم تو کئی اور بھی ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے عذاب کی صرف دو وجوہات اس لئے بیان کیں کہ ان دو وجوہات پر ہی انسانی بھلائی اور برائی کا دارومدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں۔ فکری اور عملی۔ اب ان جہنمیوں کی عملی برائی یہ تھی کہ ﴿وَّكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا﴾ اور فکری برائی یہ تھی کہ ﴿لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا﴾ جب انسان یوم جزا کو ہی جھٹلا دے تو وہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہوجاتا ہے اور عملی طور پر گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ (رازی)

سوال: ﴿وَّكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كِذَّابًا﴾ "كِذَّابًا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "كِذَّابًا" باب تفعیل "كَذَّبَ یُكَذِّبُ" سے مصدر ہے۔ مادہ: ک، ذ، ب۔

سوال: ﴿وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ كِتٰبًا﴾ "كُلَّ شَیْءٍ" منصوب کیوں ہے؟ اور نحو کی اصطلاح میں اسے کیا کہتے ہیں؟

جواب: "کُلَّ شَیْءٍ" ایک محذوف فعل (جس کا حذف کرنا واجب ہوتا ہے) کا مفعول بہ ہے جس پر دلالت اگلا فعل "أحصینا" کر رہا ہے۔ اسے اصطلاح میں "ما أضمر عامله علی شریطة التفسیر" کہتے ہیں۔ یعنی "أحصینا کل شئی" اور یہ تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ (اعراب، التحریر)

سوال: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ كِتَٰبًا﴾ "کِتابًا" مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا حال ہونے کی وجہ سے؟ مفصل وضاحت کریں۔

جواب: "کِتابًا" مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں "أحصینا" بمعنی "کَتبنَا" ہوگا اور "ہ" ضمیر سے حال بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں "کِتابًا" بمعنی "مکتوبًا" ہوگا۔ (اعراب) اور تمیز بھی بن سکتا ہے۔ (انوار)

سوال: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ كِتَٰبًا﴾ اللہ تعالیٰ کی کس صفت مبارکہ کا اثبات کر رہی ہے؟

جواب: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ كِتَٰبًا﴾ اللہ کی صفت "عالمٌ بالجزئیات" کا اثبات کر رہی ہے۔ کیونکہ جو جزئیات کا عالم نہ ہو وہ انسان کو بدلہ دینے میں انصاف نہیں کرسکتا۔ (رازی)

سوال: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ كِتَٰبًا﴾ کیا اعمال کا صرف لکھا ہونا جزا و سزا کے لیے قابل حجت ہوگا؟

جواب: قیامت کے روز اس لکھے کے ساتھ اس کے اعضاء حتی کہ زمینی اشیاء بھی شہادت دیں گی، جیسا کہ دوسری جگہ اس کی وضاحت موجود ہے ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ (الزلزال: ۴) (ترجمہ: اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی) ﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰٓ أَفْوَٰهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ﴾ (یٰس: ۶۵) (آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے)۔

سوال: ﴿فَذُوقُوا۟ فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ "ذُوقُوا" اور "عذابا" کیا صیغے ہیں؟

جواب: "ذُوقُوا" "ذاقَ یَذُوقُ ذَوْقًا" (ن) سے جمع مذکر امر حاضر معروف ہے۔ مادہ: ذ، و، ق۔

"عذابا" باب تفعیل "عذَّبَ یُعذِّب" سے اسم مصدر ہے۔ مادہ: ع، ذ، ب۔

سوال: جملہ ﴿فَذُوقُوا۟ فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جملہ "فذوقوا" محل جزم میں ہے، کیونکہ یہ ایک محذوف شرط کا جواب شرط ہے۔ شرط مقدر یہ ہے۔ "إنْ کذبتم فی الدنیا فذوقوا" (اعراب)

سوال: ﴿فَذُوقُوا۟ فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ میں "عَذَابًا" منصوب کیوں ہے؟ نیز یہ مستثنیٰ کی حالتوں میں سے کون

سی حالت ہے؟

جواب: "عَذَابًا" "نزید" فعل کا دوسرا مفعول بہ ہے اور اس آیت میں استثنا مفرغ حصر کے لیے ہے۔ (اعراب)

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمان "فذوقوا" اس نص کے منافی تو نہیں ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ﴾؟ (آل عمران: ۷۷)

جواب: یہ دونوں اقوال ایک دوسرے کے منافی نہیں کیونکہ "لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ" سے مراد اللہ ان کو نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا اور ان سے نرم لہجے میں کلام نہیں کرے گا۔ جب کہ لفظ "فَذُوقُوا" تو اللہ تعالیٰ غصے اور غضب سے کہیں گے۔ (رازی)

سوال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ کیا اس بات کے منافی تو نہیں کہ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾؟

جواب: دونوں میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ جس طرح وہ انسان دنیا میں سرکشی اور اللہ کی نافرمانی میں آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، اسی طرح روزِ قیامت اس کی سزا بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔ ویسے بھی جب عذاب میں دوام ہو تو اس کی تکلیف بڑھتی جاتی ہے۔ (رازی)

سوال: ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾ لفظ "متقین" کی صرفی تحلیل کریں۔

جواب: "متقین" باب افتعال "اِتَّقٰى يَتَّقِي اِتِّقَاءً" سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ اصل میں "مُوْتَقِيِيْنَ" تھا۔ "فاء" کلمہ میں "واؤ" واقع ہوئی اسے "تاء" سے بدل کر "تاء" میں ادغام کیا تو "مُتَّقِيِيْنَ" ہوا۔ "یاء" بعد کسرہ کے واقع ہوئی اور اس کے بعد بھی یاء، تو اسکو حرکت سمیت حذف کر دیا، اس طرح "مُتَّقِيْنَ" ہوا۔

سوال: ﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾ "مَفَازًا" کون سا صیغہ ہے؟ اور منصوب کیوں ہے؟

جواب: "مَفَازًا" "فَازَ يَفُوْزُ" (ن) سے مصدر میمی ہے اور اسے ظرف مکان بنانا بھی جائز ہے۔ مادہ: ف، و، ز۔ اصل میں "مَفْوَز" تھا۔ واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن، واؤ کی حرکت ماقبل کو دی، ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے واؤ کو الف سے بدل دیا، کیونکہ واؤ اصل میں متحرک تھا، "مَفَازًا" ہو گیا۔ "مَفَازًا" "اِنَّ" کا اسم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ "حَدَآئِقَ" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: "حَدَآئِقَ" منصوب ہے کیونکہ "مَفَازًا" سے بدل ہے۔

سوال: ﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ "أَعْنَابًا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "أعنابًا" منصوب ہے کیونکہ اس کا عطف "حدائق" پر ہو رہا ہے۔

سوال: ''کَوَاعِبَ، أترابا اور ''حَدَائِق'' کی واحد اور معنیٰ لکھیں؟

جواب: ''کواعب'' ''کَاعِبٌ'' کی جمع ہے جو کہ ''کَعَبَ یَکْعُبُ'' سے اسم فاعل ہے۔ جس کا معنیٰ ''ابھری ہوئی چھاتی والی لڑکیاں'' ہے۔ ''أترابا'' کی واحد ''تِرْبٌ'' ہے جس کا معنیٰ ''ہم عمر'' ہے۔ ''حَدَائِقَ'' کی واحد ''حَدِیْقَة'' جس کا معنیٰ ''باغ، پھل دار درختوں والی زمین، وہ کھجوروں کا باغ جس کی چار دیواری ہو'' ہے۔ (قاموس)

سوال: ﴿وَ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾ ''كَوَاعِبَ'' پر تنوین کیوں نہیں آئی اور ''اَتْرَابًا'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: کیونکہ ''کَوَاعِبَ'' جمع منتہی الجموع ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ''اَتْرَابًا'' ''کَوَاعِبَ'' کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَّ كَاْسًا دِهَاقًا﴾ ''دِهَاقًا'' کون سا صیغہ ہے اور اس کا معنیٰ کیا ہے؟

جواب: دِهَاقًا: ''دَهَقَ یَدْهَقُ'' (ف) سے صفت مشبہ ہے۔ مادہ: د، ہ، ق۔ اس کا معنیٰ ہے ''چھلکتا ہوا، کناروں تک بھرا ہوا''۔ ''دَهَقَ'' کا لفظ اضداد میں سے ہے، جس کا معنیٰ ''جام کو بھرنا اور پانی انڈیلنا'' دونوں مستعمل ہیں۔ (اعراب، قاموس)

سوال: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ محل نصب میں ہے۔ کیونکہ ''حدائق'' کی صفت ہے۔

سوال: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا﴾ میں ''فِيْهَا'' سے کون سی جگہ مراد ہے؟ نیز اس آیت کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: راجح موقف کے مطابق ''ھا'' ضمیر سے مراد ''حدائق'' (جنت، باغات) ہے۔

مفہوم: قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ آدمی کے کان وہاں بیہودہ، جھوٹی اور گندی باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ کوئی کسی سے نہ جھوٹ بولے گا اور نہ کسی کو جھٹلائے گا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾ ''جزاءً'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: جزاءً: مفعول لاجلہ یا ''یُجْزَوْنَ'' فعل محذوف کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾ ''عَطَآءً حِسَابًا'' کا کیا ترجمہ ہے؟

جواب: ''عَطَآءً حِسَابًا'' کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں: (۱) بڑی کافی عطاء (۲) طے شدہ مقدار کے مطابق عطاء۔ لیکن پہلا معنیٰ راجح ہے۔ (رازی، المنیر)

سوال: ﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا﴾ ''عطاءً'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: "عطاءً" "جزآءً" سے بدل ہے اور اسے فعل محذوف سے مفعول مطلق بنانا بھی جائز ہے۔

سوال: ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ﴾ میں لفظ "ربِّ" پر کسرہ کیوں آیا ہے؟

جواب: کیونکہ یہ پچھلی آیت میں مذکور "جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ" کے لفظ "ربِّ" سے بدل ہے۔

سوال: ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ﴾ لفظ "الرَّحْمٰنِ" پر کسرہ کیوں آیا ہے؟

جواب: کیونکہ لفظ "الرَّحْمٰنِ" "رَبِّ السَّمٰوٰتِ" سے بدل ہے۔

سوال: ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ محل نصب میں ہے کیونکہ لفظ "الرحمن" سے حال ہے یا "ما بینهما" سے حال ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ "يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: جملہ "يَقُوْمُ الرُّوْحُ" "یوم" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ "یوم" اور "صَفًّا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "یوم" "لا یتکلمون" کا ظرف اور "صَفًّا" "الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ" سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ میں "روح" سے کون مراد ہے؟

جواب: "روح" سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اسے اصطلاح میں "ذکر العام بعد الخاص" کہتے ہیں۔ جس طرح کہ سورۃ القدر آیت نمبر ۴ میں ہے ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا﴾ یہاں "ذکر الخاص بعد العام" ہے۔

سوال: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ "لَا يَتَكَلَّمُوْنَ" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: جملہ "لَا يَتَكَلَّمُوْنَ" بھی "الروح والملئكة" سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ "إلا" کے بعد "مَن" کی اعرابی حالت کیا ہے؟ اور جملہ "وَقَالَ صَوَابًا" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "مَن" محل نصب میں ہے کیونکہ مستثنی ہے اور جملہ "وقال صوابا" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اس کا عطف "أَذِنَ" پر ہے اور "أَذِنَ" موصول کا صلہ ہے اور صلہ کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔

سوال: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ "مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ" سے فرشتے مراد ہیں یا جن و انس بھی؟

جواب: "مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ" سے مراد جن وانس اور فرشتوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کئی دوسری نصوص سے ثابت ہے کہ یہ اجازت فرشتوں کو اور جن وانس میں سے نیک لوگوں کو ہوگی۔ (رازی، الثمین، فتح القدیر)

سوال: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ سے مراد اگر فرشتے ہوں تو کیا یہ استدلال درست ہوگا کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں کیونکہ اس قول کے مطابق صرف وہی اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو سکیں گے؟

جواب: یہاں انسانوں اور فرشتوں میں مقابلہ مقصود نہیں بلکہ فقط اس دن کی خوفناکی اور اللہ کا رعب وجلال بتلانا مقصود ہے کہ اس دن فرشتے بھی اللہ کی ہیبت سے خاموش ہوں گے۔ (رازی)

سوال: ﴿وَقَالَ صَوَابًا﴾ "صَوَابًا" کیا صیغہ ہے؟ اگر اسم مصدر ہے تو مصدر اور اسم مصدر میں فرق واضح کریں۔

جواب: صَوَابًا: باب افعال "أَصَابَ يُصِيْبُ إِصَابَةً" سے اسم مصدر ہے۔ مادہ: ص، و، ب۔ مصدر اور اسم مصدر میں فرق یہ ہے کہ اسم مصدر میں حروف اصلیہ میں سے کوئی حرف لفظی یا تقدیری طور پر بغیر عوض کے کم کر دیا جاتا ہے مثلاً باب "قَبَّلَ يُقَبِّلُ" سے اسم مصدر "قُبْلَةٌ" آتا ہے۔ جب کہ مصدر میں فعل والے تمام حروف پورے ہوتے ہیں۔ (معجم النحو)

☆ فائدہ: اسم مصدر تین طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ علم: مثلاً یَسارِ، برّۃ وغیرہ۔ یہ بالاتفاق عمل نہیں کرتا۔

۲۔ مصدر میمی: مثلاً مضرِب۔ یہ اکثر نحاۃ کے ہاں مصدر ہی ہوتا ہے۔

۳۔ ان دونوں قسموں کے علاوہ جو اسمائے مصادر ہیں وہ عمل کرتے ہیں۔ مثلاً ﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا﴾ (مریم: ۲) اس آیت میں "عبدہ" کو نصب اسم مصدر "رحمۃ" نے دی ہے۔

سوال: ﴿ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ﴾ میں لفظ "الْيَوْمُ" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: لفظ "الْيَوْمُ" "ذٰلِكَ" سے بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے "ذٰلِكَ" اور "الْيَوْمُ" اسم اشارہ اور مشار الیہ ہیں دونوں مل کر مبتدا ہوئے اور "الْحَقُّ" ان کی خبر ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا﴾ میں "مَن" کیا واقع ہو رہا ہے؟ اور "شَآءَ" محل رفع میں ہے یا جزم میں؟

جواب: "فَمَنْ شَآءَ" میں لفظ "من" مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور "شَآءَ" بھی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا﴾ "اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا" کا محل اعراب کیا ہے؟ اور "اتَّخَذَ" کیا صیغہ ہے؟

جواب: اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جواب شرط ہے لیکن اس پر "فاء" یا "إذا" فجائیہ داخل نہیں۔

اِتَّخَذَ: باب افتعال ''اِتَّخَذَ یَتَّخِذُ اِتِّخَاذًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے، اصل میں ''اِوْتَخَذَ'' تھا، واؤ کو تاء سے بدل کر تاء کا تاء میں ادغام کر دیا۔ مادہ: و، خ، ذ۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ: ا، خ، ذ یا: ت، خ، ذ ہے۔

سوال: ﴿یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ﴾ میں "یوم" کس کے متعلق ہے؟

جواب: "یوم" "أنذرناكم عذابا" میں "عذابا" کا ظرف ہے۔ (اعراب، المنیر)

یہ "أنذرناكم" کا ظرف ہے یا یہ ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ﴾ میں "یوم" سے بدل ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ﴾ اور ﴿یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ﴾ جب ظرف مبہم فعل معرب کی طرف مضاف ہو تو ظرف مبہم کا اعراب کیا ہوتا ہے؟ جیسا کہ ''یَوْمَ یَقُوْمُ'' اور ''یَوْمَ یَنْظُرُ'' میں ہے۔

جواب: جب ظرف مبہم فعل معرب کی طرف مضاف ہو تو اعراب بھی معرب والا ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ ظرف کو مبنی والا اعراب دینا بھی جائز ہے مثلاً ﴿یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا﴾ (الانفطار: ۱۹) (معجم النحو والصرف: الاضافة، ص: ۲۶)

سوال: ﴿یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ کا محل اعراب ذکر کریں نیز "لیت" اور "ترابا" کا اعراب اور وجہ اعراب بتائیں۔

جواب: جملہ "یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا" محل نصب میں ہے، کیونکہ "یقول الكافر" قول کا مقولہ ہے۔

"لیت" چونکہ فعل ہے اس لئے مبنی بر فتح ہے جبکہ "ترابا" "کان" کی خبر ہونے کی وجہ سے مفتوح ہے۔

☆ فائدہ: جملے کی طرف صرف آٹھ چیزیں مضاف ہو سکتی ہیں۔ ۱۔ اسمائے زماں ۲۔ حیثُ ۳۔ آیةٌ ۴۔ ذُو ۵۔ لَدُنْ ۶۔ رَیْثُ ۷۔ لفظِ "قول" ۸۔ لفظ "قال"۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ﴿۴﴾
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿۶﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ
وَّاجِفَةٌ ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿۹﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ
بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ
فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ
فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا
فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ
مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا
جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ
يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا
مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ
مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا
عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سورہ عمّ اور النازعات دونوں کا موضوع ایک ہے۔ دونوں میں قیامت، اس کے احوال، متقین اور مجرمین کے انجام کے بارے بحث کی گئی ہے۔ (تدبر، المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون ذکر کریں۔

جواب: اس سورت کا موضوع قیامت اور حیات بعد الممات ہے۔ اس سورت میں مکذبین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ مذموم صفات کی حامل قومیں کس طرح قہر الٰہی میں آکر دوسروں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نشان عبرت بن جاتی ہیں۔ آخر میں احوال قیامت اور مشرکین کے قیامت کے متعلق اعتراضات اور انکے جوابات دیئے گئے ہیں۔ (المنیر، تفہیم)

سوال: "والنّٰزعٰت" جار مجرور کس کے متعلق ہے؟

جواب: "والنّٰزعٰت" ایک فعل محذوف "أقسمُ" کے متعلق ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ "نزع" اور "غرقا" کے لغوی معنی کیا ہیں؟ نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: نزع کے اصل معنی "کھینچنے اور نکالنے" کے ہیں۔ ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ میں "نزع" کے لفظ کو کنویں سے ڈول وغیرہ نکالنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ "غرقا" اس سے مراد ہے "ڈوب کر"۔ (التحریر)

ترجمہ: ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر سختی سے جان کھینچ لیتے ہیں۔

سوال: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ "غَرْقًا" مصدر سماعی ہے یا اسم مصدر؟ اگر اسم مصدر ہے تو اس کا باب ذکر کریں۔

جواب: "غَرْقًا" مصدر سماعی اور اسم مصدر دونوں بنانا جائز ہے۔ اگر ثلاثی مجرد (ن) سے ہو تو مصدر سماعی ہے، اگر مزید فیہ باب افعال أَغْرَقَ يُغْرِقُ سے ہو تو اسم مصدر ہے۔ (رازی، اعراب)

سوال: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ "غَرْقًا" کیوں منصوب ہے؟

جواب: "غَرْقًا" مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ "نزع" اور "غرق" ہم معنی ہیں۔ یہ "مفعول مطلق مِن غیر لفظه" ہے جیسے "قعدت جلوسا"۔ نیز "غرقًا" کو حال بنانا بھی جائز ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾ "نشاط" کی لغوی وضاحت کریں؟ نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: "نشاط" کے لغوی معنی ہیں: کام میں پھرتیلا اور مستعد ہونا، پھرتی اور محنت سے کام کرنا۔ (قاموس)

ترجمہ: ان فرشتوں کی قسم جو یقیناً آسانی سے بند کھولنے والے ہیں۔

سوال: ﴿وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا﴾ "سبح" کی لغوی وضاحت کریں؟ نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: "سبح" کا اصل معنی "پانی پر تیرنے" کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ سرعت انتقال کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔(التحریر)

ترجمہ: ان فرشتوں کی قسم جو یقیناً تیزی سے تیرنے والے ہیں۔

سوال: ﴿فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا﴾ "سبق" کی لغوی وضاحت کریں نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: اس کا معنی "چلنے والا جو اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جائے" ہے نیز اس کا استعمال "دوسروں سے پہلے منزل تک پہنچنے کے لئے" بھی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸) (ترجمہ: سو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) ﴿أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾ (المومنون:۶۱) (ترجمہ: یہ لوگ ہیں جو نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان کی طرف آگے نکلنے والے ہیں)

اور اس کا اطلاق "تسلط اور غلبہ" پر بھی ہوتا ہے جیسے ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ (العنکبوت:۴) (ترجمہ: کیا ان لوگوں نے جو برے کام کرتے ہیں یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہم سے سبقت لے جائیں گے ،ہمارے قابو میں نہیں آئیں گے؟) (التحریر)

ترجمہ: پھر جو یقیناً ایک دوسرے سے آگے نکلنے والے ہیں۔

سوال: ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ "تدبیر" کسے کہتے ہیں؟ نیز اس آیت کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: "کاموں کو صحیح سمت پر چلانے کے لئے اور چیزوں کے انجام پر غور وفکر کرنا" تدبیر کہلاتا ہے۔(التحریر)

مفہوم: اللہ تعالیٰ نے دین ودنیا کے جو کام ان کے سپرد کئے ہیں۔ اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ بارش برسانا، لوگوں کی حفاظت کرنا، جان نکالنا، اور دوسرے امور جو ان کے ذمہ ہیں۔ وہ احسن طریق سے ان کی تدبیر کرتے ہیں۔

سوال: پہلی تین آیات کے شروع میں "واؤ" اور اگلی دو کے شروع میں "فاء" ہے۔ اس کی وجہ ذکر کریں۔

جواب: پہلی تین آیات میں "واؤ" اور اگلی دو میں "فاء" لانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تین صفات آخری دو صفات کے لئے سبب ہیں جیسے کہ "زيد قام فذهب" گویا کہ قیام ذہاب کا سبب ہے۔(رازی، تدبر)

سوال: پہلی پانچ آیات کا مدلول کیا ہے؟ ہوا، فرشتے یا کچھ اور

جواب: بعض مفسرین کے مطابق ان سے مراد ہوائیں ہیں بعض کے نزدیک فرشتے ہیں۔(التحریر، روح، تدبر)

سوال: پہلی پانچ آیات کا جواب قسم کیا ہے؟ محذوف ہے یا مذکور؟

جواب: پہلی پانچ آیات کا جواب قسم محذوف ہے "لَتُبْعَثُنَّ أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اور اس محذوف پر دلالت اگلی آیات کر رہی ہیں کہ وہ قیامت ہے یعنی جس رب کے قبضہ قدرت میں اتنی عظیم ہوائیں اور فرشتے ہیں اس کے لئے تمہیں ہلاک کرنا اور عذاب کا مزا چکھانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس لئے روز قیامت سے ڈر کر تیاری کرو۔ (اعراب)

سوال: ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ میں "يَوْمَ" کس فعل سے متعلق ہے؟ اور منصوب کیوں ہے؟

جواب: ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ ایک مقدر فعل "لَتُبْعَثُنَّ" کے متعلق ہے اور اس کا ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ الرَّاجِفَةُ اور "الرَّادِفَةُ" کے صیغے اور معنی ذکر کریں۔

جواب: الرَّاجِفَةُ: رَجَفَ يَرْجُفُ سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، جس کا معنی "حرکت کرنا زور زور سے ہلنا اور حرکت دینا، ہلا ڈالنا، جھنجھوڑنا" ہے۔

الرَّادِفَةُ: رَدَفَ يَرْدُفُ رَدْفًا (ن) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، جس کا معنی "کسی کے پیچھے سوار ہونا، پیچھے ہونا اور پیچھے پیچھے چلنا" ہے۔ (قاموس)

سوال: ﴿تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ اور ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ سے کیا اور کون مراد ہے؟

جواب: "تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ" سے پہلے صور پھونکے جانے کے بعد کی حالت مراد ہے اور "تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ" سے دوسرے صور کے بعد طاری ہونے والی حالت مراد ہے۔

"الرَّاجِفَةُ" سے مراد پہلی دفعہ صور میں پھونکے جانے سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے ہر چیز فنا ہو جائے گی اور "الرَّادِفَةُ" سے مراد دوسرے نفخہ سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے تمام لوگ زندہ ہو کر از سر نو قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ اور ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ" یوم کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے، جب کہ "تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ" "الراجفة" سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ (اعراب، الکشاف)

سوال: ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴾ ضمیریں لوٹا کر ترجمہ کریں۔

جواب: سخت ہلا دینے والے (زلزلے) کے ساتھ ہی پیچھے آنے والا (زلزلہ) آئے گا۔

سوال: ﴿قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ "قُلُوْبٌ" کو نکرہ کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: یہاں "القلوب" کی بجائے "قُلُوْبٌ" نکرہ لایا گیا کیونکہ اس سے مراد کچھ دل ہیں اور وہ صرف کفار کے دل ہیں۔ مومنین کے دل نہیں جیسا کہ سیاقِ کلام سے واضح ہے۔ (تفہیم، رازی)

سوال: ﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ نکرہ کے ساتھ ابتدا جائز نہیں لیکن یہاں "قُلُوْبٌ" نکرہ کو مبتدا کیوں بنایا گیا ہے؟

جواب: یہاں "قُلُوْبٌ" اگرچہ نکرہ ہے لیکن "وَّاجِفَةٌ" اس کی صفت ہے جب نکرہ کی صفت آجائے تو اسے مبتدا بنانا جائز ہے۔ اور اس کی خبر "اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ" ہے۔ (الکشاف، فتح القدیر)

جبکہ صاحب التحریر کے نزدیک کی "وَّاجِفَةٌ" "قُلُوْبٌ" خبر اول اور "اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ" دوسری خبر ہے۔ چونکہ "قُلُوْبٌ" میں نوع کا معنی پایا جارہا ہے اس لئے اسے مبتدا بنانا جائز ہے۔ یہی موقف درست معلوم ہوتا ہے اور اس سے معنی بھی درست ہوجاتا ہے۔

سوال: ﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ میں "وَّاجِفَةٌ" "قُلُوْبٌ" کی صفت ہے۔ کیا موصوف صفت کے درمیان فاصلہ جائز ہے؟

جواب: موصوف صفت کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کرنا جائز ہے، مطلق جائز نہیں ہے۔ (اعراب، معجم النحو، چونکہ صاحب اعراب کے ہاں "وَّاجِفَةٌ" صفت بن رہا ہے اس انہوں نے یہ موقف اپنایا اور اگر "وَّاجِفَةٌ" کو خبر بنائیں تو یَوْمَىِٕذٍ "وَّاجِفَةٌ" کے متعلق ہوجائے گا)

سوال: ﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ "وَّاجِفَةٌ" کا لغوی معنی اور صیغہ ذکر کریں۔

جواب: وَّاجِفَةٌ: وَجَفَ یَجِفُ وَجْفًا (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: و، ج، ف۔ جس کا معنی "دل دھڑکنا، بےقرار ہونا" ہے۔ "وجف الشیء اذا اضطرب" جب کوئی چیز مضطرب ہوتی ہے اس کو وجف سے تعبیر کرتے ہیں۔ امام زجاج کے نزدیک وجف شدید اضطراب کو کہتے ہیں۔ (لسان، قاموس)

سوال: ﴿اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ "هَا" ضمیر کا مرجع کون سا ہے؟

جواب: بعض علماء کے ہاں "هَا" ضمیر کا مرجع "قُلُوْبٌ" ہے اور اَبْصَارُ کی اضافت یہاں "قُلُوْبٌ" کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ آدمی کی شخصیت اصلاً دل ہی سے عبارت ہے۔ نگاہوں میں جو کچھ جھلکتا ہے وہ درحقیقت دل کی کیفیتیں ہوتی ہیں جن کے مخفی سے مخفی پہلو بھی اگر ہم چاہیں تو نگاہوں کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ (تدبر، البیان)

جبکہ بعض علماء کے ہاں یہاں "اهلها" یا "اصحابها" محذوف ہے یعنی "ابصار اصحاب القلوب خاشعة" (التحریر، روح)

سوال: ﴿أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ ''خَاشِعَةٌ'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: خَاشِعَةٌ: خَشَعَ يَخْشَعُ خُشُوْعًا (ف) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، جس کا معنی ہے: عاجزی دکھانا، انکساری کرنا، پست اور ذلیل ہونا۔ خَشَعَ بَصَرُہ: نگاہ نیچی ہو جانا، نگاہ میں ٹھہراؤ نہ رہنا۔ (قاموس)

سوال: ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ یہ کن کا قول ہے؟

جواب: یہ منکرین قیامت کا قول ہے جو وہ دنیا میں قیامت کو جھٹلاتے ہوئے کہتے تھے۔

سوال: ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ ''الْحَافِرَةِ'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''الْحَافِرَةِ'' کے اصل معنی نقش قدم کے ہیں، لیکن محاورے میں اگر کہیں کہ ''فلان رجع علی حافرته أو فی حافرته'' تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حالت میں تھا اس سے نکل کر پھر الٹے پاؤں اسی میں واپس آ گیا۔ یعنی جب انہیں ڈرایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب کے لئے زندہ کیے جاؤ گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے بانداز استہزاء پوچھتے ہیں کہ کیوں جی! کیا مر جانے اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد پھر ہم زندگی کی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟ (تدبر)

سوال: ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ میں کون کون سی مؤکدات ہیں؟

جواب: اس میں تین مؤکدات ہیں:

استفہام تعجبی کا جملہ اسمیہ پر داخل ہونا۔

إِنَّ بھی تاکید خبر کے لیے آتا ہے۔

إِنَّ کی خبر پر لام آ جائے تو بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

سوال: ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ ''لَمَرْدُوْدُوْنَ'' اور ''الْحَافِرَةِ'' کیا صیغے ہیں؟

جواب: لَمَرْدُوْدُوْنَ: رَدَّ يَرُدُّ رَدًّا (ن) سے جمع مذکر اسم مفعول ہے، مادہ: ر، د، د۔ مضاعف ثلاثی۔

الْحَافِرَة: حَفَرَ يَحْفِرُ حَفْرًا (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ معنی: راستے میں چلنے کا نشان ڈالنا، کھودنا۔ مادہ: ح، ف، ر۔ (قاموس)

سوال: ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ میں ''إذا'' کس کے متعلق ہے؟

جواب: ''إذا'' پچھلی آیت میں ''لَمَرْدُوْدُوْنَ'' کے متعلق ہے۔

سوال: ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ "عِظَامًا" جمع کی صفت "نَخِرَةً" واحد کیوں لائی گئی ہے؟

جواب: اس لیے کہ "عِظَامًا" جمع مکسر ہے اور اس کا حکم واحد مؤنث کا ہوتا ہے۔

سوال: ﴿كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" "إذا" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ کا جواب شرط کیا ہے؟

جواب: اس آیت کا جواب شرط محذوف ہے اور وہ یہ ہے "فَهَلْ نُبْعَثُ مِنْ جَدِيْدٍ" (اعراب)

سوال: ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ "نَخِرَةً" کیا صیغہ ہے؟ نیز ترجمہ بھی کریں۔

جواب: نَّخِرَة: "نَخِرَ يَنْخَرُ نَخْرًا" (ع) سے واحد مؤنث صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ن، خ، ر۔ اسکا معنی بوسیدہ ہونا ہے۔

سوال: ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: کہنے لگے: "یہ واپسی تو پھر بڑی نقصان والی ہوگی"۔

سوال: ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ ﴿يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ سے ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے؟

جواب: "قَالُوْا" "يَقُوْلُوْنَ أَئِنَّا" سے بدل اشتمال ہے۔

سوال: ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ میں "تلك" کا مشار الیہ کیا ہے؟ اور "تلك" کو مؤنث کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: "تلك" کا مشار الیہ "أئِنّا لمردودون" میں مصدر "رَدٌّ" کی طرف ہے۔ "تلك" مؤنث اس لیے لایا گیا ہے کہ إخبار عنه "كرة" مؤنث ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ "إِذًا" کی لغوی اور نحوی وضاحت کریں۔

جواب: إِذًا: "تب، اس وقت" کے معنی ادا کرتا ہے۔ حرف جزا ہے۔ امام سیبویہ نے تصریح کی ہے کہ یہ جواب اور جزا کے لئے آتا ہے۔ اصل میں إِذَنْ ہے، وقف کی صورت میں نون کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ جب یہ کلام کے آغاز میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو لازماً اس کو نصب دے گا جیسے إِذَنْ اَخْرُجَ لیکن جب وسط کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو نصب اور رفع دونوں جائز ہیں جیسے اَنَا إِذَنْ اَخْرُجُ یا اَخْرُجَ۔ مگر جب فعل کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل نہ ہو تو یہ عمل نہیں کرتا جیسے اَنَا اَخْرُجُ إِذَنْ اور إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ۔ (لغات القرآن، مفردات)

سوال: ﴿قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾ "كَرَّةٌ" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: "كَرَّةٌ" "تِلْكَ" "مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ میں " زَجْرَةٌ" کی صفت "وَّاحِدَةٌ" کیوں لائی گئی ہے حالانکہ " زَجْرَةٌ" میں "واحدۃ" کے معنی موجود ہیں؟

جواب: اس سے تاکید مقصود ہے۔ کیونکہ یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ زلزلہ پہلا بھی ہوسکتا ہے۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ (الزمر: ٦٨) (ترجمہ: اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے مرکر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا، پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے) یہ زلزلہ دوسرا اور آخری ہے۔ جس کو قرآن نے ﴿تتبعها الرادفة﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ اسکے بعد کوئی اور زلزلہ نہ ہوگا۔ (التحریر، تدبر)

سوال: ﴿فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ "هِيَ" ضمیر کا مرجع ذکر کریں نیز بتائیں "زَجْرَةٌ" کون سا مصدر ہے؟

جواب: هِيَ: یہ ضمیر قصہ ہے، کیونکہ اس کی نسبت "زَجْرَةٌ" کی طرف ہے، اس لئے ضمیر مؤنث کا انتخاب کیا گیا ہے۔

"زَجْرَةٌ" فعلة کے وزن پر مصدر ہے جو کہ "مرّة" کا معنی دیتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ سے کون سا "نفخه" مراد ہے؟

جواب: "زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ" سے مراد "نفخه ثانیه" ہے۔ یعنی تمہارا دوبارہ اٹھایا جانا تمہیں کتنا ہی ناممکن دکھائی دے اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں، اس کی طرف سے ایک ڈانٹ یعنی صور میں ایک پھونک پڑنے کی دیر ہے کہ سب زندہ ہوکر قبروں سے نکل کر سطح زمین پر موجود ہوں گے۔ اس کی وضاحت سورۃ زمر کی اس آیت سے ہوتی ہے ﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾۔ (الزمر: ٦٨) (تفسیر القرآن الکریم، تدبر)

سوال: ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ میں "فاء" اور "إذا" کون سی ہے؟ اور "باء" کس معنی میں ہے؟

جواب: "فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ" میں فاء جواب شرط کے لیے ہے۔ شرط محذوف یہ ہے "فإذا نُفِخَ في الصُّور" اور "إذا" فجائیہ ہے۔ (اعراب)

یہاں "با" "في" کے معنی میں ہے۔ لیکن اردو محاورے میں اس کا اظہار "اوپر، میں" دونوں طرح درست ہے۔ پس یکا یک وہ زمین کے اوپر موجود ہوں گے۔ یا وہ دفعۃً میدان میں آموجود ہوں گے۔

سوال: ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ "هُمْ بِالسَّاهِرَةِ" کا محل اعراب کیا ہے؟ اگر اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں تو وجہ

ذکر کریں۔

جواب: "هُمْ بِالسَّاهِرَةِ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ "جوابُ شرطٍ غیرِ جازمٍ" ہے۔ (اعراب، معجم النحو: ۲۲۴)

سوال: ﴿فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ "السَّاهِرَةِ" کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے بتلائیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: السَّاهِرَةِ: سَهِرَ يَسْهَرُ (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، جس کا معنیٰ "جاگنا، بیدار رہنا" ہے۔ اس سے مراد "ایسی سفید اور ہموار زمین ہے جس پر چلتے ہوئے سراب محسوس ہو"۔ اور اس سے مراد "وہ زمین بھی ہے جس پر چلتے ہوئے انسان کو خوف کی وجہ سے نیند نہ آئے"۔ مراد میدان محشر ہے۔ (الکشاف، انوار، تدبر)

سوال: ﴿اِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى﴾ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے طرف مبعوث کیے گئے؟

جواب: بعض لوگوں کا یہ خیال ہے، لیکن قرآن میں اس نظریہ کی تردید ہے، ان کی بعثت کا مقصد اول فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست پر لانا تھا اور دوسرا مقصد اگر دعوت کو ٹھکرا دیں تو پھر بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے مصر سے نکال لانا تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ حالانکہ آپ کی رسالت آفاقی اور ابدی ہے۔

سوال: ﴿إِذْ نَادٰهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ "طُوًى" کا اعراب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟

جواب: "طُوًى" محل جر میں ہے کیونکہ "بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ" سے بدل یا عطف بیان ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿إِذْ نَادٰهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ "طُوًى" کی تشریح کریں نیز بتلائیں کہ یہ منصرف ہے یا غیر منصرف؟

جواب: تشریح: طور سیناء کے مغربی جانب میں واقع ایک وادی کا نام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر مدین سے واپسی پر پہلی وحی اسی جگہ پر اتری تھی۔ (تفسیر القرآن الکریم)

وادی مقدس طویٰ کے معنی بالعموم مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ مقدس وادی جس کا نام طویٰ تھا"۔ لیکن اس کے دو معانی اور بھی بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ "وہ وادی جو دو مرتبہ مقدس کی گئی"، کیونکہ ایک دفعہ اسے اس وقت مقدس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب فرمایا، اور دوسری دفعہ اسے تقدیس کا شرف اس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اس وادی میں لائے۔

دوسرے، یہ کہ "رات کے وقت وادی مقدس میں پکارا"، عربی میں محاورہ ہے: جاء بعد طوی. یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد آیا۔ (تفہیم، قاموس)

"طُوًى" کے منصرف اور غیر منصرف ہونے میں اختلاف ہے، جو اس کو منصرف کہتے ہیں ان کے نزدیک اس میں صرف علمیت ہے اور یہ مذکر لفظ ہے لہذا یہ غیر منصرف نہیں ہے۔ جبکہ بعض علماء کے ہاں یہ غیر منصرف ہے، علمیت اور بقعة کی تاویل میں ہوکر تانیث کی وجہ سے یا "طاو" سے عدل بننے کی وجہ سے یا عجمہ ہونے کی وجہ سے۔ (التحریر)

سوال: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ "فِرْعَوْنَ" مصر کے بادشاہ کا لقب تھا یا ذاتی نام؟

جواب: فرعون قدیم مصر میں قبطی بادشاہ کا لقب تھا اور یہ اسم عبرانی زبان سے مُعَرّب ہے۔

سوال: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ "اِنَّهٗ" میں ضمیر کا مرجع ذکر کریں اور بتلائیں "طَغٰى" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "اِنَّهٗ" کی ضمیر کا مرجع "فِرْعَوْنَ" ہے۔

"طَغٰى" "طَغٰى يَطْغٰى طَغْيًا وَطُغْيَانًا" (ف) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ط، غ، ی۔

فائدہ: "طغیان" مصدر سے جب فعل واوی ہوتا ہے تو "نَصَرَ" باب سے آتا ہے اور جب فعل یائی ہوتا ہے تو "فَتَحَ" اور "سَمِعَ" دونوں سے آتا ہے۔ اس سورت میں باب "فَتَحَ" سے آیا ہے۔ (انوار البیان، لسان)

سوال: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ فرعون کی سرکشی کیا تھی؟

جواب: طغیان سے مراد "بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا" ہے۔ خالق کے مقابلے میں اس کی سرکشی اس کا اعلان تھا: "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" اور خلق کے مقابلے میں سرکشی "اس کا اپنی رعیت کو مختلف گروہوں میں بانٹ کر ان پر ظلم ڈھاتا تھا اور ان کو غلام بنانا تھا"۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ "اِنَّهٗ طَغٰى" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "اِنَّهٗ طَغٰى" کا کوئی محل اعراب نہیں ہے کیونکہ یہ جملہ تعلیلیہ ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى﴾ "تَزَكّٰى" اصل میں کیا تھا اور اس حالت میں کیونکر آیا؟ نیز اس آیت کا لفظاً لفظاً اس طرح ترجمہ کریں کہ بات واضح ہو جائے۔

جواب: "تَزَكّٰى" اصل میں "تَتَزَكّٰى" تھا۔ باب تَفَعُّل کے مضارع کی "تاء" جب کسی اور "تاء" پر داخل ہو جائے تو اسے حذف کرنا جائز ہے۔ یہ قاعدہ باب تفاعل اور تفعُّل دونوں میں مستعمل ہے۔ (معارف الصرف)

ترجمہ: پس اس سے کہہ: کیا تجھے اس بات کی طرف کوئی رغبت ہے کہ تو پاکیزگی حاصل کرے۔

سوال: ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى﴾ "اَنْ تَزَكّٰى" کا محل اعراب کیا ہے؟ اور "اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى" کس کے متعلق ہے؟

جواب: "اَنْ تَزَكّٰى" مصدر کی تاویل میں ہوکر "إلى" حرف جر کا مجرور ہے۔ "اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى" ایک محذوف "رغبة" یا "مَیْل" کے متعلق ہے۔ یعنی "فقل هل لك رغبة إلى أن تزكّٰى" (اعراب)

سوال: کیا ﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى﴾ سے معتزلہ کا استدلال درست ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے فعل کا خالق نہیں ہے؟

جواب: یہ بات طے شدہ ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، بلکہ کائنات میں ہر تصرف اس کی مرضی سے ہوتا ہے جس طرح قرآن پاک میں کئی جگہ مذکور ہے، مثلاً ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج:١٦) یہاں "تزکّٰی" فعل کی نسبت فرعون کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ فعل کو انجام دینے والا خود انسان ہوتا ہے اگرچہ اس فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (رازی)

سوال: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى﴾ کی روشنی میں داعی کے لیے دعوتی اسلوب واضح کریں۔

جواب: داعی پر لازم ہے کہ وہ نرم طریقے سے دعوت دے، درشت لہجہ نہ ہو۔ نیز دعوت کا آغاز تزکیہ نفوس اور دعوت الی اللہ سے ہو۔

سوال: ﴿وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾ "فَتَخْشٰى" کا مفعول بہ کیا ہے؟ نیز بتائیں کیا ہدایت دینا اللہ کا کام ہے یا کوئی انسان بھی ہدایت دے سکتا ہے؟

جواب: خشیت سے مراد خوف ہے۔ جب یہ لفظ شرعی معنی میں استعمال ہو اس وقت اس کا مفعول واضح ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا خوف ہی مراد ہوتا ہے۔ جس طرح اٰمن ہے اس کا بھی مفعول بہ ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے حق تعالیٰ شانہ کی وحدانیت ہی مراد ہوتی ہے۔

یہاں تخشى کا مفعول بہ محذوف ہے۔ صاحب تحریر فرماتے ہیں: خشیت کا لفظ جب شرعی زبان میں مطلقاً بولا جاتا ہے تب اس سے مراد اللہ رب العزت کی خشیت اور ڈر مراد ہوتا ہے۔ اسی لئے اس فعل کو فعل لازم کی طرح استعمال کرتے ہیں اور اس کا مفعول بہ ذکر نہیں کرتے کیونکہ جس سے خوف کھانا ہے وہ بداہۃً معلوم ہے۔ جیسے اٰمن فعل ہے۔ شرعی زبان میں کہتے ہیں: اٰمن فلان، فلاں شخص ایمان لایا۔ و فلان مومن فلاں شخص ایمان والا ہے أي مومن بالله و وحدانيته۔

یعنی وہ حق تعالیٰ جل شانہ کی ذات اقدس پر اور اس کی وحدانیت پر ایمان لایا۔ (التحریر)

ہدایت: ہدایت کے دو معنی ہیں۔ صراط مستقیم پر چلانا اور صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی کرنا۔ اس آیت مبارکہ میں ثانی الذکر معنی مراد ہے۔

انبیاء کرام، صلحاء عظام، مرشدین حضرات راہ راست کی طرف راہ نمائی ہی کرتے ہیں۔ صراط مستقیم کو دل میں اتارنا اور اس کی دل میں جگہ بنانا یہ مالک کائنات کا خاصہ ہے۔ اور وہ اپنی ہر صفت میں وحدہ لاشریک ہے۔

سوال: ﴿وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى﴾ میں "اَهۡدِيَكَ" اور "فَتَخۡشٰى" کا محل اعراب اور وجہ اعراب واضح کریں۔

جواب: "اَهۡدِيَكَ" محل نصب میں ہے کیونکہ اس کا "اَنۡ تَزَكّٰى" پر عطف ہے۔

جملہ "فَتَخۡشٰى" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جملہ تعلیلیہ ہے۔ یعنی "کیا میں تیری تیرے رب کی طرف راہنمائی نہ کروں اس کی علت یہ ہے کہ تو اللہ سے ڈر جائے"۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى﴾ خشیت اور خوف میں فرق واضح کریں۔

جواب: خشیت ایسا خوف ہے جو علم کی بنا پر ہوتا ہے جب کہ فقط خوف بغیر علم کے ہوتا ہے۔ (الثمین)

سوال: ﴿وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى﴾ کی روشنی میں بتائیں کیا اللہ تعالیٰ کی معرفت کسی ہادی پر موقوف ہے یا خود بھی حاصل ہو سکتی ہے؟

جواب: درست بات یہ ہے کہ انسان کی ہدایت کا دارومدار کسی ہادی پر ہے۔ اگرچہ بعض ذہین لوگ آیات آفاق سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں لیکن وہ مکمل اور تفصیلی نہیں ہوتی کہ اس پر مؤاخذہ ہو اس لئے شرعی طور پر جن لوگوں تک کسی ذریعے دعوت نہ پہنچے وہ مکلف نہیں ہیں۔ وہ عقل کے ذریعے ہدایت کے مکلف بھی نہیں بلکہ معذور ہوں گے۔ قرآن پاک کی آیت سے بھی یہ معنی مترشح ہوتا ہے کہ ہدایت کا دارومدار ہادی پر منحصر ہے۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا﴾ (ترجمہ: اور ہم بھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں) (بنی اسرائیل: ۱۵) گویا رسول کے ذریعے ہدایت ملے گی، پھر بھی کوئی منکر ہوگا تو عذاب ہوگا۔

سوال: ﴿وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى﴾ کی روشنی میں بتائیں کیا اللہ کی معرفت پہلے ضروری ہے یا اطاعت؟

جواب: اللہ کی معرفت پہلے ضروری ہے۔ کیونکہ اگر معرفت ہوگی تو انسان علی وجہ البصیرۃ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکے گا۔ اس کی تائید کئی آیات سے ہوتی ہے مثلاً ﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ﴾ (ترجمہ: پس جان لے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں) (محمد: ۱۹) ﴿اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا﴾ (ترجمہ: اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں) (فاطر: ۲۸) اسی طرح فرمایا ﴿اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ﴾ (ترجمہ: کہ خبردار کرو کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، سو مجھ سے ڈرو) (النحل: ۲) (رازی)

سوال: ﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى﴾ "فأراہ" کون سا صیغہ ہے؟ اصل میں کیا تھا؟ مکمل صرفی تحلیل کریں۔

جواب: فأراہ: "أَرَا" باب افعال "أَرٰى يُرِيْ إِرَاءَةً" سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: ر،ا،ی۔ ہفت اقسام میں مہموز العین اور ناقص یائی ہے۔ یہ اصل میں "أَرْأَيَ" تھا۔ ی متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا، پھر ہمزہ سے قبل حرف صحیح ساکن ہونے کی وجہ سے ہمزہ کی حرکت راء کو دے کر ہمزہ گرادیا اس طرح "أَرَا" ہوگیا۔

سوال: ﴿فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى﴾ "اٰية الكبرٰى" سے کیا مراد ہے؟

جواب: راجح قول کے مطابق "آیة الکبریٰ" سے مراد عصا ہے، کیونکہ جتنے بھی دوسرے معجزات تھے وہ سب عصا سے ہی ظاہر ہوئے تھے سوائے ید بیضاء کے۔ (رازی، تدبر)

سوال: ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰى﴾ "فَحَشَرَ" اور "نَادٰى" کا مفعول ذکر کریں اور بتائیں اسکو کیوں حذف کیا گیا؟

جواب: "أي فحشر أهل المدينة وناداهم" اس کو حذف اس لیے کیا کیوں کہ یہاں مفعول واضح تھا کہ فرعون نے اپنے شہروالوں کو جمع کیا تھا اور انہیں یہ آواز دی تھی۔

سوال: ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ "الأعلىٰ" کیا صیغہ ہے؟ یہاں اس کا معنی اسم تفضیل والا ہے یا صفت والا؟

جواب: "أعلىٰ" "عَلَا يَعْلُوْ عُلُوًّا" (ن) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ع،ل،و۔ سیاق کلام بتارہا ہے کہ یہاں "أعلیٰ" اسم تفضیل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب کہ صاحب اعراب القرآن (محمود صافی) کے ہاں یہاں صفت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

سوال: ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ لفظ "الْاَعْلٰى" اصل میں کیا تھا؟ اس کی صرفی تحلیل کریں۔

جواب: لفظ "أعلیٰ" اصل میں "أَفْعَلُ" کے وزن پر "أَعْلَوُ" تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح ہے، اس لئے الف سے بدل دیا گیا۔

سوال: ﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ "فنادیٰ" سے ترکیب میں کیا واقع ہورہا ہے؟

جواب: فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى "فنادیٰ" سے بدل مطابق (بدل کل) ہے۔

سوال: فرعون نے ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کیوں کہا؟ حالانکہ علماء کا کہنا ہے کہ توحید ربوبیت کو تمام لوگ مانتے ہیں۔

جواب: اس لیے کہ اس دور کے لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ فرعون رب الأرباب ہے۔

سوال: فرعون نے اپنے آپ کو مذہبی طور پر "رب الأعلیٰ" کہا تھا یا سیاسی طور پر؟ وضاحت کریں؟

جواب: فرعون اپنے آپ کو سیاسی طور پر "رب الأعلیٰ" یعنی تمام معاملات میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک سمجھتا تھا۔ مذہبی طور پر نہیں۔ اس کی صراحت سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۲۷ میں موجود ہے کہ وہ کسی اور کو الٰہ سمجھتا تھا۔ ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ﴾ (ترجمہ: اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا، تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟) (الاعراف: ۱۲۷) عقلی طور پر بھی اس کا رب ہونا ناممکن تھا کیونکہ لوگ اس سے سوال کر سکتے تھے تم سے پہلے رب کون تھا؟ اگر کہیں اس نے اپنے آپ کو رب کہا تو وہ نظام مملکت میں حکم جاری کرنے کے اعتبار سے ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ "نَكَالَ" مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا مفعول مطلق کا نائب ہونے کی وجہ سے؟

جواب: اس کو مفعول لاجلہ بنانا بہتر ہے اور مفعول مطلق بھی بنا سکتے ہیں کیونکہ "نَكَالَ" اور "أخذ" معنی میں مناسبت رکھتے ہیں۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ "نَكَالَ" کون سا صیغہ ہے اور کس باب سے ہے؟

جواب: "نَكَالَ" باب تفعیل 'نَكَّلَ يُنَكِّلُ تَنْكِيلًا' سے اسم مصدر ہے۔ مادہ: ن، ک، ل۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ "أُولىٰ" اور "آخرۃ" کون سے صیغہ ہیں؟

جواب: "أُولىٰ" اسم تفضیل "أوّل" کی مؤنث ہے۔ (انوار)

"اٰخرۃ" "اٰخر" کی مؤنث ہے۔ لیکن یہاں اسم جامد استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشگی کے گھر پر دلالت کر رہا ہے۔ اٰخرۃ اصل میں أأخرۃ تھا۔ ہمزہ ساکن کو ماقبل کی حرکت کے موافق حرف علت سے بدلا۔ اٰخرۃ ہوا۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ کا ترجمہ اور مفہوم واضح کریں۔

جواب: ترجمہ: بالآخر اللہ نے اسے دنیا اور آخرت، کے عذاب میں پکڑ لیا۔

مفہوم: نکال کے معنی عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ یعنی جب اس نے سب کچھ دیکھ اور سن لینے کے بعد بھی اپنی سرکشی ہی پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو آخرت اور دنیا دونوں کے عذاب میں پکڑا۔ دنیا میں وہ سمندر کی موجوں کے حوالے ہوا اور آخرت میں جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔ (تدبر)

"نَكَالَ الْآخِرَةِ" سے مراد آخرت کے روز جہنم کا عذاب ہے۔ اور "أُولىٰ" سے مراد دنیا میں پانی میں غرق ہو کر مرنے کی

ذلت ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾ "یَخْشٰی" کیا صیغہ ہے؟ اور اس میں کیا تعلیل واقع ہوئی ہے؟

جواب: یَخْشٰی: خَشِیَ یَخْشٰی خَشْیًا وَ خَشْیَةً (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ اصل میں یَخْشَیُ تھا، یاء متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا ہو گیا۔ مادہ: خ، ش، ی۔

سوال: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾ "عبرۃ" کا لغوی معنی بتائیں۔

جواب: "وادی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنا یا نہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا"۔ یہاں "عبرۃ" سے موعظت اور نصیحت مراد ہے۔

سوال: "لمن یخشی" بول کر مشرکین سے تعریض کیوں برتی گئی ہے؟

جواب: مشرکین سے اعراض اس لیے برتا گیا کیونکہ وہ اس نصیحت سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتے تھے جس طرح فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ کے معجزات سے کوئی انتفاع نہیں کیا۔ اسی طرح اس کی روحانی ذریت بھی موعظت اور نصیحت سے فائدہ نہ پائے گی۔

سوال: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا﴾ "اَشَدُّ" کیا صیغہ ہے اور "خلقًا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: اَشَدُّ: شَدَّ یَشِدُّ شَدًّا (ض) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ش، د، د۔ جس کا معنی ہے: سخت ہونا، مضبوط ہونا۔ "خلقًا" تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (قاموس، اعراب)

سوال: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا﴾ "أنتم" کی خبر کیا ہے؟

جواب: "أنتم" کی خبر "أشدّ خَلْقًا" ہے۔

سوال: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا﴾ میں "خَلْقًا" سے مراد پہلی پیدائش ہے یا دوسری؟

جواب: "أأنتم أشدّ خَلْقًا" سے مراد موت کے بعد انسان کو زندہ کرنا ہے۔ پہلی پیدائش مراد نہیں کیونکہ وہ تو سب کے ہاں ثابت ہے۔ (رازی)

سوال: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا﴾ "السَّمَآءُ" مرفوع کیوں ہے اور "بَنٰىهَا" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "السَّمَآءُ" کا عطف "اَنْتُمْ" ضمیر مبتدا پر ہو رہا ہے اس لئے یہ مرفوع ہے۔

"بَنٰىهَا" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جملہ بیانیہ ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟ نیز "سمك" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: ﴿رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا﴾ "بنٰها" سے بدل اشتمال بھی ہوسکتا ہے اور جملہ مبینہ بھی ہوسکتا ہے۔

السمك الحوت من خلق الماء۔ آبی مخلوق مچھلی کو کہتے ہیں۔ والسمكة: فلکی برج کو بھی السمكة کہتے ہیں۔ سمك الشيء يمسكه سمكا رفعه فارتفعه۔ کسی چیز کو بلند کیا وہ بلند ہوگئی۔ سمك البيت سقفه: سمک کا لفظ کمرے کی چھت پر بھی بولا جاتا ہے۔ (لسان)

سوال: ﴿وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا﴾ کا عطف کس جملے پر ہے؟

جواب: ﴿وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا﴾ کا عطف "بنٰها" پر ہے۔

سوال: ﴿وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰهَا﴾ میں "لَيۡلَهَا" کی نسبت آسمان کی طرف کیوں کی گئی ہے؟

جواب: "لَيۡلٌ" کی نسبت آسمان کی طرف اس لئے کی گئی کیونکہ دن رات طلوع شمس وغروب کے سبب سے وقوع پذیر ہوتے ہیں اور طلوع وغروب شمس کا تعلق آسمان سے ہے۔

سوال: ﴿وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰهَا﴾ "ضُحٰهَا" کی "ها" ضمیر "السَّمَآء" طرف لوٹتی ہے یا "ليل" کی طرف؟

جواب: "ضُحٰهَا" میں "ها" ضمیر آسمان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (المنیر، رازی)

سوال: ﴿وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ "دحٰی" کون سا صیغہ ہے؟

جواب: "دحٰی" "دَحَا يَدۡحُو دَحۡوًا" (ن) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: د، ح، و۔ یہ "دَحٰی يَدۡحٰی" سے بھی آتا ہے۔ مادہ: د، ح، ی۔ دونوں کا معنیٰ "پھیلانا اور ہموار کرنا" ہے۔ (لسان، قاموس)

سوال: ﴿وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ "الأرض" واجب الحذف عامل کا مفعول بہ ہے اس عامل کی وضاحت کریں۔

جواب: ﴿وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ میں "الأرض" مفعول ہے اور اس کا عامل (فعل) محذوف ہے۔ وہ محذوف فعل "دحا" ہے۔ کیونکہ بعد والا فعل اس پر دلالت کر رہا ہے اسے اصطلاح میں "ما أضمر عامله على شريطة التفسير" کہتے ہیں۔ اور یہ تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ کے مطابق زمین کی پیدائش آسمان کے بعد اور سورۃ "حم السجدة" کی آیت ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ﴾ (ترجمہ: پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی

سے آ گئے) (حم السجدة:۱۱) کے مطابق زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہے۔اس میں تطبیق دیں۔

جواب: حقیقت میں اس جگہ یا سورت حم السجدہ میں زمین و آسمان میں سے کون مقدم ہے یہ بتلانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ تخلیقی مراحل کی وضاحت مقصود ہے۔ یہ ایسا ہی اسلوب ہے جیسے سورۃ قلم میں ﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ﴾ ہے (قلم:۱۳) یہاں تقدیم وتاخیر کا بیان مقصود نہیں۔تمام مقامات کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کا خاکہ اکٹھا تیار کیا، پھر آسمان کو ہموار کر دیا اور مکمل کر دیا، پھر زمین کو ہموار کر کے قابل نمو اور قابل انتفاع کر دیا۔ واللہ اعلم

یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے کچھ کام زمین کا کیا، پھر آسمان کا۔اسی طرح دونوں کو وقتاً فوقتاً سات دنوں میں مکمل کر دیا۔ (مزید تفصیل کے لیے تدبر دیکھئے)

سوال: ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا﴾ "مرعیٰ" کا معنی عمومی طور پر چارہ کیا جاتا ہے مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے "مرعی" کے بارے میں فرمایا ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ تو کیا انسانوں کے لئے "مرعی" کی نسبت ہوسکتی ہے؟

جواب: عام طور پر "رَتَعَ" اور "رَعیٰ" جانوروں کے چرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔لیکن انسان کے لیے اس کا استعمال جائز ہے۔جس طرح سورۃ یوسف میں ہے ﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ﴾ (یوسف:۱۲) اسی طرح ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ سے واضح ہے کہ یہ انسانوں کے لیے بھی ہے۔ (رازی، تفہیم)

سوال: ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا﴾ "مرعی" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "مرعی" "مَفْعَلٌ" کے وزن پر "رَعیٰ يَرْعٰى رَعْيًا" (ف) سے مصدر میمی ہے۔مادہ: ر، ع، ی۔ یا اس کو ظرف مکان بھی بنا سکتے ہیں۔

سوال: ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ "مَتَاعًا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "مَتَاعًا" مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔یعنی "فعل ذالك مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ"

سوال: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾ "الطامة" اور "الْكُبْرٰى" کیا صیغے ہیں؟

جواب: "الطامة" باب "طَمَّ يَطِمُّ طَمًّا" (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔مادہ: ط،م،م۔

الْكُبْرٰى: كَبُرَ يَكْبُرُ كِبَرًا وَ كُبْرًا (ش) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے مادہ: ک، ب، ر۔

سوال: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾ "الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى" کا لغوی معنی "ہر چیز پر چھا جانے والی" ہے۔عربوں کے ہاں 'طامة' 'ناقابل برداشت

مصیبت'' کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد روزِ قیامت ہے۔ (رازی، انوار)

سوال: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾ میں شرط ہے اس کا جواب شرط کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب شرط محذوف ہے اور وہ ہے ''یُبعَثُ الناس'' یا ''یُحاسَب الناس''

سوال: ﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى﴾ ''يَوْمَ يَتَذَكَّرُ'' میں ''یوم'' کسی فعل سے متعلق ہے یا پچھلی آیت میں موجود ''إذا'' سے بدل ہے؟

جواب: یا تو اسے جواب شرط کے متعلق کریں گے یعنی ''یحاسب الإنسان یوم یتذکر'' یا اسے ''إذا'' سے بدل بنا لیں۔ اس صورت میں یہ جملہ بھی شرط ہوگا اور جواب شرط بعد میں محذوف ہوگا۔

سوال: ﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى﴾ کیا جہنم ہر انسان کے سامنے ظاہر کی جائے گی یا صرف کفار کے لئے؟

جواب: جہنم ہر انسان کے سامنے ظاہر کی جائے گی اور اسے ہر کوئی دیکھے گا۔ کفار اس میں داخل ہو جائیں گے لیکن مسلمان گزر جائیں گے۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم:۷۱) یعنی جہنم سے واسطہ بلا تخصیصِ کفار ہر کسی کو پڑے گا۔ (انوار۔ رازی، کشاف)

سوال: ﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى﴾ ''يَرٰى'' کی صرفی تحلیل کریں؟ نیز ''لِمَنْ يَّرٰى'' کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: ''يَرَىٰ'' اصل میں ''يَرْأَيُ'' تھا۔ تعلیل واضح ہے۔

مفہوم: ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔ (تفہیم، ترجمہ)

سوال: ﴿وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ ''اٰثَرَ'' کیا صیغہ ہے؟ اس کی تعلیل بھی کریں۔

جواب: ''اٰثَرَ'' باب إفعال ''اٰثَرَ يُؤْثِرُ اِيْثَارًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں ''أَأْثَرَ'' تھا۔ مادہ: ا، ث، ر۔

سوال: ﴿فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ ''المأوٰی'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: ''مأوٰی'' ''أَوٰى يَأْوِي أُوِيًّا'' (ض) سے ظرف مکان ہے۔ مادہ: ا، و، ی۔

سوال: ﴿فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ میں ''هِيَ الْمَاْوٰى'' ''إنَّ'' کی خبر ہے اور خبر جب جملہ ہو تو اس میں کوئی ضمیر ہونی

چاہیے جو مبتدا کی طرف لوٹے لیکن "هِيَ الْمَأْوٰى" میں کوئی ضمیر نہیں پھر یہ خبر کیسے ہوئی؟ وضاحت کریں۔

جواب: "المأوٰی" اصل میں "مأواہ" ہے۔ الف لام اضافت کے بدلے میں ہے۔ جب کہ علامہ زمخشری کے ہاں الف لام اضافت کے عوض نہیں بلکہ تعریف کا ہے۔ اور "المأوٰی" سے مراد "مأواہ" ہی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے "غض الطرف" تو مراد "طرفك" ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔ (المنیر، الکشاف)

سوال: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ میں "أَمَّا" کس معنی میں ہے؟ اور "مَقَام" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "أَمَّا" یہاں تفصیلیہ اور شرطیہ ہے۔ (التحریر)

"مَقَام" "قَامَ يَقُوْمُ قِيَامًا (ن) سے مصدر میمی یا ظرف مکان ہے۔ مادہ: ق، و، م۔ اصل میں مَقْوَمٌ مَفْعَلٌ کے وزن پر تھا۔ واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن، واؤ کی حرکت ماقبل کو دی۔ مَقَوْمٌ ہو گیا، واؤ اصلا متحرک تھی اور اس کا ماقبل مفتوح تھا اس لئے واؤ کو الف سے بدلا، مقام ہو گیا۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ "خاف" کیا صیغہ ہے؟

جواب: خَافَ: "خَافَ يَخَافُ خَوْفًا" (ع) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: خ، و، ف۔ اصل میں "خَوِفَ" تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا ہے۔

سوال: ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ "هَوٰى" کیا صیغہ ہے؟ اور کس معنی میں استعمال ہوتا ہے؟

جواب: هَوٰى: "هَوِيَ يَهْوٰى هَوًى" (ع) سے مصدر بمعنی مفعول ہے۔ جیسے خَلْقٌ بمعنی مخلوق۔ مادہ: ہ، و، ی۔ "قوائے نفس کا غصے یا شہوانی حالت میں حق اور کامل فائدہ کے خلاف چاہت کرنا اور مذموم چیز کی رغبت میں" بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جملہ استئنافیہ ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا﴾ "اَيَّانَ" ظرف کس کے متعلق ہے؟

جواب: "أيان" "مبتدا "مرساها" کی محذوف خبر "ثابت" کے متعلق ہے۔

سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا﴾ "اَيَّانَ مُرْسٰىهَا" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "اَيَّانَ مُرْسٰىهَا" جملے کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جملہ بیانیہ ہے۔

سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا﴾ "مُرسیٰ" کا ترجمہ اور صیغہ بتلائیں۔

جواب: مُرسیٰ: باب افعال "اَرْسیٰ یُرْسِی اِرْسَاءً" سے مصدر میمی ہے۔ اَرْسیٰ الشَّیئُ: جمنا ٹھیرنا لنگرانداز ہونا، یعنی وہ قیامت کے متعلق سوال کرتے تھے کہ اس کا قیام کب ہے، یہ کب ٹھہرے گی اور لنگرانداز ہوگی۔ مادہ: ر،س،و۔ (قاموس)

سوال: ﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز بتلائیں اس میں مذکور ضمیر "أنت" کی خبر کون سی ہے؟

جواب: ترجمہ: تمہیں اس بحث سے کیا تعلق۔ (تدبر) "أنت" مبتدا ہے اس کی خبر (ثابت) محذوف ہے۔

سوال: ﴿فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴾ کی ترکیب کیا ہے؟

جواب: "فِيْمَ" محذوف سے متعلق ہوکر خبر مقدم اور "أنت" ضمیر مبتدا ہے۔ "مِنْ ذِكْرٰىهَا" جار مجرور خبر میں محذوف "مستقر" کے متعلق ہے یا "أنت" ضمیر مبتدا سے حال ہے۔

سوال: ﴿اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز "مُنْتَهٰی" کیا صیغہ ہے؟

جواب: "اس (کے علم) کی انتہاء صرف آپ کے پروردگار کی طرف ہے۔" "مُنْتَهٰی" باب افتعال "اِنْتَهٰى يَنْتَهِي اِنْتِهَاءً" سے ظرف زمان ومکان یا مصدر میمی ہے۔ مادہ: ن،ہ،ی۔

سوال: ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا﴾ "مَنْ يَّخْشٰىهَا" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "مَنْ يَّخْشٰىهَا" "مُنْذِرُ" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

فائدہ: امام زجاج کے نزدیک جب اسم فاعل فَاعِل یا مُفعِل کے وزن پر ہو اور اس سے حال یا مستقبل کا معنی لینا مقصود ہو تو اس وقت اسم فاعل پر تنوین لانا ضروری ہے۔ اس کو مضاف کر کے تنوین نہیں گرا سکتے البتہ تخفیف کی غرض سے گرا سکتے ہیں۔ مثلاً ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا﴾ کیونکہ اسم فاعل فعل سے بدل ہوتا ہے اور فعل نکرہ ہوتا ہے، اس لئے اسم فاعل پر تنوین قائم رکھ کے اس کو بھی نکرہ رکھتے ہیں، لیکن جب اسم فاعل سے فعل ماضی کا معنی لینا مقصود ہو تو اس وقت اضافت ہی ضروری ہے۔ مثلاً "أَنْتَ مُنْذِرُ زَيْدٍ أمس"۔

سوال: ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا﴾ کیا آپ صرف ان لوگوں کو ڈرانے والے ہیں جو قیامت سے ڈرنے والے ہیں؟

جواب: اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو نہ ڈرائیں جو اس قیامت سے نہیں ڈرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف اسی کو پہنچے گا جو اس دن کے آنے کا خوف کھائے گا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ استاد اس کو پڑھائے گا جو پڑھنے آئے گا یعنی فائدہ صرف وہی اٹھائے گا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا﴾ "يَوْمَ يَرَوْنَهَا" کا محل اعراب کیا ہے؟ نیز "يَرَوْنَهَا" کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: "يَوْمَ يَرَوْنَهَا" ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور "يَرَوْنَهَا" "يَوْمَ" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ "يَرَوْنَ" کیا صیغہ ہے؟

جواب: يَرَوْنَ: "رَاٰى يَرٰى رَاْيًا وَرُؤْيَةً" (ف) سے جمع مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں "يَرْاَيُوْنَ" تھا۔ مادہ: ر، ا، ی۔

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ کیا "كَاَنَّهُمْ" کا تعلق "يَوْمَ يَرَوْنَهَا" سے ہے یا "لَمْ يَلْبَثُوْٓا" سے ہے؟

جواب: "كَاَنَّهُمْ" کا تعلق "لَمْ يَلْبَثُوْٓا" سے ہے، کیونکہ "لَمْ يَلْبَثُوْٓا" "كَاَنَّ" کی خبر ہے اور "يَوْمَ يَرَوْنَهَا" "لَمْ يَلْبَثُوْٓا" کا مفعول فیہ یا اس کی "هم" ضمیر سے حال ہے۔

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ کا ایسا سلیس ترجمہ کریں کہ مفہوم میں کوئی تشنگی نہ رہے۔

جواب: یہ جس دن اس کو دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ گویا ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ (دنیا میں) نہیں رہے۔ (البیان)

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ "عَشِيَّةً" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "عَشِيَّةً" ظرف زمان ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ "ضُحٰهَا" میں "ها" ضمیر "عَشِيَّةً" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کی کیا توجیہ کریں گے؟

جواب: یہاں کلام میں حذف ہے۔ اصل "إلا عشية يومٍ أو ضحٰها" ہے۔ یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق آخر میں "ها" زائدہ ہے جو کہ ربط کلام کے لئے ہے۔ اصل میں "عشية أو ضُحًى" ہے۔ (الرازی، المنیر، انوار)

سُوْرَةُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴿١﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿٢﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ﴿٣﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ
الذِّكْرٰى ﴿٤﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿٥﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿٦﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿٧﴾ وَاَمَّا
مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿١٠﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ
ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿١٧﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿١٨﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿١٩﴾ ثُمَّ
السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿٢١﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿٢٢﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ
اَمَرَهٗ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿٢٤﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا
الْاَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَّحَدَآئِقَ
غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ
يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوْهٌ
يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع یہ ہے کہ دعوت میں کن لوگوں کو ترجیح دی جائے نیز قرآن کی تعلیمات کی رفعت اور احوال قیامت پر بطور دلیل انسانی تخلیق اور اس کے لئے سامان زیست وغیرہ مہیا کرنے کو بیان کیا ہے۔

سوال: اس سورت کی پچھلی سورت سے کیا مطابقت ہے؟

جواب: سورۃ النازعات میں تھا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ (النازعات: ۴۵) اور سورۃ عبس کی ابتدا میں بھی یہی مضمون بیان ہو رہا ہے کہ جو اس انذار کے اہل ہیں ان پر زیادہ توجہ دو۔ نیز دونوں سورتوں میں احوال قیامت کا بیان ہے۔

سورۃ النازعات میں قیامت کے وقوع پر بطور دلیل زمین و آسمان اور پہاڑوں کی تخلیق کو پیش کیا تھا اور اس سورۃ میں انسانی تخلیق، اس کے لئے سامان زیست مہیا کرنا اور چوپاؤں کے چارے کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا شان نزول بیان کریں۔

جواب: ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے بڑے بڑے سرداروں کو اسلام کی طرف راغب کر رہے تھے۔ اسی دوران حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اسلامی تعلیمات سیکھنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت ان کا آنا ناگوار گزرا، کیونکہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام چاہتے تھے یہ بڑے بڑے لوگ مسلمان ہو جائیں تاکہ اسلام کو قوت ملے۔ اس وقت یہ سورت نازل ہوئی (ترمذی: ۳۳۳۱، صحیح)۔ (تفہیم، رازی، المنیر)

سوال: حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائے اس وقت وہ مسلمان تھے یا نہیں یا اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے؟

جواب: ساری روایات جمع کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم اسلام لا چکے تھے۔ تفسیر طبری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور کہنے لگے "يَا رَسُولَ اللهِ عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ"۔ ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ "وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے یارسول اللہ مجھے سیدھا راستہ بتایئے"۔ اگر وہ مسلمان تھے تب ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیت کا مطلب پوچھنے لگے تھے۔ (تفہیم) ویسے بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے آنے سے اس لئے ناگواری محسوس کی کہ وہ مسلمان تھے۔ ان کی وجہ سے کفار کے اعراض کا خطرہ تھا۔ اگر وہ بھی اس وقت مسلمان نہ ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ناگواری محسوس کرنے کی بظاہر کوئی وجہ محسوس نہیں ہوتی۔

سوال: اس سورت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے یا مشرکین پر عتاب ہے؟

جواب: حقیقت میں سورۃ عبس میں مشرکین پر عتاب نازل ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو فقط اپنے اوپر بارِ گراں لینے پر رہنمائی ہے کہ معرضین کے پیچھے نہ پڑو۔ ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء: ۳) (ترجمہ: شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر جان دے دیں گے)۔ طالبین حق کی طرف توجہ دو لیکن مشرکین پر سخت عتاب ہے اور کنایۃً یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ یہ مغرورین اور متکبرین قبولیت حق کے قابل ہی نہیں، ان کو اپنی گمراہی اور سرکشی میں حیران و سرگرداں چھوڑ کر حقیقی طالبین حق کی تربیت کریں۔

سوال: ﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ﴾ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرنے کی حقیقی وجہ کیا تھی؟

جواب: نبی ﷺ مشرکین کی اصلاح اور خیر خواہی میں حد سے گزر گئے تھے اور ان کی ہدایت کی خاطر حقیقی طالبین ہدایت کی طرف کما حقہ توجہ بھی نہیں دی جارہی تھی۔ نبی ﷺ کی حالت ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ (الکہف:٦) (ترجمہ: پس شاید آپ ان کے پیچھے غم سے اپنی جان دے دینگے اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے) والی تھی۔ حالانکہ آپ ﷺ کا مقام تو یہ تھا ﴿فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (التغابن:١٢) (ترجمہ: پھر اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے) نیز آپ ﷺ کی رہنمائی تھی کہ وعظ ونصیحت اور تبلیغ دین میں امت میں عدل کا معاملہ کریں۔ کسی فرد کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہوئے اسے بالکل نظر انداز نہ کریں۔ واللہ اعلم (تفہیم، تدبر)

سوال: حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف التفات نہ کرنے کی اصل وجہ کیا تھی؟

جواب: ہجرت سے قبل آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ میں اپنی دعوت کو عام کرنے میں مصروف عمل تھے کہ ایک دن روساء قریش آپ کی مجلس میں آکر بیٹھ گئے۔ (یہ لوگ بے حد مغرور اور بڑے خود پسند تھے۔ وہ آپکی مجلسوں میں صرف اس لئے آنا ناپسند کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں ادنی، بے حیثیت اور بدحال لوگ ہوتے ہیں)۔ اتنے میں ایک نابینا اور نادار صحابی آپ سے کچھ دریافت کرنے کے لئے وہاں آبیٹھے۔ آپ ﷺ نے اس صحابی کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے روساء قریش کو اسلام کی خوبیاں اور بت پرستی کی برائیوں سے آگاہ فرمارہے تھے۔ اس لئے کہ اس موقعہ پر آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں میں اثر پذیری نظر آرہی تھی۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا آنا اور کچھ پوچھنا آپ ﷺ پر ناگوار گزرا۔ یہ سب کچھ نیک نیتی سے تھا کہ عبداللہ تو پہلے ہی مشرف باسلام ہیں وہ بعد میں بھی مسئلہ پوچھ سکتے تھے۔ اس لئے آپ ﷺ نے ان کی طرف توجہ نہ فرمائی اور مکمل انہماک کے ساتھ اپنی دعوت میں مشغول رہے کہ اگر یہ روساء مسلمان ہو گئے تو اسلام کی عزت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ اس موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (سیرت النبی از شبلی نعمانی: ٧٦/٤)

سوال: کیا اس میں آپ ﷺ کا کوئی ذاتی مفاد تھا؟

جواب: نبی ﷺ کے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے اعراض کرنے اور مشرکین قریش کو لائق اعتنا سمجھنے میں کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ بڑے بڑے سرداران قریش ایمان لے آئیں تو اسلام اور اہل اسلام کو قوت وغلبہ حاصل ہوگا۔ جب کہ حضرت ابن ام مکتوم کو تو آپ ﷺ بعد میں بھی تعلیم دے سکتے تھے۔ (تفہیم، رازی، تدبر)

سوال: اس آیت میں نبی ﷺ کو مخاطب کیوں کیا گیا حالانکہ بظاہر غلطی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی نظر آتی ہے کیونکہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مقصد کیلئے بیٹھے تھے جس سے زیادہ لوگ مسلمان ہو سکتے تھے جبکہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اپنے انفرادی کام کیلئے آئے تھے؟

جواب: بادی النظر میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی غلطی نظر آرہی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اہم مقصد سے مشغول کر دیا، لیکن ممکن ہے کہ وہ اس معاملہ میں معذور ہوں کیونکہ وہ نابینا تھے۔ جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے شفیقانہ تنبیہ کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منکرین حق کو ترجیح دیتے ہوئے حقیقی طالب حق کو نظرانداز کررہے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق آپ کے مقصد کی نوعیت کچھ اس طرح ہونی چاہیے تھی ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الانعام: ۵۲) (ترجمہ: ان لوگوں کو نہ نکالئے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام خاص اسی کی رضا کا قصد کرتے ہوئے پکارتے ہیں) (رازی، تفہیم)۔

سوال: کیا اس سورت کی ابتدائی آیات سے یہ مفہوم اخذ ہوسکتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام معصوم عن الخطاء نہیں ہیں؟

جواب: انبیاء کرام کے معصوم عن الخطاء ہونے کے بارے میں علماء کے دو موقف ہیں:

(۱) انبیاء کرام معصوم عن الخطاء ہیں، ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات وہ بہترین کو نظرانداز کرکے بہتر کو اختیار کر لیتے ہیں اور حسنات الأبرار سيئات المقربين کے تحت ان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی دعوت کے پھیلاؤ اور مسلمانوں کی تقویت کے حصول کی خاطر ان کی ناز برداری کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ان سرداروں کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا تھا۔ اس لئے یہ غلطی نہیں ہے بلکہ محض سرداروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا ہے۔ واللہ اعلم (تفصیل کیلئے: سیرۃ النبی: ج ۴ ص ۷۵)

(۲) انبیاء کرام سے غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں لیکن ان پر استقرار نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً وحی کی صورت میں رہنمائی آجاتی ہے۔ یہ مفہوم قرآن پاک کی ان آیت سے بھی واضح ہے ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (التوبۃ: ۴۳) ﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التحریم: ۱) سورۂ عبس میں آپ کو تبلیغ کے سلسلے میں بارگراں اٹھانے پر فقط شفیقانہ تنبیہ کی گئی ہے۔ انبیاء کی غلطیاں اجتہادی نوعیت کی ہوتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ متنبہ کر دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفصیل کیلئے: فتاوی ابن تیمیہ)

سوال: اس سورت کی ابتدائی آیات کی روشنی میں دعوتی منہج کی وضاحت کریں۔

جواب: اس سورت کی ابتدائی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں مساوات کا معاملہ کرنا چاہیے نیز تبلیغ

دین اور وعظ ونصیحت کے لئے ایسے لوگوں کو ترجیح دی جائے جن میں طلبِ ہدایت کا حقیقی جذبہ ہو۔ جب کہ ایسے لوگوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں جو حق سے اعراض کرنے والے اور متکبر ہیں۔ (تفہیم، تدبر، المنیر)

سوال: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى﴾ "عَبَسَ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "عَبَسَ" "عَبَسَ یَعْبِسُ عَبْسًا وَعُبُوسًا" (ض) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے، جس کا معنی ''پیشانی پر بل پڑنا اور تیوری چڑھنا'' ہے۔ (قاموس)

سوال: "تَوَلّٰی" صیغہ اور معنی ذکر کریں۔

جواب: تَوَلّٰی: باب تفعل ''تَوَلّٰی یَتَوَلّٰی تَوَلِّیًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: و، ل، ی۔ ہفت اقسام میں لفیف مفروق ہے۔ معنی: دور ہونا، پیٹھ پھیرنا۔ (قاموس)

سوال: "جَاءَ" کی اصل بتاتے ہوئے اسکی تعلیل کریں اور بتائیں کہ یہ ہفت اقسام میں کیا ہے؟

جواب: جَاءَ: "جَاءَ یَجِيْءُ جَیْئًا وَ مَجِیْئًا" (ض) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں ''جَیَءَ'' تھا۔ ی متحرک ماقبل مفتوح، ی کو الف سے بدلا ''جَاءَ'' ہو گیا۔ مادہ: ج، ی، ء۔ ہفت اقسام میں اجوف یائی اور مہموز اللام ہے۔

سوال: ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ کس فعل کے متعلق ہے "عَبَسَ" کے یا "تولّٰی" کے؟ نیز اسکا اصطلاحی نام ذکر کریں؟

جواب: جملہ ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ "عَبَسَ" یا "تَوَلّٰی" دونوں میں سے کسی ایک کا مفعول لہ بن سکتا ہے۔ اس کو نحو کی اصطلاح میں تنازع الفعلین کہتے ہیں۔

سوال: ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: ﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ محل جر میں ہے کیونکہ اس نے پہلے حرف جر ''لام'' محذوف ہے۔ اس جملے کو مفعول لہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں بھی مان سکتے ہیں۔ (اعراب، انوار)

سوال: ﴿جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: ﴿جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ موصول حرفی "اَن" کا صلہ ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

سوال: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى﴾ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کی بجائے صیغہ غیب کیوں مستعمل ہوا؟ حالانکہ مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

جواب: پہلی دو آیات میں براہ راست آپ کو خطاب کی بجائے صیغہ غیب استعمال کرنے میں ایک عجیب اور لطیف حکمت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ اس طریقے سے آپ کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ آپ نے مشرکین عرب اور ایک نابینا صحابی کے

سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا وہ آپ کے لئے مناسب نہیں۔ گویا اگر کوئی جاننے والا آپ کو یہ معاملہ کرتے دیکھتا تو وہ اس رویے سے آپ کو مستبعد جانتا۔ واللہ اعلم (تفہیم، انوار)

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى﴾ میں رسول اللہ ﷺ کو غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا اگرچہ بعد میں ﴿وَمَا يُدْرِيكَ﴾ سے مخاطب فرمالیا، اس میں یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نابینا صحابی سے بے توجہی کی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اصلاح آپ کے خطاب سے بے توجہی فرمائی۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اکرام کی وجہ سے آپ کو مخاطب کر کے اظہار ناراضگی نہیں فرمایا۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى﴾ کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: تمہیں کیا معلوم، کہ وہ شاید وہ سدھرتا۔

سوال: ﴿وَمَا يُدْرِيكَ﴾ کون سا صیغہ ہے؟ اور بتائیں کہ یہاں "مَا" کون سا ہے؟

جواب: "يُدْرِيكَ" باب افعال "اَدْرٰى يُدْرِي اِدْرَاءً" سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: د، ر، ی۔

"وَمَا يُدْرِيكَ" میں "مَا" اسم استفہام مبتدا بن رہا ہے۔ اور "يُدْرِيكَ" اس کی خبر ہے۔

سوال: ﴿لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى﴾ میں "لعل" کی خبر کون سی ہے؟ نیز "لعل" کی نحوی وضاحت کریں۔

جواب: "لعل" کی خبر "يزّكى" فعل ہے۔

یہ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے، اپنے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے، اس کے متعدد معانی ہیں، مشہور یہ ہیں:

(۱) ترجی: ایسی چیز کی توقع جس کے حصول کا یقین نہ ہو اور اس میں خواہش شامل ہو۔ جیسے: لَعَلَّ الْجَوَّ مُعْتَدِلٌ غَدًا۔

(۲) الاشفاق: کسی ناگوار بات کی توقع جیسے: لَعَلَّ الْمَرِيضَ يَقْضِي۔

(۳) کبھی تعلیل کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ:۴۴)

(۴) کبھی استفہام کے لئے بھی آتا ہے جیسے: ﴿لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ (ترجمہ: تجھے کیا معلوم کہ اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات ہی پیدا کر دے) (الطلاق:۱) (قاموس، معجم النحو)

سوال: ﴿لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: "لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى" یہ جملہ "يدريك" فعل کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: "يزّكى" اور "يذّكر" کون سے صیغے ہیں؟ اصل میں کیا ہیں؟ ان کی مکمل صرفی تحلیل کریں۔

جواب: "یزّکی" اور "یذّکر" باب تفعُّل "تزکّی یتزکّی اور تذکّر یتذکّر" سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم کے صیغے ہیں۔ یہ اصل میں "یتزکّی" اور "یتذکّر" تھے۔ جب باب تفعُّل میں فاء کلمہ ذال یا زاء ہو تو تاء کو بھی زاء یا ذال سے بدل دیتے ہیں اور پھر اسے ساکن کر کے ادغام کر دیتے ہیں۔ مادہ یزّکّی: ز،ک،و، معنی: بڑھانا، ترقی دینا، نیک وصالح ہونا، پاک وصاف ہونا۔ مادہ یذّکر: ذ،ک،ر، معنی: نصیحت حاصل کرنا، یاد کرنا۔

سوال: ﴿اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى﴾ میں "فاء" کون سی ہے؟

جواب: "فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى" میں "فاء سببیه" ہے۔ یعنی شاید نصیحت حاصل کرنے کی وجہ سے اسے نصیحت فائدہ دیتی۔

سوال: "فَتَنْفَعَهُ" میں فعل پر نصب کیوں آئی ہے اور اس فعل کو مؤنث کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: کیونکہ فاء کے بعد "أن" پوشیدہ ہے اس لئے اس پر نصب آئی ہے۔ اگر ترجّی والے جملے کے بعد فاء آئے تو اس فاء کے بعد "أن" محذوف ہوتا ہے۔ چونکہ "الذکری" مصدر ہے اور مصدر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا، اس لئے "تَنْفَعُ" فعل کو مؤنث لایا گیا ہے۔

سوال: ﴿فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ فاء کے بعد موصول حرفی "أن" پوشیدہ ہے۔

سوال: "الذکری" کا صیغہ، معنی اور محل اعراب بتلائیں؟

جواب: ذِکْرٰی: "ذَكَرَ يَذْكُرُ" (ن) سے مصدر بھی ہو سکتا ہے اور "ذَكَّرَ يُذَكِّرُ" سے اسم مصدر بھی بن سکتا ہے۔

معنی: یاد، یادگار، نصیحت، جمع: ذِکْرَیَات۔ مادہ: ذ،ک،ر۔ (انوار، التحریر، قاموس)

"الذکری" "تَنْفَعُ" فعل کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىۤ ○ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: یہاں مجلس نبوی میں حاضر ہونے والے ایک سچے طالب کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں: ایک یہ کہ وہ طالب تزکیہ ہوتا ہے، اس کے سامنے اپنی اصلاح و تربیت سے متعلق کوئی سوال ہوتا ہے اور وہ نبی ﷺ سے اس بارے میں رہنمائی حاصل کرتا ہے "لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى" سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسری صفت یہ کہ وہ نصیحت، یاد دہانی سے فائدہ حاصل کرتا ہے، یعنی اس کے سامنے اگرچہ کوئی خاص سوال نہ ہو لیکن وہ مجلس میں اس لئے حاضر ہوتا ہے کہ نبی ﷺ بذات خود یا کسی سائل کے جواب میں کچھ ارشاد فرمائیں اور وہ اس سے بہرہ مند ہو "یَذَّكَّرُ" سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی﴾ میں "مَن" کون سا ہے اور ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے؟

جواب: ﴿اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی﴾ میں "مَن" اسم موصول ہے اور ترکیب میں مبتدا بن رہا ہے۔

سوال: "تصدّیٰ" کا صیغہ اور معنیٰ بتلائیں؟

جواب: تصدّیٰ: باب تفعُّل "تَصَدّٰی یَتَصَدّٰی تَصَدِّیًا" سے واحد مذکر حاضر مضارع معروف ہے۔ مادہ: ص، د، ی۔ اصل میں "تتصدّیٰ" تھا، ایک تا حذف ہوئی ہے۔ باب تفعُّل میں علامت مضارع کا حذف ایسی صورت میں جائز ہے۔
معنیٰ: توجہ دینا، کسی کام پر لگ جانا، پیچھے پڑنا، درپے ہونا۔ (قاموس)

سوال: ﴿فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی" محل رفع میں ہے کیونکہ "مَنِ استغنیٰ" مبتدا کی خبر ہے۔

سوال: ﴿اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ○ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی﴾ سے کون کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: امام طبری کی روایت کے مطابق جن سرداران قریش نے آپ کی دعوت سے اس وقت اعراض کیا تھا وہ مندرجہ ذیل تھے:

عباس بن عبد المطلب، عتبہ بن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، بعض روایات میں شیبہ، امیہ بن خلف اور اُبی بن خلف کا نام بھی ملتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی﴾ میں "واؤ" کون سی ہے؟ اور پورے جملے کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: اس جملے میں واؤ حالیہ ہے اور یہ پورا جملہ "تصدّٰی" کی "اَنۡتَ" ضمیر سے حال بن رہا ہے۔ (اعراب) یا واؤ اعتراضیہ ہے اور یہ جملہ معترضہ ہے اصل دو جملے ﴿اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی﴾ اور ﴿وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی﴾ ہیں، یہ درمیان میں معترضہ ہے (التحریر)

سوال: ﴿وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: یعنی اگر وہ اپنا تزکیہ نہیں کرتا، راہ راست پر نہیں آتا اور ایمان قبول نہیں کرتا تو اس کا آپ پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ سے اس کا مؤاخذہ کیا جائے گا، آپ کا کام تو انذار و بلاغ ہے اگر یہ محروم القسمت ایمان نہیں لاتے تو ان کو ان کی تقدیر کے حوالے کرو اور آپ اپنے کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالو۔ (التحریر، تدبر)

سوال: ﴿وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی﴾ کی ترکیب کریں اور بتائیں کہ "اَلَّا" اصل میں کیا ہے؟ نیز "یَزَّکّٰی" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ''مَا'' نافیہ، ''عَلَيْكَ'' محذوف کے متعلق ہو کر خبر مقدم، ''اَلَّا يَزَّكّٰى'' جملہ مبتدا موخر۔

اَلَّا اصل میں ''اَنْ لَا'' تھا، اَنْ مصدر یہ ناصبہ اور لَا نافیہ ہے، ادغام کی وجہ سے اَلَّا ہو گیا۔

''يَزَّكّٰى'' کا کوئی محل اعراب نہیں ہے کیونکہ ''اَنْ'' موصول حرفی کا صلہ بن رہا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى﴾ ''يَسْعٰى'' کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: يَسْعٰى: ''جَآءَ'' کی ''هو'' ضمیر سے حال بن رہا ہے۔

سوال: ﴿وَهُوَ يَخْشٰى﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: ''وَهُوَ يَخْشٰى'' ''يَسْعٰى'' کی ''هو'' ضمیر سے حال بن رہا ہے۔

سوال: ''تلهّٰى'' کون سا صیغہ ہے؟ اور ہفت اقسام میں کیا ہے؟

جواب: یہ بھی باب تفعل ''تَلَهّٰى يَتَلَهّٰى تَلَهِّيًا'' سے واحد مذکر حاضر مضارع معلوم ہے اور اسکی ت بھی ''تصدّٰی'' کی طرح گری ہے۔ مادہ: ل، ھ، ی، یا ل، ھ، و۔ ناقص یائی اور واوی دونوں سے آتا ہے۔ معنی: غافل ہونا، ایک چیز سے توجہ ہٹا کر دوسری چیز میں مشغول ہونا۔ (قاموس)

سوال: نبی ﷺ کی رہنمائی کے فوراً بعد قرآن پاک کی صفات بیان کرنے کی کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

جواب: یہاں قرآن پاک کی صفات اس لئے بیان کی گئیں کہ اے نبی ﷺ یہ کتاب بہت رفیع المنزلت اور عظیم المرتبت ہے۔ اس کتاب کی شان یہ ہے کہ اسے ان لوگوں کے لیے پیش کیا جائے جو اس کے ذریعے ہدایت کے طالب ہیں، جب کہ مشرکین مکہ اس کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہیں اس لئے ان کے سامنے بطور وعظ و نصیحت پیش کیا جائے لیکن اگر وہ اعراض کریں تو انکے پیچھے اپنی جان کو نہ کھپایا جائے کیونکہ ایسی بلند پایہ کتاب ناقدروں کے نصیبے میں کہاں؟ (تدبر، المنیر)

سوال: ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾ میں ''ها'' ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

جواب: یا تو اس کا مرجع آیت نمبر ۴ میں لفظ ''ذکری'' ہے یا اس کا مرجع محذوف ہے اور وہ ''آیات القران'' ہیں یا خود ''القران'' ہے۔ (تدبر، فتح القدیر)

سوال: ﴿اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾ میں ضمیر مؤنث اور ﴿شاء ذكره﴾ میں ضمیر مذکر ہے حالانکہ دونوں کا مرجع ایک ہے۔ اس کی وجہ ذکر کریں۔

جواب: ''إنها'' میں ''ها'' ضمیر سے مراد قرآن ہے لیکن چونکہ اس کی خبر مؤنث ہے اس لئے خبر کے اعتبار سے ضمیر بھی

مؤنث لائی گئی ہے۔ جب کہ "ذکرہ" میں "ہ" ضمیر مذکر اس لئے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اگر اس "ہ" ضمیر سے مراد "تذکرۃ" ہو تو پھر اسے مذکر اس لئے لایا گیا کیونکہ "تذکرۃ" بمعنی ذکر اور وعظ ہے۔ (فتح القدیر، رازی، انوار)

سوال: "تذکرۃ" کس باب سے مصدر ہے؟

جواب: "تذکرۃ" باب تفعیل ذَكَّرَ يُذَكِّرُ تَذْكِيرًا سے مصدر ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں ہے کیونکہ اگر فا کو عاطفہ مانا جائے تب بھی اس کا عطف "إنها تذكرة" جملے پر ہو رہا ہے جو کہ جملہ مستانفہ ہے۔ (اعراب)

اور اگر اس کو جملہ معترضہ بنایا جائے تب بھی اس کا کوئی محل اعراب نہ ہوگا۔ (التحریر)

سوال: ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ "ذَكَرَہ" جواب شرط واقع ہونے کے باوجود محل جزم میں کیوں نہیں؟

جواب: کیونکہ اس پر فاء یا إذا فجائیہ داخل نہیں ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ﴾ "صُحُف" جمع کی صفت "مُّكَرَّمَةٍ" واحد مؤنث کیوں لائی گئی؟

جواب: جمع غیر عاقل کی صفت واحد مؤنث بھی لائی جا سکتی ہے۔

سوال: ﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ﴾ کس کے متعلق ہے؟ اور ان سے کون سے صحیفے مراد ہیں؟

جواب: ﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ﴾ ایک محذوف "ثابتة" کے متعلق ہے جو کہ "إنها تذكرة" میں "إنَّ" کی خبر ثانی ہے اور درمیان والا جملہ ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ معترضہ ہے۔

یہ پاک اور متبرک صحیفہ لوح محفوظ ہی کے مختلف اجزاء ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

سوال: "سفرة" اور "بررة" کی واحد بتائیں اور ان کا معنی ذکر کریں۔

جواب: "سفرة" کی واحد "سافرٌ" اور "بررة" کی "بارٌّ" ہے۔ "سفرة" لکھنے والے کو کہتے ہیں اور "بررة" مطیع و فرمانبردار کو۔ یہاں ان سے فرشتے مراد ہیں۔ (رازی)

سوال: ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز بتائیں کہ "قُتِلَ الْاِنْسَانُ" سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: "انسان کا ستیاناس ہو وہ کس قدر ناشکرا ہے"۔ یہاں "الإنسان" سے مراد مطلق کفار ہیں۔ (تفہیم)

سوال: جملہ "ما أكفره" کا محل اعراب کیوں نہیں؟ نیز بتائیں کہ "ما أكفره" کون سا فعل ہے؟

جواب: "ما أكفره" جملہ بیانیہ ہے جس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔ (اعراب) "ما أكفره" فعل تعجب ہے۔

سوال: آیت نمبر ۱۷ سے ۲۲ تک کلام کی یہاں کیا ضرورت تھی؟

جواب: دراصل اللہ تعالیٰ سردارانِ قریش اور منکرین حق کی سرزنش کر رہے ہیں۔ کہ تم تکبر سے دعوت حق جھٹلاتے ہو حالانکہ تمہاری اوقات یہ ہے کہ تم کو حقیر سے نطفے سے پیدا کیا، پھر تمہاری مقررہ زندگی کے بعد تم کو فوت کر کے دفنا دیا گیا، اس کے باوجود تم قرآنی تعلیمات کے منکر ہو۔ (تدبر)

سوال: ﴿قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَآ أَكْفَرَهٗ﴾ یہ خبر ہے یا بددعا؟

جواب: یہاں یہ بددعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سوال: ﴿قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَآ أَكْفَرَهٗ﴾ کی ترکیب کریں۔

جواب: قتل فعل مجہول، الانسان نائب الفاعل، ما نکرہ تامہ (شی کے معنی میں) یا استفہامیہ ہے۔ مبتدا، اكفره ......اكفره فعل با فاعل ہٗ ضمیر مفعول بہ، خبر۔

سوال: ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ "السَّبِيْلَ" کس فعل کا مفعول ہے؟

جواب: "السَّبِيْلَ" کا عامل محذوف ہے اور وہ "يسّر" ہے، کیونکہ مابعد اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اسے نحوی اصطلاح میں "ما أضمر عامله على شريطة التفسير" کہتے ہیں۔

سوال: ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ میں "تیسیر" کا معنی واضح کریں۔

جواب: ﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ میں "تیسیر" کا مفہوم بہت وسیع ہے اور یہ مکمل انسانی زندگی کو محیط ہے۔ بلکہ ماں کے پیٹ میں ایک لوتھڑا بننے سے لے کر انسانی وفات تک ہر چیز کے بارے انسان کو راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ○ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ (الاعلیٰ: ۲، ۳) (تدبر)

﴿ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ﴾ کے تین معانی ہو سکتے ہیں: پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان کر دیا ورنہ ان تنگ ہڈیوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ خیر و شر میں سے جس راستے پر چلنا چاہے وہی آسان کر دیا۔ تیسرا یہ کہ صحیح راستے کی پہچان اس کے لئے آسان کر دی جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے پر ایمان لا سکتا ہے، تینوں معانی درست ہیں مگر ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾ کی مناسبت سے پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ہر انسان طبعاً موت سے خوف محسوس کرتے ہوئے اسے ناپسند کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾

کو بطور نعمت ذکر کیا ہے اس کی وجہ ذکر کریں۔

جواب: حقیقت میں موت بھی انسان کے لئے ایک نعمت کی حیثیت رکھتی ہے اگر انسانوں کو موت ہی نہ آئے تو معاشرہ بوڑھوں، لاچاروں، ضعیفوں اور کمزوروں کا مجموعہ بن کر رہ جائے اور ہر انسان دنیا میں ذلیل ہوتا رہے۔ اسی ذلت سے محفوظ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے موت کو نعمت قرار دیا، ویسے بھی شدید بڑھاپے کو ''أرذل العمر'' کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں موت ایک نعمت سے کم حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح دفنانے کے ذریعے انسان کی تکریم نمایاں ہوتی ہے، وہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور درندوں کی دست برد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس لیے موت اور دفن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کے طور پر بیان کیا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُۥ﴾ ''شاء'' اور ''أنشرہ'' کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: ''شاء'' ''إذا'' کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ جب کہ ''أنشرہ'' جواب شرط غیر جازم ہے اس لئے ''لا محل لها من الإعراب'' ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهُۥ﴾ یہاں ''لمّا'' کیا عمل کر رہا ہے؟ اور ''یقضِ'' پر جزم کیوں نہیں آئی؟

جواب: ''لمّا'' حروف جازمہ میں سے ہے۔ یہاں اس نے ''یقضی'' کو جزم دی ہے اور جزم کی علامت حرف علت کا حذف ہونا ہے۔

سوال: ﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهُۥ﴾ سے کون اور کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهُۥ﴾ سے مراد ''الإنسان'' ہے۔ یعنی سردارانِ قریش کو ہی زجر و توبیخ ہو رہی ہے کہ تم نے ابھی تک اوامر الٰہی کی پیروی نہیں کی اور ان کو ادا نہیں کیا۔ (تدبر، فتح القدیر)

''امر'' سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرہ اور قدرت الٰہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے بھیجا اور ہر دور کے صالحین کے ذریعے سے پھیلایا ہے۔ اس سلسلہ بیان میں یہ بات اس معنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اوپر کی آیات میں بیان ہوئے ہیں، ان کی بنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرماں برداری کرتا، مگر اس نے الٹی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندہ مخلوق ہونے کا جو تقاضا تھا اسے پورا نہ کیا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ﴾ "فَلْيَنْظُرِ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "فَلْيَنْظُرِ" سے مراد غور وفکر کرنا ہے۔ یعنی تم اپنے کھانے پر غور وفکر کرو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو زمین سے پیدا کرتا ہے؟ کیا جو ذات ان کو پیدا کر سکتی ہے اس کے لئے تم کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہے؟ (تدبر)

سوال: جملہ ﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا﴾ یہ جملہ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ﴾ میں "طعامه" سے بدل اشتمال ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ (المنیر، اعراب)

سوال: "شققنا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: شققنا: "شَقَّ يَشُقُّ شَقًّا" (ن) سے جمع متکلم ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ش، ق، ق، مضاعف ثلاثی۔

سوال: ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ کا سلیس ترجمہ کریں اور مفہوم واضح کریں۔

جواب: "پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح یا عجیب طریقے سے پھاڑا"۔

"ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا" سے مراد زمین کو ایسی صلاحیت عطا کرنا ہے کہ انسان زمین میں فقط بیج بوتا ہے، پھر اللہ کی قدرت کاملہ ہی ہے کہ وہ اللہ اس بیج کو ایک تخم سے ایک تناور درخت بناتا ہے۔ جب زمین کو پانی ملتا ہے تو زمین سے یہ بیج ایک ننھے پودے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور آخر کار پیداوار مہیا کرتا ہے۔ انسان نے صرف بیج بویا تھا باقی کام اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی مفہوم کو مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ○ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ○ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا﴾ ان آیات میں کھجور کے علاوہ باقی پھلوں کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ کھجور کے درخت کا ذکر کیا ہے اس کی حکمت واضح کریں۔

جواب: کھجور کے درخت سے صرف پھل حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے کئی فوائد ہیں۔ اس سے مختلف صورتوں میں فائدہ حاصل کیا جاتا ہے مثلاً کچی اور پکی کھجوروں کی صورت میں، اسی طرح کھجور کی گھٹلیوں سے اونٹوں کے لیے چارہ حاصل کیا جاتا ہے، کھجور کے درخت سے نکلنے والا "گوند" کھایا جاتا ہے اور لکڑیوں سے ایک پانی نکلتا ہے جس کو عرب پیتے تھے اسی طرح کھجور کے درخت کی لکڑیاں شہتیر کا کام بھی دیتی ہیں اور ان کے پتوں سے چٹائیاں اور اس کی چھال سے رسیاں بھی بنتی ہیں۔ اس لیے یہاں "نخل" درخت کا لفظ بولا گیا تا کہ وہ ان سب چیزوں کو محیط ہو جائے۔ (التحریر)

سوال: قاعدہ ہے کہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق کیا "عنب، زیتون اور نخل"

"فاکھۃ" سے الگ چیز ہے؟

جواب: قاعدہ یہی ہے کہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے لیکن ہر جگہ عطف مغایرت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اگر یہاں مغایرت کا معنی لیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ "فاکھۃ" بطور تلذذ کھائے جاتے ہیں جب کہ انگور، زیتون اور کھجور بذات خود خوراک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر ان تمام کو "فاکھۃ" کی قسم ہی تصور کیا جائے تب بھی ان میں باہم مغایرت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ تمام ذائقہ، تاثیر اور افادے میں باہم مختلف ہیں۔

سوال: ﴿وَحَدَآئِقَ غُلْبًا﴾ "غلبا" کی واحد اور معنی بتلائیں۔

جواب: یہ "غلباء" کی جمع ہے، اصلاً یہ "موٹی گردن والے" کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں اس سے مراد گھنے باغات ہیں۔ نوٹ: ایسا أَفْعَلُ جس کی مؤنث فَعْلَاءُ ہو اس کی جمع فُعْلٌ کے وزن پر آتی ہے۔

سوال: ﴿وَعِنَبًا وَّقَضْبًا﴾ "قضبًا" کا لغوی معنی ذکر کریں اور بتائیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: "قضبًا" قَضَبَ يَقْضِبُ قَضْبًا (ض) "کاٹنا" سے مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی زمین کی وہ پیداوار جو سال میں کئی مرتبہ کاٹی جاتی ہے، مراد ترکاری ہے، وہ چارے بھی اس میں آجاتے ہیں جو بار بار کاٹے جاتے ہیں۔ (تفسیر القرآن الکریم)

قضبًا: "وہ کچی ترکاریاں اور سبزیاں ہیں جو سالن کے حکم میں ہوتی ہیں"۔ یعنی کچی کھائی جانے والی سبزیاں۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ "أبًّا" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "أبًّا" سے مراد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاں "وہ نباتات ہیں جو انسانوں کے علاوہ چوپائے اور جانور کھاتے ہیں"۔ (طبری) مولانا اصلاحی کے ہاں "أبًّا" سے مراد "وہ سرسبز و شاداب گھاس ہے جو کہ "فاکھۃ" کے مقابلے میں ہو"۔

سوال: ﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ... مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ آیات یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: یہ آیات یہاں لانے کے تین مقاصد ہو سکتے ہیں کہ:

(۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں توحید پر بطور دلائل پیش کی ہیں۔

(۲) یہ نشانیاں پیش کرنے کا مطلب روزِ قیامت کا اثبات ہے۔

(۳) انسان کو اللہ کی اطاعت کی ترغیب دینا ہے کہ ایسا اللہ جو تمہاری غذا کا بندوبست کرتا ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔

سوال: ﴿مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ﴾ میں "متاعا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "متاعا" فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اصل عبارت یوں ہوگی "متعکم بذلك متاعا" (اعراب)

یا یہ پیچھے مذکورہ چیزیں "حبا ونباتا وقضبا .... الخ" سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (التحریر)

سوال: ﴿مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ﴾ "أنعام" کی واحد اور معنی بتلائیں۔

جواب: أنعام، نَعَم کی جمع ہے۔ ''جانوروں پر مشتمل مال و دولت (چوپایا، بطور خاص اونٹ)''۔ (قاموس)

سوال: ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ "الصاخة" کا معنی ومفہوم ذکر کریں اور صیغہ بھی تحریر کریں۔

جواب: "صاخة" سے مراد ''کانوں کو بہرہ کردینے والی کڑک یا چیخ'' ہے۔ اس سے مراد آخری نفخہ ہے جب تمام مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (رازی، تدبر، تفہیم)

صاخة: "صَخَّ يَصُخُّ صَخًّا" (ن) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ص، خ، خ۔ قرآن میں استعمال کی وجہ سے اب یہ نفخہ کے لیے خاص علم بن گیا ہے (التحریر) "ۃ" اس میں مبالغہ کے لیے ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ کا جواب شرط کیا ہے؟

جواب: ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ کا یہ جواب شرط محذوف ہے "يشغل كلٌ بنفسه" (ہر کوئی اپنے آپ میں مشغول ہو جائے گا) (اعراب)

یا اس کا جواب شرط ﴿وجوه يومئذ مسفرة﴾ ہے۔ (التحریر)

سوال: قیامت کے روز انسان اپنے عزیز رشتہ داروں سے کیوں بھاگے گا؟

جواب: اس روز انسان کے اپنے عزیز واقارب سے بھاگنے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں:

(۱) وہ اس لئے بھاگے گا کہ کہیں وہ مجھ سے مدد کا تقاضا نہ کریں۔ میں تو خود نیکیوں کا طالب ہوں۔

(۲) وہ اس لئے بھی بھاگے گا کہ دنیا میں ہم نے مل جل کر گناہ کیے، اب کہیں وہ میرے خلاف گناہوں کی شہادت نہ دیں۔ (تفہیم)

سوال: کیا ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ﴾ میں "یوم" ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ میں "إذا" سے بدل بن سکتا ہے؟

جواب: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ﴾ میں لفظ "یوم" ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ کے "إذا" سے بدل بن رہا ہے اور ظرف کو ظرف سے بدل بنانا جائز ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ﴾ ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ﴾ "الْمَرْءُ اور امْرِئٍ" کے اعراب کی وضاحت کریں۔

جواب: اِمْرُءٌ کے اعراب میں اہل لغت کا اختلاف ہے لیکن قرآنی امثلہ پر غور کرنے سے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ جب اَلْمَرْءُ ہوتو اس وقت اس کا اعراب صرف ہمزہ پر عامل کے مطابق ظاہر ہوگا، میم مفتوح اور راء ساکن ہی رہے گی۔ جیسے: رفعی حالت: ﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ (النبا: ٤٠) یا ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ﴾ (عبس: ٣٤)، نصبی حالت: رَأَيْتُ امْرَءً، جری حالت: ﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾ (البقرۃ: ١٠٢)

اور جب اِمْرُءٌ ہوتو اس وقت اس کا اعراب راء اور ہمزہ دونوں پر عامل کے مطابق ظاہر ہوگا، میم ساکن ہی رہے گی۔ جیسے رفعی حالت: ﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (النساء: ١٧٦)، نصبی حالت: ﴿مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا﴾ (مریم: ٢٨)، جری حالت: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ﴾ (النور: ١١)۔ (لسان، المعجم المفہرس)

سوال: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ میں "یومئذ" کس کا ظرف ہے؟

جواب: "یومئذ" یا تو "یغنیه" کا ظرف (مفعول فیہ) ہے یا "لکل امرئ" سے پہلے جو متعلق خبر محذوف ہے (ثابت) اس کے ظرف ہے۔

فائدہ: جب ظرف مبہم (یوم) إذ کی طرف مضاف ہوتو اس وقت ظرف کا اعراب مبنی ہوتا ہے، مثلاً ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾

سوال: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ میں "شَأْنٌ" سے کون سی حالت مراد ہے؟

جواب: "شأن" سے مراد "ایسی حالت ہے جب ہر نفس کو اپنی اپنی فکر ہوگی"۔ اس بارے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں روایت مذکور ہے کہ: ﴿قال النبی ﷺ إنکم تحشرون یوم القیامة حفاة عراة غرلاً۔ قالت عائشة: الرجال والنساء ینظر بعضهم إلی بعض قال النبی ﷺ: الأمر أعظم من أن ینظر بعضهم إلی بعض﴾ (البخاری: ٦٥٢٧، مسلم: ٢٨٥٩) (ترجمہ: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ تمہیں قیامت کے روز ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنے کے جمع کیا جائے گا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تب مرد و زن ایک دوسرے کے دیکھیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حالت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے کہیں زیادہ سنگین ہوگی)۔

سوال: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ "يُغْنِيْهِ" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: "يُغْنِيْهِ" محل رفع میں ہے کیونکہ "شَاْنٌ" سے صفت بن رہا ہے۔

سوال: "يُغْنِيْهِ" فعل اسم کی صفت کیسے بن گیا؟ حالانکہ موصوف صفت میں مطابقت ضروری ہے۔

جواب: قاعدہ ہے کہ موصوف صفت میں تعریف وتنکیر میں مطابقت ضروری ہے۔ یہاں "شأن" نکرہ ہے اور "یُغْنِیْهِ" جملہ فعلیہ ہے، چونکہ جملہ نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے، اس لئے دونوں میں مطابقت موجود ہے۔

سوال: ﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ﴾ "مُسْفِرَةٌ" کی لغوی وضاحت کریں اور بتائیں یہ کس وجہ سے مرفوع ہے؟

جواب: مُسْفِرَةٌ: اَسْفَرَ یُسْفِرُ سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، معنی: اَسْفَرَ الصُّبحُ: صبح روشن ہونا، اَسْفَرَ الْوَجه: چہرہ چمکنا۔ مادہ: س، ف، ر۔ (قاموس)

"مُسْفِرَةٌ" "وُجُوْهٌ" کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: ﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ میں "وجوہٌ" مبتدا ہیں حالانکہ نکرہ ہیں۔ کیا نکرہ مبتدا بن سکتا ہے؟ اور یہاں پر نکرہ کو مبتدا کیوں بنایا گیا ہے؟

جواب: اصلاً تو مبتدا معرفہ ہونا چاہیے لیکن بعض اوقات نکرہ کو بھی مبتدا بنانا جائز ہے جس کی چند شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ نکرہ میں نوع کا معنی پایا جائے مثلاً "فثوبٌ لبستُ وثوبٌ أجُرُّ" (کچھ کپڑے کو میں نے پہنا اور کچھ کو میں گھسیٹ رہا ہوں، یہ امراء القیس کا شعر ہے) اسی طرح آیت میں ہے ﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ...... وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ (معجم النحو: مبتدا)

سوال: ﴿ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾ کی لغوی وضاحت کریں۔ اور بتائیں یہ مرفوع کیوں ہیں؟

جواب: ضَاحِكَةٌ: ضَحِكَ یَضْحَكُ ضِحْكًا وَ ضُحُوْكًا (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، معنی: ہنسنے والے۔ مادہ: ض، ح، ک۔

مُسْتَبْشِرَةٌ: باب استفعال اِسْتَبْشَرَ یَسْتَبْشِرُ اِسْتِبْشَارًا سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، معنی: خوش ہونے والے، خوشی محسوس کرنے والے۔ مادہ: ب، ش، ر۔ (قاموس)

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ: "وُجُوْهٌ" کی خبر ثانی اور ثالث ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

سوال: ﴿وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ میں "یَوْمَىِٕذٍ" اور "عَلَیْهَا" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿وَوُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ "یَوْمَىِٕذٍ" "غَبَرَةٌ" کا ظرف ہے یا "غَبَرَةٌ" سے قبل "ثابتة" محذوف کا ظرف ہے۔ جب کہ "عَلَیْهَا" "غَبَرَةٌ" کے متعلق ہے۔ جب کہ صاحب اعراب القرآن کے ہاں "عَلَیْهَا" کسی محذوف سے متعلق ہوکر "غَبَرَةٌ" کی خبر مقدم ہے۔

سوال: ﴿تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ "تَرْهَقُهَا" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: تَرْهَقُ: رَهِقَ يَرْهَقُ رَهَقًا (ع) سے واحد مؤنث غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: ر، ھ، ق۔ معنی: چھا جانا ، غالب ہونا، لاحق ہونا، نرغہ میں لے لینا۔ (قاموس، التحریر)

سوال: "غَبَرَةٌ" اور "قترۃ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "غَبَرَةٌ" سے گرد وغبار اور "قَتَرَة" سے دخان کی طرح سیاہی مراد ہے۔ جب کسی چہرے پر یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو اس سے زیادہ وحشت ناک کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ (رازی)

سوال: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ میں "هم" ضمیر کیا واقع ہو رہی ہے؟

جواب: یہاں "هم" ضمیر فصل ہے جو کہ تاکید کے لیے آئی ہے۔ اور خبر بھی معرف باللام ہے جو حصر کے افادہ کے لئے ہے، ترجمہ یوں ہوگا: وہی لوگ کافر اور فاجر ہی تو ہیں۔

سوال: "كَفَرَةٌ" اور "فجرة" کی واحد ذکر کریں۔

جواب: "كَفَرَةٌ" کی واحد "كافِر" ہے اور "فجرة" کی واحد "فاجر" ہے۔ امام زجاج کے ہاں جو بھی جمع "فَعَلَةٌ" کے وزن پر ہوگی اس کی واحد "فاعِل" کے وزن پر ہوگی۔

سوال: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ کیا ایک مبتدا کی ایک سے زائد خبریں لانا جائز ہے؟

جواب: ایک مبتدا کی ایک سے زائد خبریں لفظاً ومعنیً دونوں طرح لانا جائز ہے۔ اس کی امثلہ قرآن حکیم میں بھی موجود ہیں مثلاً ﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ○ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ○فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ (البروج: ۱۴، ۱۵، ۱۶) (معجم النحو، خبر المبتدا)

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۞ وَإِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۞ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۞ وَإِذَا
الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۞ وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۞ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۞ وَإِذَا النُّفُوْسُ
زُوِّجَتْ ۞ وَإِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۞ بِأَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۞ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۞
وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۞ وَإِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۞ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۞ عَلِمَتْ
نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ۞ فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۞ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۞ وَالَّيْلِ إِذَا
عَسْعَسَ ۞ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۞ إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۞ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي
الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۞ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ ۞ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۞ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ
الْمُبِيْنِ ۞ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۞ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۞ فَأَيْنَ
تَذْهَبُوْنَ ۞ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ أَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۞ وَمَا
تَشَآءُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

سوال: اس سورت کی پچھلی سورت سے مناسبت اور اس کا موضوع و مضمون ذکر کریں۔

جواب: پچھلی دو سورتوں میں آثارِ قیامت کا مختصر تذکرہ ہے اور "طامة" اور "صاخة" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جب کہ اس سورت میں آثارِ قیامت کا مفصل تذکرہ ہے۔ (المنیر، تفہیم)

اس سورت کا موضوع و مضمون احوالِ قیامت کا مفصل بیان ہے کہ اس روز کی کیا کیا علامات ہیں؟ پھر اس قرآن اور صاحب قرآن کی رفعت کا تذکرہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جبرائیل علیہ السلام کی فضیلت اور شان کا بیان ہوا ہے۔ آخر میں بتایا گیا جو قرآن افضل الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت پر جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے نازل کیا گیا تم اس سے کیونکر اعراض کر رہے ہو؟

سوال: "إذا" ظرفیہ شرطیہ صرف فعل پر داخل ہوتا ہے۔ پہلی ۱۳ آیات میں یہ اسماء پر داخل ہوا ہے۔ تو اس کی کیا تاویل

کریں گے؟

جواب: یہ دراصل "الشَّمْسُ" وغیرہ پر داخل نہیں بلکہ "إذا" کے بعد فعل محذوف مانیں گے یعنی "إذا کوّرت الشمس" (کشاف)

سوال: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ "الشَّمْسُ" کے مرفوع ہونے کی وجہ لکھیں۔

جواب: "الشَّمْسُ" محذوف فعل (كُوِّرَتْ) کا نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ "إِذَا" ظرفیہ شرطیہ کس فعل سے متعلق ہوگا؟

جواب: "إِذَا" جواب شرط "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ" کے متعلق ہوگا۔

سوال: "کوّرت" اور "انکدرت" کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: "کورت" سے مراد لپیٹ دینا اور باندھنا ہے یعنی سورج کی بساط لپیٹ دینا مراد ہے، اصلاً سر پر عمامہ باندھنے کے لیے تکویر العمامۃ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا تھا اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے سورج کی روشنی کو عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ "انکدرت" سے مراد بکھرنا، تاریک ہونا، ماند پڑنا اور دھندلا ہوجانا ہے یہاں مراد ستاروں کا بے نور ہونا ہے۔

سوال: ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: اوپر کی آیات میں آسمان پر ہونے والے تغیر اور ہولنا کی کا ذکر ہے، اس آیت میں زمین پر ہونے والی سب سے بڑی ہولنا کی کا ذکر ہے۔ زمین پر سب سے بڑی اور بلند چیز پہاڑ ہیں، جس قدر یہ بلند ہیں اس سے دس گناہ زیادہ یہ زمین میں گڑھے ہوئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قیامت ان فلک بوس اور زمینی میخوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟۔ اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو بھی رفع کر دیا کہ پہاڑ صرف اکھاڑے نہیں جائیں گے بلکہ چلائے جائیں گے، چلائے بھی نہیں اڑائے جائیں گے جس طرح دھنی ہوئی اون بے رخ ہوا میں اڑتی ہے۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: "العِشار" اور "الوحوش" کی واحد ذکر کریں اور ان کی لغوی وضاحت بھی کریں۔

جواب: "عشار" "عُشَرَاءُ" کی جمع ہے، دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو عرب کے ہاں نہایت مرغوب اور عزیز ہوتی تھیں اور "وحوش" "وَحْشٌ" کی جمع ہے، وحشی جنگلی جانور جو ایک دوسرے سے خوف کھاتے ہوئے بھاگتے ہیں اس گھبراہٹ میں جمع ہوجائیں گے۔ (تدبر، تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: اس آیت میں قیامت کی وحشت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنی محبوب ترین چیزوں کو نظر انداز کر دے گا، اور جو لوگ انکی مکمل نگہداشت کرتے تھے وہ ان سے بالکل غافل اور بے پرواہ ہو جائیں گے۔ اس کی مثال دس ماہ کی گابن اونٹنی سے دی گئی ہے، کیونکہ یہ عرب لوگوں کے ہاں سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہوتا ہے، انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی جانور قریب الولادۃ ہوتا ہے تو اسکا مالک اس کا مسلسل خیال کرتا ہے، اس کو ہر طرح کے نقصان سے بچاتا ہے، کیونکہ اس کے مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا انحصار اس پر ہوتا ہے۔ اس آیت کو عرب لوگوں کے تناظر میں سمجھنے کی بجائے انسانی فطرت کی محبوب ترین چیزوں کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ یہ فطرت تمام انسانوں میں یکسا پائی جاتی ہے اور تمام جانوروں کے متعلق پائی جاتی ہے، اونٹ کا ذکر بطور مثال ہے۔

سوال: ﴿وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: اس آیت میں یہ بیان کی گیا ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کے وقت جانوروں کی کیا حالت ہوگی۔ قیامت کی ہولناکی سے سب جانور وحشت اور خوف سے آپس کی دشمنیاں بھول جائیں گے۔ جنگل میں جب کوئی سیلاب یا کوئی مصیبت آتی ہے تو سب جانور کس ٹیلے پر پناہ لیتے ہیں اور اس ٹیلے پر کوئی جانور بھی مصیبت کے خوف کی وجہ سے اپنے شکار کو کچھ نہیں کہتا، سانپ کسی کو ڈستا ہے اور نہ ہی شیر اپنے شکار پر حملہ کرتا ہے اور کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا کہ اس کا شکار اس کی بغل میں ہے۔ اسی منظر کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ﴾ "سُجِّرَتۡ" کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: "سُجِّرَتۡ" تسجیر سے ہے اس کا معنی تنور کو ایندھن سے بھر کے آگ بھڑکانا ہے۔ اسی سے یہ لفظ سمندر کے لیے استعمال ہوا ہے کہ جب قیامت بپا ہوگی اس روز سمندروں کو آگ کے ذریعے بھڑکایا جائے گا۔ خالق کائنات کے لیے پانی کو آگ میں بدلنا ناممکن نہیں۔ اگر پانی کی حقیقت پیش نگاہ ہو تو اس میں کوئی تعجب نہیں رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم معجزہ ہے۔ پانی دو گیسوں آکسیجن اور ہائیڈروجن کے باہم ملنے سے بنتا ہے۔ ان میں سے ایک بھڑکنے والی اور دوسری آگ بھڑکانے والی ہے۔ ان دونوں مادوں سے اللہ تعالیٰ نے آگ بجھانے والا مادہ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل امر نہیں کہ ان دونوں گیسوں کو الگ کر دے اور کیمیائی ترکیب الٹ ہو جائے۔ تو جو مادہ آگ بجھانے کے کام آتا تھا وہی مادہ آگ جلانے اور بھڑکانے کے کام آئے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: اس آیت سے مراد نیک لوگوں کو نیکوں کے ساتھ اور بروں کو بروں کے ساتھ ملانا ہے کیونکہ آخر کار یہی جزا ہوگی۔ جس طرح سورۃ الواقعہ میں ﴿وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ (الواقعۃ: ۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام طبری نے مختلف اسناد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی معنی بیان کیا ہے۔ (طبری)

اس کا دوسرا معنی بھی لیا جا سکتا ہے۔ یعنی "وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ" جب روحیں جسموں سے جوڑ دی جائیں گی یعنی از سرنو اسی طرح زندہ ہوں گی جس طرح دنیا میں وہ روح جسم کے ساتھ زندہ تھی۔ (تفہیم)

سوال: "الموؤدۃ" کیا صیغہ ہے؟ کیا اس کے باب میں قلب ہوا ہے؟

جواب: الموؤدۃ: وَأَدَ يَئِدُ وَأْدًا (ض) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ مادہ: و، أ، د۔ ہفت اقسام میں مثال واوی اور مہموز العین ہے۔ اس میں کوئی قلب نہیں ہوا کیونکہ اس کی اصل "وأد" ہے۔ جس طرح حدیث میں ہے: "**إن الله حرم عليكم عقوق الأمهات و وأد البنات**" (مسلم: ۴۴۸۳) (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ دفنانے کو حرام ٹھہرایا ہے) (إعراب، رازی)

سوال: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ درگور کی جانے والی جان سے سوال کیوں کیا جائے گا حالانکہ سوال تو درگور کرنے والے سے ہونا چاہئے؟

جواب: اس آیت کے انداز بیان میں ایسی غضب ناکی پائی جاتی ہے کہ جس سے زیادہ سخت غضب ناکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی یا بیٹے کو زندہ گاڑنے والے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم جان کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم جان سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس تصور میں ماری گئی؟۔ وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالموں نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے دفن کر دیا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ اجڈ عرب بے قصور اولاد (بچوں اور بچیوں) کو زندہ دفن کیوں کرتے تھے؟

جواب: ۱: معاشی بدحالی کی وجہ سے تا کہ کھانے والے زیادہ نہ ہوں۔ اور اولاد کو پالنے پوسنے کا باران پر نہ پڑے۔

۲: بیٹیوں کو اس غرض سے زندہ گاڑ دیا جاتا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر ان کو بیاہنا پڑے گا۔

۳: عام بدامنی کے سبب قبائلی جنگوں میں ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی بعض دفعہ وہ شب خون مارتے اور خون بہاتے اور

خواتین کو اٹھا لیتے۔ان کو لونڈیاں رکھتے یا آگے فروخت کرتے۔(تفہیم)

سوال: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ سب سے پہلے یہ (زندہ درگور کرنے کا) قبیح فعل کس نے انجام دیا؟

جواب: ایک قول کے مطابق اس درندگی کا موجد ربیعہ ہے۔کندہ بھی اس فعل قبیح سے اپنے دامن کو گندا کرتے رہے اور بنو تمیم بھی اپنے دامن کو اس سے نہ بچا سکے۔قیس بن عاصم المنقری تمیمی نے شرف صحابیت سے ممتاز ہونے سے قبل اپنے ہاتھوں سے اپنی آٹھ کلیوں جیسی بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔اور کئی لوگوں کا اس درندگی سے دل دکھتا تھا وہ اپنی جیب خاص سے فدیہ دیکر ان معصوموں کی جان بخشی کراتے۔مشہور عربی شاعر الفرزدق کے جدامجد صعصعۃ بن ناجیۃ نے تین سو ساٹھ نومولود بچیوں کا فدیہ دے کر نئی زندگی دلوائی تھی۔(التحریر)

سوال: ﴿بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: "بِاَیِّ ذَنْۢبٍ" "قُتِلَتْ" کے متعلق ہے۔اور یہ جملہ "سُئِلَتْ" کا بیان اور تفسیر ہے اس لئے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔صاحب اعراب کے ہاں یہ "سُئِلَتْ" کا مفعول بہ (بتقدیر عن یعنی منصوب بنزع الخافض) ہے۔

سوال: ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ "كُشِطَتْ" کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: "كُشِطَتْ" کشط سے ہے۔اس کا معنی کسی چیز کے اوپر سے وہ چیز اتار لینا جو اس کی حفاظت کر رہی ہے۔اسی لئے کھال اتارنے کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔آیت میں یہ معنی ہے کہ اس روز آسمان کو ادھیڑ کر کھینچ لیا جائے گا اور پیچھے خالی فضا رہ جائے گی۔(تدبر، الثمین)

سوال: پہلی ۱۳ آیات میں شرط پائی جاتی ہے اس کا جواب شرط کیا ہے؟ نیز جملہ ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ کا محل اعراب بیان کریں۔

جواب: پہلی تیرہ آیات کا جوابِ شرط ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ جملہ ہے۔اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جواب شرط غیر جازم ہے۔

سوال: پہلی چھ آیات کا تعلق کس وقت سے ہے؟ اور اگلی آٹھ آیات کا تعلق کس وقت سے ہے؟

جواب: پہلی چھ آیات میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو ظہور قیامت کے وقت پیش آئیں گے اور اس سے اگلی آٹھ آیات میں ان احوال کا بیان ہے جو کہ ظہور قیامت کے بعد پیش آئیں گے۔(رازی، المنیر)

سوال: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ﴾ فعل قسم پر "لا" (النافیہ) کیوں لایا جاتا ہے؟

جواب: فعل قسم پر لائے نفی قسم کی نفی کے لئے نہیں، بلکہ مخاطب کے اس زعم کی نفی کے لیے ہے جس کی تردید کرنا اس قسم سے مقصود ہوتا ہے۔ اس جگہ "لا" اس لئے لائے تاکہ ان لوگوں کی نفی ہو جو کہ قرآن کو اللہ کا کلام ماننے کی بجائے کاہن یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام قرار دیتے ہیں۔ (تدبر)

ایک قول کے مطابق لائے نفی قسم میں مزید تاکید پیدا کرنے کے لئے لائی جاتی ہے۔ (معجم النحو، انوار)

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد لکھیں اور ان کے معانی بھی لکھیں۔

الخنس، الکنس اور الجوار۔

جواب: الخنس کی واحد خانِسٌ اور الکنس کی کانِسٌ اور الجوار کی جاریۃٌ ہے۔ خانِسُ آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنے والی، ظاہر ہو کر چھپنے والی چیز کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد ستارے ہیں۔ اور جَوار سے مراد چلنے والے ستارے ہیں جب کہ کانِسٌ سے حفاظت گاہ میں چھپنا مراد ہے، ہرن کی پناہ گاہ کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس سے بھی ستارے مراد ہیں جو اپنے مدار میں چھپ جاتے ہیں۔ (تدبر، رازی)

سوال: ﴿وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾ "عَسْعَسَ" فعل کی خصوصیت ہے کہ یہ الفاظِ اضداد میں سے ہے۔ اس کے دونوں متضاد معنی ذکر کریں۔

جواب: "عَسْعَسَ" کا ایک معنی "أَقْبَلَ" (آنا) اور دوسرا معنی "أدبر" (جانا) ہے۔ یہاں بھی دونوں معانی مقصود ہو سکتے ہیں۔ اگر سورۃ مدثر میں دیکھیں تو وہاں ہے ﴿وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ○وَالصُّبْحِ إِذَآ أَسْفَرَ﴾ (المدثر ۳۳، ۳۴) (ترجمہ: قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے، قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو) اس لئے یہاں بھی "أدبر" کا معنی زیادہ مناسب ہے۔ (تدبر)

جب کہ امام ابن کثیر کے ہاں "أقبل" کا معنی مراد لیں گے تو رات کا چھانا مراد ہوگا۔ اس کی تائید بھی دوسری آیات سے ہوتی ہے۔ ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى○وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى﴾ (اللیل: ۱، ۲) (ترجمہ: قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لے، قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو) اسی طرح ﴿وَالَّيْلِ إِذَا سَجٰى﴾ (الضحیٰ: ۲) (قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے) (ابن کثیر)

سوال: ﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ○الْجَوَارِ الْكُنَّسِ○وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ○وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ﴾ میں قسمیں اٹھانے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: ان آیات میں قسمیں اٹھانے کا مقصد ان لوگوں کی تردید ہے جو قرآن کو کاہن کا کلام کہتے تھے۔ دراصل کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی: ایک ستاروں کے مؤثر بالذات ہونے پر، دوسرا یہ کہ آسمان کے اندر ٹھکانے ہیں جہاں بیٹھ کر

جنات غیب کی باتیں سنتے ہیں اور پھر کاہنوں کے دل و دماغ میں ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ "خُنَّس، الجوار، الکنّس" کی قسم کھا کر اس بات کا اثبات کر رہے ہیں کہ یہ ستارے وغیرہ طلوع وغروب میں ایک مقررہ نظام کے پابند ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ستارے وغیرہ خود کسی ذات کے تحت ہیں۔ پھر یہ مؤثر بالذات کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر یہ مؤثر بالذات نہیں ہیں تو پھر کاہن ایسا عظیم کلام کہاں سے لا سکتے ہیں؟ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ یہ کلام عظیم فرشتے کے ذریعے رسول ﷺ پر نازل ہوا۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ﴾ کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: اس سے مقصود تو صبح کا نمودار ہونا ہے لیکن اس استعارے میں ایک خاص بلاغت پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ گویا تاثر دے رہا ہے کہ صبح رات کے بوجھ تلے اس طرح دبی ہوئی تھی کہ اس کا دم گھٹ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر سے اس کے بوجھل لحاف کو سرکا دیا اور اس کو سانس لینے اور سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوا۔ (تدبر)

سوال: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ میں "رَسُولٍ كَرِيمٍ" سے کون مراد ہے؟ نیز بتائیں کیا قرآن پاک جبرائیل علیہ السلام کا کلام ہے؟ اگر نہیں تو آیت میں "لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ" کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: آیت میں "رَسُولٍ كَرِيمٍ" سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ (رازی، تدبر، المنیر، الثمین)

قرآن کو رسول کا قول کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اس فرشتے کا اپنا کلام ہے، بلکہ "لَقَوْلُ رَسُولٍ" کے الفاظ خود ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ اس ہستی کا کلام ہے جس نے اسے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ سورۃ الحاقۃ آیت نمبر ۴۰ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ میں اسی طرح قرآن کو محمد ﷺ کا قول کہا گیا ہے، اور وہاں بھی یہ مراد نہیں کہ یہ حضور کا اپنا تصنیف کردہ ہے بلکہ اسے "رَسُولٍ كَرِيمٍ" کا قول کہہ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس چیز کو حضور ﷺ اللہ کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے۔ دونوں جگہ قول کو فرشتے اور محمد ﷺ کی طرف منسوب اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغام محمد ﷺ کے سامنے پیغام لانے والے فرشتے کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾ "مَكِينٍ" ترجمہ اور صیغہ ذکر کریں۔

جواب: "مَكِينٍ" مَكُنَ يَمْكُنُ مَكَانَةً (ش) سے فعیل کے وزن پر واحد مذکر صفت مشبہ ہے۔ مادہ: م، ک، ن۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کسی کا کسی کے ہاں بلند مرتبہ ہونا۔ جس طرح سورۃ یوسف میں ہے ﴿فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا

﴿مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ﴾(یوسف:۵۴)(پھر جب اس نے ان سے بات کی تو کہا کہ بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار امانتدار ہے)(التحریر)

سوال: مندرجہ ذیل کا اعراب اور وجہ اعراب بتلائیں۔

ذِی قوۃٍ، مکینٍ، مطاعٍ، أمینٍ۔

جواب: "ذِی قوۃٍ، مکینٍ، مطاعٍ، أمینٍ" یہ چاروں الفاظ لفظ "رسول" کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہیں۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور معانی بتائیں۔

مطاعٍ، أمین، مبین، ضنین، تشاءون۔

جواب: مطاع: باب افعال "أَطَاعَ يُطِيْعُ اِطَاعَةً" سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔ مادہ: ط، و، ع۔ اصل میں "مُطْوَعٌ" تھا۔

أمین: أَمِنَ يَأْمَنُ أَمْنًا (ع) سے واحد مذکر صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ء، م، ن۔

مبین: باب افعال "اَبَانَ يُبِيْنُ اِبَانَةً" سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ب، ی، ن۔

ضنین: ضَنَّ يَضَنُّ ضَنًّا وَضَنَانَةً (ع) سے واحد مذکر صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ض، ن، ن۔

تشاؤون: "شَآءَ يَشَآءُ شَيْئًا" (ع) سے جمع مذکر حاضر مضارع معلوم ہے۔ اصل میں "تَشْيَؤُوْنَ" تھا۔ آگے تعلیل واضح ہے۔ مادہ: ش، ی، ء۔

نوٹ: مضاعف سے باب فَتَحَ نہیں آتا اور نہ ہی اس فعل سے جس کے ماضی اور مضارع کے عین کلمہ میں الف ہو۔

سوال: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ "صَاحِبُكُمْ" سے کون مراد ہے؟ اور "صَاحِبُكُمْ" کیوں کہا گیا؟

جواب: "صَاحِبُكُمْ" سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آیت میں "صَاحِبُكُمْ" کہنے میں ایک لطیف بلاغت وحکمت ہے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری زندگی مکہ کے لوگوں کے ساتھ رہے تھے اس لئے ان کو ایک لطیف اشارہ ہے کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تمہارے ساتھ رہا، تم اس کی عادات حسنہ اور اخلاق عالیہ سے واقف ہو، پھر کیوں اسے مجنون قرار دے رہے ہو؟ (انوار)

سوال: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾ "رَاٰهُ" فاعل اور مفعول کی ضمیر کا مرجع کون سا ہے؟

جواب: رَاٰهُ: فاعل کی ضمیر کا مرجع "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" اور مفعول کی ضمیر کا مرجع "جبرائیل علیہ السلام" ہیں۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا۔

سوال: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ "الْاُفُقِ الْمُبِیْنِ" کی وضاحت کریں۔

جواب: الْاُفُقِ الْمُبِیْنِ سے مراد فضائے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے بالکل سامنے ہے، جس کا مشاہدہ بغیر کسی اشتباہ کے ہوتا ہے۔ سورۃ النجم میں اس کو افق اعلی سے تعبیر کیا ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ﴾ "بِضَنِیْنٍ" کی اعرابی حالت بتائیں۔

جواب: "بِضَنِیْنٍ" لفظاً مجرور ہے اور محلاً مَا کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ﴾ "ضنین" کا معنی ذکر کرتے ہوئے بتائیں اس آیت سے کیا مراد ہے؟

جواب: "ضنین" سے مراد بخیل ہے۔ (کشاف) صاحب تدبر قرآن کے ہاں اس کا معنی حریص کرنا زیادہ راجح ہے۔ ان کے ہاں جب "ضنّ" کا صلہ علی ہو تو حرص کرنا مراد ہوتا ہے اور جب باء ہو تو بخل کرنا لیکن ان کے اس قول کی ہمیں کوئی دلیل نہیں مل سکی۔ واللہ اعلم (تدبر)

آیت میں "ضنین" سے مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے علم کے بارے بخیل نہیں ہیں۔ بلکہ وحی کی ہر تعلیم بلا کم و کاست امت تک پہنچا دیتے ہیں کیونکہ ان کا یہ فرض منصبی ہے ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدہ: ٦٧) (ترجمہ: جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اس کو آگے پہنچا دو) (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ﴾ کا معطوف علیہ کون سا ہے؟ اور "هُوَ" کا مرجع ذکر کریں اور بتائیں کہ "بِقَوْلِ" میں باء کس معنی میں ہے؟

جواب: اس جملہ کا معطوف علیہ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ﴾ ہے اور "هُوَ" کا مرجع "قرآن" ہے۔ (التحریر) یہاں باء زائدہ ہے۔

سوال: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ﴾ "شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: شَیْطٰنٍ: شَاطَ یَشِیْطُ (ض) سے فعلان کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔ معنی: جلنے کے قریب ہونا، ہلاک ہونا، اَشَاطَ ہلاک کرنا۔ مادہ: ش، ی، ط۔ یا یہ شَطَّ یَشِطُّ (ض، ن) سے صفت مشبہ ہے۔ معنی: دور ہونا، حد سے تجاوز کرنا۔ یا یہ شَطَنَ یَشْطُنُ (ن) سے فیعال کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔ معنی: دور ہونا، یعنی: بَعُدَ عَنِ الْخَیْرِ اَوْ عَنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔ مادہ: ش، ط، ن۔ (اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم لابن خالویہ، قاموس، فتح القدیر: سورۃ البقرۃ: آیت نمبر: ١٥)

رَجِیْمٍ: رَجَمَ یَرْجُمُ (ن) سے فعیل کے وزن پر صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول ہے۔ معنی: لعنت بھیجنا، دھتکارنا، یعنی: ملعون،

راندہ درگاہ، دھتکار کر نکالا ہوا۔ (قاموس)

سوال: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ "ذِكْرٌ" مرفوع کیوں ہے اور یہاں کس معنی میں ہے؟

جواب: ذِكْرٌ: "هُوَ" مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اِنْ نافیہ اور اِلَّا حصر کے لئے ہے۔ یہاں "ذِكْرٌ" تذکیر کے معنی میں ہے یعنی "لوگوں کو اچھے اعمال کا وعظ اور برے اعمال سے روکنے والا ہے"۔ (اعراب، التحریر)

سوال: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ "لِلْعٰلَمِيْنَ" سے بدل ہونے کی وجہ سے "ذِكْرٌ" کے متعلق ہو کر هُوَ کی خبر ہے۔

سوال: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ "للعلمين" سے بدل ہے، بتائیں یہ بدل کی کون سی قسم ہے؟

جواب: یہ آیت "للعلمين" سے بدل البعض ہے۔

سوال: کیا مفرد سے جملہ کو بدل بنانا جائز ہے؟

جواب: مفرد سے جملہ کو بدل بنانا جائز ہے جس طرح کہ "للعلمين" سے "لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ" کو بدل بنایا گیا۔ اسی طرح ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (الغاشیۃ: ۱۷) میں إبل سے جملہ "كيف خلقت" کو بدل بنایا گیا ہے۔ (معجم النحو)

سوال: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ "اَنْ يَّسْتَقِيْمَ" کا محل اعراب بیان کریں۔

جواب: "اَنْ يَّسْتَقِيْمَ" مفعول بہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ میں "مِنْكُمْ" کس کے متعلق ہے؟

جواب: "لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ" میں "مِنْكُمْ" ایک محذوف کائناً کے متعلق ہو کر شآء کی ھو ضمیر سے حال بن رہا ہے۔

سوال: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ لفظ "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" لفظ اللہ سے صفت بننے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: آیت ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے مطابق بندے کا ارادہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ بندہ مجبور محض ہے۔

جواب: انسان کسی بھی اعتبار سے مجبور محض نہیں بلکہ با اختیار ہے۔ ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾

(الدھر: ۳) (ہم ہی نے اس کو راستہ بتایا خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا) البتہ یہ ضرور ہے کہ انسان کا ہر فعل اللہ کی مشیئت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ کی مشیئت ہوتی ہے، پھر ہم فعل سرانجام دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ جب اللہ کی مشیئت ہی یہ ہے کہ میں گناہ کروں تو پھر انسان کا مواخذہ کیوں ہوگا؟

یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ کوئی بھی فعل کرنے سے پہلے ہمارے علم میں نہیں ہوتا کہ اللہ کی اس فعل کے بارے میں کیا مشیئت ہے؟ بلکہ ہم بااختیار ہوتے ہیں کہ فلاں فعل کریں یا نہ کریں۔ جب ہمیں اللہ کی مشیئت ہی معلوم نہیں ہوتی تو اعتراض کس بات پر ہے؟

ویسے بھی اللہ أرحم الراحمین سے یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بندے کے بارے براسوچے اور اسے گناہ گاروں میں شامل کردے۔ حالانکہ وہ انسان کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ اس لئے درست بات یہی ہے کہ برائی اور بھلائی کے فعل میں انسان کو کلی اختیار حاصل ہوتا ہے اور یہ ہماری روزمرہ زندگی کا مشاہدہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کی بھلائی ہی چاہتے ہیں مگر جب وہ برائی کی جانب دوڑے تو اللہ اس طرف کے راستے آسان کر دیتے ہیں ﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ﴾ (اللیل: ۱۰) (اور اس کو ہم سخت راستے کے لئے سہولت دیں گے) واللہ اعلم (التفسیر الثمین)

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَاِذَا
الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿٥﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ
بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿٦﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾
كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿٩﴾ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا
تَفْعَلُوْنَ ﴿١٢﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿١٣﴾ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿١٤﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ
الدِّيْنِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿١٦﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا
يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

سوال: سورۃ الانفطار کی پچھلی سورت سے مطابقت ذکر کریں۔

جواب: ان دونوں سورتوں میں قیامت، اس کے احوال اور اس کی ہولناکیوں کا تذکرہ ہے۔ سورۃ التکویر میں روزِ قیامت کے ظہور پر بطور استدلال قرآن کے منبع، اس کے نزول کے واسطہ اور حامل قرآن کی بزرگی وعصمت کو پیش کیا گیا ہے جب کہ اس سورت میں بطور استدلال اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، صفت تخلیق، رحمت اور عدل کو پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال موضوع دونوں کا یکساں ہے۔ (تدبر، المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون خلاصۃً ذکر کریں۔

جواب: اس سورت کا موضوع روزِ قیامت کے احوال ہیں اور انسان کو اس دن کے حساب دینے کے لیے تیار کرنا ہے۔ سب سے پہلے قیامت کے احوال کا بیان اور انسانی اعمال کی پیشی کا تذکرہ ہے۔ پھر انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس رب نے تجھے بہترین مخلوق بنایا، تجھے اس کے بارے کس نے غلط فہمی میں ڈال رکھا ہے کہ وہ صرف سراپا کرم ہے روزِ قیامت گناہ گاروں سے پوچھ گچھ نہیں کرے گا؟ اس نے تو انصاف کی خاطر تمہارے اعمال کی کتابت کے لیے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس لئے اس دن کے لئے تیاری کر رکھو جس روز نیک و بد کو اپنے اعمال کا صلہ مل جائے گا اور کوئی ایک

دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ (تفہیم، المنیر)

سوال: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ "السَّمَآءُ" کس فعل کی وجہ سے مرفوع ہے؟

جواب: "السَّمَآءُ" ایک فعل محذوف "انْفَطَرَتْ" کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ چونکہ اذا ظرفیہ شرطیہ اسم پر نہیں بلکہ فعل پر داخل ہوتا ہے اس لئے فعل کو محذوف ماننا پڑا۔ (المنیر)

سوال: مندرجہ ذیل کی لغوی وضاحت کریں۔

انفطرت، انتثرت، فجرت، بُعْثِرت۔

جواب: انفطرت: باب انفعال اِنْفَطَرَ یَنْفَطِرُ اِنْفِطَارًا سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ یہ فطر سے ہے جس کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ "انفطرت" کا معنی فلاں چیز پھٹ گئی، شق ہوگئی۔ مادہ: ف، ط، ر۔

انتثرت: باب افتعال اِنْتَثَرَ یَنْتَثِرُ اِنْتِثَارًا سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ یہ اصل نثر سے ہے جس کے معنی جھڑنے، بکھرنے، پھیلنے کے ہیں۔ انتثرت کا معنی فلاں چیز بکھر گئی، منتشر ہوگئی۔ مادہ: ن، ث، ر۔

فجرت: باب تفعیل فَجَّرَ یُفَجِّرُ تَفْجِیْرًا سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ یہ اصل فجر سے ہے جو مختلف صلوں کے ساتھ مختلف معانی ادا کرتا ہے، باب تفعیل میں اس کا معنی ہے: آگ والی چیز کا دھماکہ کرنا۔ تفجیر: دھماکہ خیزی، پانی یا نہر جاری کرنے کا عمل۔ التفجیر الذری ایٹمی دھماکے کو کہتے ہیں۔

بُعْثِرت: رباعی مجرد بَعْثَرَ یُبَعْثِرُ بَعْثَرَةً سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ معنی: بکھرنا، پھیلنا، سامان کو الٹ پلٹ کرنا، چھپی ہوئی چیز کو برآمد کرنا۔ بعثر الشئی کا معنی چیز کو ادھیڑ دیا جائے، اسے کھول کر اس کے اندر موجود چیز کو نکال لیا جائے۔ صاحب کشاف کہ ہاں یہ بَعَثَ سے ہے اور راء اس کے ساتھ ملا دی گئی ہے۔ یعنی یہ بعث اور راء سے مرکب ہے۔ صاحب التحریر نے علامہ سہیلی اور بیضاوی کے کلام سے اس کے مؤیدات بھی نقل کی ہیں۔ مادہ: ب، ع، ث۔ (تدبر، قاموس)

سوال: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جملہ "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جواب شرط غیر جازم ہے۔

سوال: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ میں "عَلِمَتْ" کو مؤنث کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: نَفْسٌ کے مؤنث سماعی ہونے کی وجہ سے عَلِمَتْ صیغہ مؤنث ذکر کیا گیا ہے۔

سوال: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ "قَدَّمَتْ" کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "قَدَّمَتْ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ "مَا" اسم موصول کا صلہ ہے۔

سوال: ﴿مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ سے کیا مراد ہے؟ بالتفصیل بتائیں۔

جواب: "مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ" میں کئی مفاہیم کا احتمال ہے اور وہ سب ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اہم درج ذیل ہیں۔

(۱) انسان نے جو نیک اور برے اعمال کر کے قیامت کے دن کے لیے بھیج دئے اور جو اچھے اور برے اعمال اس دنیا میں نہیں کئے۔

۲) انسان نے جو برائیاں کر کے آگے بھیج دیں اور جو نیک اعمال اس نے دنیا میں ترک کر دیے۔ (رازی، تدبر)

(۳) "ما قَدَّمَتْ" سے مراد جو اچھے برے اعمال دنیا میں کیے اور "أخرت" سے مراد اس کے وہ اعمال ہیں جن کا اثر اس کے مرنے کے بعد بھی جاری وساری رہا۔ (تفہیم)

(۴) "ما قَدَّمَتْ" سے مراد وہ اعمال جو ابتداء عمر میں کیے اور أَخَّرَت سے مراد وہ اعمال ہیں جو آخر میں کئے۔

(۵) "مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ" سے اصل مقصود یہ ہے کہ وہ نفس اپنے ہر قسم کے اعمال سے مطلع ہو جائے گا (التحریر)

سوال: ﴿يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ "اَيُّهَا" کی لغوی وضاحت کریں نیز بتائیں کہ لفظ "الإنسان" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: جب منادی معرف باللام ہو تو حرف ندا اور منادی کے درمیان مذکر کے لئے اَيُّهَا اور مؤنث کے لئے اَيَّتُهَا لانا ضروری ہے۔ ترکیب میں اپنے بعد والے اسم کا مبدل منہ ہوتا ہے۔ اعراب میں مبنی علی الضم اور محلاً منصوب ہوتا ہے۔ الإنسان: "أيها" کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ "أيها" منادی مفرد مبنی علی الضم ہے۔ (معجم النحو، النداء) "الإنسان" کو "أيها" سے بدل اور عطف بیان بھی بنایا جا سکتا ہے۔ (اعراب)

سوال: "أيها" اور "الإنسان" کا محل اعراب ذکر کریں۔ لفظاً بھی اور معناً بھی؟

جواب: "أيها اور الإنسان" لفظاً مرفوع ہیں لیکن محلاً نداء کا منادی ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

سوال: ﴿يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ "أيها الإنسان" سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: "أيها الإنسان" سے تمام نافرمان لوگ مراد ہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے بارے میں کسی نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف مکذبین قیامت ہیں جن کے لیے یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ (تدبر، رازی)

سوال: ﴿يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ میں "مَا" کس معنی میں ہے؟ اور اس کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: اس آیت میں "مَا" استفہامیہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔(اعراب)

سوال: ﴿مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ کا محل اعراب اور آیت کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: جملہ "مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جواب ندا ہے۔(اعراب)

مفہوم: "مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ" میں استفہامیہ اسلوب اظہار تعجب کے لئے ہے۔یعنی تمہارے رب کی اس کریمی نے تم کو جزاء وسزا سے دور کر دیا کہ وہ تمہاری سرکشیوں پر فوراً گرفت نہیں کرتا اور برابر ڈھیل دیے جا رہا ہے تو تم نے اس کریمی سے بہت سخت دھوکا کھایا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اس کے لطف وکرم کی قدر کرتے ،اس کے شکر گزار بندے بنتے اور اپنے آپ کو اس کی عنایات کا مزید حق دار بناتے لیکن تم اس کے آگے بالکل ڈھیٹ بن گئے اور اس کے انذار کا مذاق اڑانے لگے۔(تدبر)

سوال: ﴿الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ﴾ کا ترجمہ اور محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری نوک پلک سنواری اور تمہاری تخلیق میں توازن رکھا۔

جملہ "الَّذِي خَلَقَكَ۔۔" لفظ "ربّ" کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔(اعراب)

سوال: ﴿خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ﴾ ان الفاظ کی لغوی تشریح کریں؟

جواب: خلق: کسی چیز کا خاکہ بنانا اور اس کو اپنی مرضی کی مقدار پر پیدا کرنا۔

تسویۃ: کہ کسی چیز کو سیدھا اور صحیح سالم بنانا، اس کی نوک پلک سنوارنا۔

تعدیل: بدن کے تمام اجزا کو آپس میں معتدل اور متناسب بنانا۔(التحریر، تدبر)

سوال: ﴿فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ﴾ میں "أَيِّ" کس معنی میں ہے؟

جواب: أَيِّ اصل میں اس استفہام کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں ایک چیز کو اس کی ہم جنس چیز سے ممتاز کرنا مقصود ہو لیکن اکثر اس کے ذریعے استفہام کر کے مضاف الیہ کی عظمت ورفعت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی چیز عظمت و کمال کے بلند رتبے کو پہنچتی ہے اسی وقت اس کی عظمت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔(التحریر)

سوال: ﴿فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ﴾ میں "مَا" زائدہ ہے یا شرطیہ؟

جواب: اس آیت میں "مَا" کو زائدہ ماننا زیادہ بہتر ہے جب کہ بعض اسے شرطیہ بھی بناتے ہیں۔(المنیر، اعراب)

سوال: ﴿فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ﴾ اگر "مَا" زائدہ ہو تو پھر اس آیت کی ترکیب کیسے ہو گی؟

جواب: اگر "فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ" میں "مَا" زائدہ ہو تو "صُورَةٍ" کی صفت "شَاءَ" ہو گی اور "فِي"

"رَكَّبَكَ" کا متعلق ہوگا اور یہ پورا جملہ "عَدَلَكَ" سے عطف بیان بن جائے گا۔ (فتح القدیر)

سوال: اگر "ما" شرطیہ ہو تو ﴿فِيٓ اَيِّ صُوْرَةٍ﴾ کس کے متعلق ہوگا؟

جواب: اگر شرطیہ بنائیں تو "فِيٓ اَيِّ صُوْرَةٍ" کو "رَكَّبَكَ" کے متعلق نہیں کر سکتے کیونکہ حرف شرط "ما" کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کر سکتا اور "فِيٓ اَيِّ صُوْرَةٍ" کو ماقبل "عَدَلَكَ" فعل کے متعلق بھی نہیں کر سکتے کیونکہ استفہام صدر کلام چاہتا ہے۔ اگر ماقبل کے متعلق کریں گے تو "أيّ" صدر کلام میں نہیں ہوگا۔ اس لئے "ما" کو شرطیہ بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ (فتح القدیر، المنیر)

سوال: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾ کی تشریح کریں۔

جواب: ان تین آیات میں استفہامی اسلوب اظہار تعجب کے لیے ہے کہ اے انسان! جس اللہ نے تجھے انتہائی اہتمام سے پیدا کیا، تیرے اعضاء میں تناسب رکھا، تیری شکل وصورت انتہائی خوبصورت اور باکمال بنائی۔ اس اہتمام کا تقاضا ہے کہ تیری تخلیق کا مقصد بھی عظیم ہے۔ پھر تجھے کون سی چیز تیرے حقیقی مقصد سے غافل کر کے تجھے اپنے مالک سے دور کر رہی ہے؟ تیرے رب کی تجھ پر کتنی عنایت ہے اور تو اس کی یاد سے اتنا ہی زیادہ غافل ہو رہا ہے۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ﴾ "الدین" کتنے معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے؟ اور یہاں اس کا کیا معنی ہے؟

جواب: دین کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے مشہور معانی مذہب، سیرت، جزا اور حساب وغیرہ ہیں اور یہاں دین بمعنی جزا استعمال ہوا ہے۔

سوال: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ﴾ میں "واؤ" کون سی ہے؟ اور اس آیت کا محل اعراب نقل کریں نیز بتائیں "لَحَافِظِيْنَ" کا لام کونسا ہے؟

جواب: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ﴾ میں واؤ حالیہ ہے اور جملہ "تکذبون" "أنتم" ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ "لَحَافِظِيْنَ" کا لام تاکید ہے۔

سوال: ﴿ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾ منصوب کیوں ہے؟

جواب: "كِرَامًا كَاتِبِيْنَ" "حفظين" کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: کیا ﴿ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو بتائیں کہ ان اوقات میں انسان کے اعمال کون لکھتا ہے جب وہ انسان کے ساتھ نہیں ہوتے؟

جواب: "کِرَامًا کَاتِبِیْنَ" ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ البتہ امام ابوبکر البزار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کراماً کاتبین سے حیا کرو جو تین حالتوں کے سوا تم سے جدا نہیں ہوتے، غائط، جنابت اور غسل کے وقت۔ (مسند البزار: ۴۷۹۹، ضعیف جدا: الضعیفہ: ۲۲۴۳) چونکہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اگر ان تین حالتوں میں بھی انسان کوئی عمل کرتا ہے تو وہ لکھتے ضرور ہیں کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ (ق: ۱۸) (وہ کوئی بھی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک تیار نگران ہوتا ہے) بصورتِ دیگر ان کی ڈیوٹی میں نقص لازم آئے گا اگر ان اوقات میں نہ لکھیں گے۔

سوال: ﴿یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ" "حٰفظین" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس جملے کو "کاتبین" سے حال بھی بنا سکتے ہیں۔ (اعراب)

سوال: ﴿یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ سے کیا یہ استدلال درست ہے کہ فرشتے بھی علم غیب جانتے ہیں اور ان کو بھی پوشیدہ باتوں کا علم ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو علم ہے؟

جواب: یہ بات درست نہیں کیونکہ فرشتے تو انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اس لئے ان کو علم ساتھ رہنے کی وجہ سے ہے، علم غیب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی شخصیت کو ذاتی علم غیب حاصل نہیں حتی کہ فرشتوں کو بھی یہ خاصیت حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ (الانعام: ۵۹) (اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، غیب کو صرف وہی جانتا ہے) شیخ صالح العثیمین رقم طراز ہیں: "قوله تعالیٰ "یعلمون ما تفعلون" إما بالمشاهدة إن كان فعلاً وإما بالسماع إن كان قولا بل إن عمل القلب يطلعهم الله عليه فيكتبونه"۔

سوال: ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ﴾ میں "لَفِیْ نَعِیْمٍ" کا مفہوم بتائیں۔

جواب: "لَفِیْ نَعِیْمٍ" سے مراد ہے کہ اہل جنت ہر طرف سے نعمتوں میں گھرے ہوئے ہوں گے، ان کی نگاہیں جدھر اٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی۔ (تدبر، مطففین: ۲۲)

سوال: ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ﴾ "بِغَآئِبِیْنَ" کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "غَآئِبِیْنَ" لفظاً مجرور ہے لیکن محلاً "وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ" میں مَا کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ﴾ میں "مَا" کی اعرابی حالت کیا ہے؟

جواب: ان آیات میں چاروں "مَا" استفہامیہ ہیں اور چاروں مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔

سوال: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ میں "مَا يَوْمُ الدِّيْنِ" محل رفع میں ہے یا نصب میں؟ اور "یوم" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ میں جملہ "مَا يَوْمُ الدِّيْنِ" "اَدْرٰىكَ" کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور يَوْمُ، مَا مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ مرفوع ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ○ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ○ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ﴾ فاجر مسلمان بھی ہوتا ہے اور کافر بھی۔ کیا یہ استدلال درست ہے کہ اہل کبائر مسلمان بھی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے کیونکہ ان کا شمار بھی فاجروں میں ہوتا ہے؟

جواب: یہ استدلال درست نہیں کیونکہ کئی دوسری نصوص سے ثابت ہے کہ "من مات یشھد ان لا إله إلا الله دخل الجنة" (مسند احمد: ۱۲۳۳۲، صحیح عن انس) گویا ہر مسلمان جنت میں بالآخر ضرور داخل ہوگا إن شاء الله۔ دوسری بات یہ کہ عربی زبان میں یہ بات عام ہے کہ ایسی جمع جو معرف بالألف واللام ہو وہ معہود سابق کے لئے استعمال ہوجاتی ہے جس طرح کہ اس آیت میں "الفجار" ہے۔ اس سے مراد پیچھے مذکور لوگ "بل تکذبون بالدین" ہیں جو کہ کافر ہیں، اہل کبائر مسلمان نہیں۔ (رازی)

سوال: ﴿وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ﴾ "جَحِيْمٍ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: جَحِيْمٍ: جَحَمَ يَجْحَمُ (ف) سے ہے جس کا معنیٰ "آگ بھڑکانا، آگ روشن کرنا ہے۔ جَحِيْمٍ: "بھڑکتی ہوئی آگ، انتہائی گرم جگہ، گہرے گڑھے میں بہت بڑی آگ" پر بولا جاتا ہے۔ جھنم پر کثرت استعمال کی وجہ سے جہنم کا علم ہوگیا ہے۔ (التحریر، نازعات، انفطار)

سوال: ﴿يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ "يَصْلَوْنَ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: يَصْلَوْنَ: "صَلِيَ يَصْلٰى صَلًى وَصِلِيًّا" (ع) سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ص، ل، ی۔ صَلِيَ النَّارَ کا معنیٰ ہے "آگ میں جلنا"۔ لیکن تجرید معنی کیلئے صَلِيَ النَّارَ کا ترجمہ "آگ میں جلا" کی بجائے "آگ میں داخل ہوا" کیا جاتا ہے کیونکہ جلانے کا معنیٰ اور صفت تو "النار" میں بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۶۰) میں "ولا تعثوا" کا معنیٰ "تم نہ پھرو" کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا حقیقی معنیٰ "تم فساد نہ کرو" ہے۔ اسے تجرید معنی کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ تجرید کے بغیر اصل معنیٰ ہی کیا جائے تاکہ کلام میں زیادہ تاکید آسکے۔

سوال: ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ﴾ مَا کون سا ہے، عَنْهَا کا مرجع کیا ہے اور بِغَآئِبِيْنَ کی باء کس معنی میں ہے؟

جواب: یہ مَا مشبہ بلیس ہے۔ ''هُمْ'' ضمیر اس کا اسم اور ''بِغَآئِبِيْنَ'' ''عَنْهَا'' متعلق سے ملکر اس کی خبر (محلاً منصوب) ہے۔ عَنْهَا کی ضمیر ''جحیم'' کی طرف راجع ہے۔ یہاں باء زائدہ ہے اور نفی میں تاکید کے فائدے کے لئے ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا﴾ ''يَوْمَ'' کا اعراب اور وجہ اعراب بتائیں۔

جواب: ''يَوْمَ لَا تَمْلِكُ'' میں ''يَوْمَ'' کو اگر ''يومُ الدين'' سے بدل بنائیں تو ''يوم'' محلاً مرفوع اور مبنی ہوگا اور یہ بعض اوقات جائز ہے کہ جب ظرف مبہم معرب کی طرف مضاف ہو تو اسے مبنی بنالیں۔

لیکن اگر اسے کسی محذوف فعل (يُجَازُوْنَ يا اَعْنِي) کا مفعول بنائیں تو یہ منصوب اور معرب ہوگا یا اگر ﴿يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ میں یوم سے بدل بنائیں تب بھی منصوب اور معرب ہوگا۔ (رازی، المنیر، معجم النحو)

سوال: جب ظرف مبہم فعل معرب کی طرف مضاف ہو تو اس کی اعرابی حالت کیا ہوتی ہے؟

جواب: جب ظرف مبہم فعل معرب کی طرف مضاف ہو تو وہ بھی معرب ہو جاتا ہے لیکن بعض مرتبہ ظرف کو مبنی والا اعراب دینا بھی جائز ہے مثلاً ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ﴾ (معجم النحو، الاضافہ)

سوال: ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ﴾ ''أمر'' سے کیا مراد ہے اور يَوْمَىِٕذٍ میں ''یوم'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: امر سے مراد فیصلہ، معاملہ، اختیار و اقتدار ہے اس دن صرف اللہ وحدہ لاشریک کے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ جن کو اللہ کا شریک و شفیع سمجھا گیا وہ اس دن ہوا ہوں گے۔

يَوْمَىِٕذٍ میں ''یوم'' یوم لا تملك کے یوم سے بدل ہے۔ (اعراب)

سوال: درج ذیل کی واحد اور معنی لکھیں۔

کواکب، بحار، قبور، کراما، ابرار، فجار

جواب: كَوْكَب: ستارے، بَحْر: سمندر، كَرِيْم: صاحب عزت ہونا، بَرّ: پارسا، نیک۔ فَاجِر: بد، قُبُوْر: قبر۔

سُوۡرَۃُ الۡمُطَفِّفِيۡنَ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ۝۱ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ۝۲ وَاِذَا
كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۝۴ لِيَوۡمٍ
عَظِيۡمٍ ۝۵ يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۶ كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِيۡ سِجِّيۡنٍ ۝۷
وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سِجِّيۡنٌ ۝۸ كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ۝۹ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۰ الَّذِيۡنَ
يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ۝۱۲ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ
اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۱۳ كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝۱۴
كَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّهُمۡ لَصَالُوا الۡجَحِيۡمِ ۝۱۶ ثُمَّ يُقَالُ
هٰذَا الَّذِيۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ۝۱۷ كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡاَبۡرَارِ لَفِيۡ عِلِّيِّيۡنَ ۝۱۸ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ
مَا عِلِّيُّوۡنَ ۝۱۹ كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ۝۲۰ يَّشۡهَدُهُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۝۲۱ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِيۡ نَعِيۡمٍ ۝۲۲ عَلَى
الۡاَرَآئِكِ يَنۡظُرُوۡنَ ۝۲۳ تَعۡرِفُ فِيۡ وُجُوۡهِهِمۡ نَضۡرَةَ النَّعِيۡمِ ۝۲۴ يُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِيۡقٍ
مَّخۡتُوۡمٍ ۝۲۵ خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ ؕ وَفِيۡ ذٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ ۝۲۶ وَمِزَاجُهٗ مِنۡ
تَسۡنِيۡمٍ ۝۲۷ عَيۡنًا يَّشۡرَبُ بِهَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۝۲۸ اِنَّ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا كَانُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا يَضۡحَكُوۡنَ ۝۲۹ وَاِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ يَتَغَامَزُوۡنَ ۝۳۰ وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤى اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا
فَكِهِيۡنَ ۝۳۱ وَاِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۝۳۲ وَمَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ ۝۳۳
فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ ۝۳۴ عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۙ يَنۡظُرُوۡنَ ۝۳۵ هَلۡ
ثُوِّبَ الۡكُفَّارُ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ۝۳۶

سوال: اس سورت کی گزشتہ سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: دونوں سورتوں میں کئی اعتبار سے مناسبت پائی جاتی ہے۔

(۱)دونوں سورتوں میں احوال قیامت کا بیان ہے۔

(۲)انفطار میں اعمال لکھنے والے کاتبین کا تذکرہ ہے اور مطففین میں لکھی جانے والی کتاب کا تذکرہ ہے۔

(۳)دونوں سورتوں میں قیامت کے روز لوگوں کے دوگروہوں میں تقسیم ہونے کا تذکرہ ہے: الأبرار والفجار۔(المنیر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع بھی آخرت ہے۔ مضمون کچھ اس طرح ہے کہ پہلے معاشرے میں پھیلی ہوئی عام برائی ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا تذکرہ ہے۔ ناپ تول کا ذکر کر کے درحقیقت انسان کے دوہرے معیار کی مذمت کی گئی ہے اور اس کی وجہ آخرت سے غفلت بتائی گئی ہے۔ پھر آیت نمبر ۷ تا ۱۷ تک ان بدبختوں کا تذکرہ ہے جو یوم جزاوسزا کو جھٹلا کر اپنے آپ کو بڑی سزا کا مستحق ثابت کر رہے ہیں۔ پھر آیت نمبر ۱۸ تا ۲۸ تک ان خوش قسمتوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری اور جنت کے حقدار ٹھہرے اور آخر میں یوم حساب کا تذکرہ ہے جس روز بدبخت عذاب میں مبتلا ہوں گے اور مومنین ان کی سزا دیکھ کر ہنس رہے ہوں گے جس طرح یہ کفار دنیا میں مسلمانوں پر ہنسا کرتے تھے۔(تفہیم، تدبر)

سوال: یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟

جواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو لوگ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ لیکن بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔ البتہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ سورت سنا دی۔ اس کے مکی ہونے کی دلیل اس کا مضمون ہے جس میں روزِ قیامت اور جزاوسزا کا تذکرہ ہے۔(تفہیم، تدبر)

سوال: "سورۃ المطففین" کے نام میں "مطففین" اسم فاعل جری حالت میں ہے جبکہ "سورۃ المنافقون" میں اسم فاعل "منافقون" رفعی حالت میں ہے حالانکہ ترکیب ایک ہی ہے، وجہ ذکر کریں۔

جواب: یہ نام سب حکائی ہیں اور ان میں تراکیب وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جیسے سورتوں میں نام استعمال ہوئے ہیں ویسے ہی ان کو سورۃ کے اضافے کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۃ المنافقون میں لفظ منافقون حالتِ رفع میں ہے اور سورۃ المطففین میں لفظ مطففین جری حالت میں ہے۔ یہ اسی طرح ہی استعمال ہوتے ہیں ان میں کوئی خاص قاعدہ نہیں۔

سوال: ﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ﴾ "ویل" کیا صیغہ ہے؟ اور وضاحت کریں کہ اس کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا کیوں بنایا گیا؟

جواب: ویل: اسم ہے جس کا کوئی باب نہیں۔(لسان)۔جب یہ بغیر لام کے مضاف ہوتا ہے تو مصدر منفرد کے قائم مقام ہوتا ہے مثلاً ﴿وَیْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللهِ كَذِبًا﴾ (طہ:۶۱) (ہلاکت ہو تمہارے لئے اللہ پر جھوٹ افتراء نہ باندھو)۔(معجم النحو)

چونکہ "ویل" میں بددعا کا معنی ہے، اس لئے اسے مبتدا بنایا گیا۔جب نکرہ میں دعا یا بددعا کا معنی ہو تو اسے مبتدا بنانا جائز ہے۔مثلاً: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ﴾ (مریم:۱۵) (ترجمہ: اور انہیں سلام (پہنچے) جس دن وہ پیدا کئے گئے) (اعراب، معجم النحو)

سوال: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ میں "تطفیف" کا لغوی و اصطلاحی معنی ذکر کریں۔

جواب: عربی زبان میں طفیف چھوٹی اور حقیر چیز کو کہتے ہیں۔لغوی طور پر مطفِّف (مُقِلّ) کمی کرنے والے کو کہتے ہیں۔اصطلاحاً مطفّف وہ شخص ہوتا ہے جو چوری چھپے قلیل مقدار میں ناپ تول میں کمی کرتا ہے۔(رازی، تفہیم، المنیر)

سوال: کس نبی کی قوم ناپ تول میں کمی کرتی تھی؟

جواب: حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول میں کمی کرتی تھی۔

سوال: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ کیا صرف ناپ تول میں کمی کی مذمت کی گئی ہے یا اس میں کچھ اور مفاہیم بھی داخل ہیں؟

جواب: اس میں صرف ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی مذمت نہیں بیان کی گئی بلکہ ایک خاص کردار کو بیان کیا گیا وہ یہ کہ جب لوگوں سے کوئی چیز لیتا ہے تو پوری پوری لیتا ہے اور جب دوسروں کو دیتا ہے تو کمی کرتا ہے۔انسان کے اس دوہرے رویے (لینے کے اور دینے کے اور) کی مذمت کی گئی ہے۔

سوال: ﴿الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ﴾ میں "اكْتَالُوْا مِنَ النَّاسِ" کی بجائے "عَلَى النَّاسِ" لانے کی کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

جواب: اسکی دو توجیہات ممکن ہیں: (۱) یہاں علی، مِن کے معنی میں ہے، اکتال کے ساتھ دونوں حروف ذکر کر دئے جاتے ہیں (کشاف)

(۲) "اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ" سے مراد مکہ کے سردار اور صاحب اقتدار لوگ ہیں جو لوگوں سے چیزیں لیتے وقت ان پر جبر کرتے تھے، ان کے اس رویے کی وجہ سے اس کو "علی الناس" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔(فی ظلال القرآن)

سوال: ﴿الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ﴾ میں "يَسْتَوْفُوْنَ" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "يَسْتَوْفُوْنَ" کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جواب شرط غیر جازم ہے۔

سوال: ﴿وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ میں "كَالُوْهُمْ" کا محل اعراب بتائیں۔

جواب: "کَالُوْهُمْ" "إذا" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور انکے معانی لکھیں۔

مطففین، اِکتالوا، یستوفون، کالوا، وزنوا۔

جواب: مطففین: باب تفعیل "طَفَّفَ یُطَفِّفُ تَطْفِیْفًا" سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ط، ف، ف۔ معنی: پیمانے کو پورا نہ بھرنا، کمی کرنا۔

اِکتالوا: باب افتعال "اِکْتَالَ یَکْتَالُ اِکْتِیَالًا" سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ک، ی، ل۔ معنی: کسی سے خود ناپ کر لینا۔

یستوفون: باب استفعال "اِسْتَوْفٰی یَسْتَوْفِیْ اِسْتِیْفَاءً" سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: و، ف، ی۔ معنی: پورا پورا لینا۔

کالوا: "کَالَ یَکِیْلُ کَیْلًا" (ض) سے جمع مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ پورے قرآن مجید میں یہ صیغہ صرف ایک بار آیا ہے۔ مادہ: ک، ی، ل۔ معنی: ناپ کر دینا۔

وزنوا: "وَزَنَ یَزِنُ زِنَةً" (ض) سے جمع مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: و، ز، ن۔ معنی: وزن کرنا۔

سوال: ﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ﴾ "یَظُنُّ" فعل دو مفعول چاہتا ہے اس کے دونوں مفعولوں کی وضاحت کریں۔ نیز بتائیں یہاں "ظن" کس معنی میں ہے؟

جواب: جب "أنّ" سے شروع ہونے والا جملہ مفعول بن رہا ہو تو وہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہوتا ہے۔ (اعراب) اس لئے کہ "أنّ" مبتدا اور خبر پر داخل ہوتا ہے اس لیے یہ دونوں ہی بالواسطہ اس کے دو مفعول ہوتے ہیں لہذا "أنهم مبعوثون" دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ "ظَنّ" یہاں یقین کے معنی میں ہے۔

سوال: ﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ﴾ میں "مَبْعُوْثُوْنَ" کا نائب الفاعل کون ہے؟

جواب: "مَبْعُوْثُوْنَ" کا نائب الفاعل "هم" ضمیر مستتر ہے۔

سوال: ﴿لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ○ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ میں "لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ" اور "لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کا لام جارہ کن معانی کے لئے استعمال ہوا ہے؟

جواب: "لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ" میں لام جارہ توقیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی "مبعوثون وقت یوم عظیم" جس

طرح کے قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ میں ہے ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۸) (ترجمہ: نماز ادا کیجئے سورج ڈھلنے سے) أي وقت دلوك الشمس۔

"لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں لام جارہ أجل کے معنی میں ہے یعنی "يقوم الناس لأجل ربوبيته" (التحریر)

سوال: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ "الناس" "رب" اور "العالمين" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: الناس: یہ لفظ جن وانس پر بولا جاتا ہے اسکی اصل أناس تھی تخفیفاً الناس پڑھا جاتا ہے۔ مادہ: ا، ن، س۔ (لسان) اسکی واحد إنس ہے (تاج) یا إنسان خلاف قیاس ہے۔ (المعجم الوسیط)

رب: رَبَّ يَرُبُّ سے مصدر ہے جو کہ بطور اسم استعمال ہوا ہے جیسا کہ "زيد عدل" کہا جاتا ہے۔

العالمين: العالم (بروزن فاعَل) کی جمع ہے اور فاعَل کے وزن پر صرف العالم لفظ ہے جس کی جمع واؤ نون سے آتی ہے۔ (لسان العرب) العالم بذات خود اسم جمع ہے جس کی واحد لفظوں میں مستعمل نہیں ہے۔ (اعراب القرآن سورۃ الفاتحہ)

سوال: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ" "لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ" میں "يَوْم" سے بدل بھی بنا سکتے ہیں۔ اور کسی محذوف فعل کا مفعول فیہ بھی بنا سکتے ہیں۔ (اعراب)

سوال: کیا ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں "يوم" کو ﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ میں "يوم" سے بدل بنایا جا سکتا ہے؟ اگر بدل ہے تو ان کا اعراب متفق کیوں نہیں؟

جواب: "يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ" میں "يوم" کو "لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ" سے بدل بنانا جائز ہے کیونکہ امام فراء کے ہاں جب ظرف غیر متمکن کی طرف مضاف ہو تو اس پر نصب آتی ہے۔ اب یوم محل جر میں ہے لیکن لفظاً منصوب ہے۔ (تفسیر مظہری، انوار البیان) ویسے بھی جب ظرف مبہم معرب فعل کی طرف مضاف ہو تو عموماً ظرف بھی معرب ہوتی ہے لیکن اسے مبنی بنانا بھی جائز ہوتا ہے۔ (معجم النحو)

سوال: ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ "كَلَّا" کلام میں کس مقصد کے لئے لایا جاتا ہے؟

جواب: لفظ "كَلَّا" کلام میں مختلف معانی کے لیے لایا جاتا ہے۔ مثلاً زجر و توبیخ کے لیے، حقاً کے معنی میں، ألا کے معنی میں، ماقبل کلام کے رد کے لیے۔ آیت نمبر ۷ اور ۱۴ میں حقاً اور ردع دونوں معانی کا احتمال موجود ہے۔ (الثمین، تدبر)

سوال: ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ "سِجِّيْنٍ" کی لغوی اور صرفی وضاحت کریں۔

جواب: "سجین" "سَجَنَ یَسْجُنُ" (ن) سے فِعِّیْلٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ جس طرح کہ ضِلِّیْلٌ۔ اور یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ یہ سِجْنٌ (جیل خانہ) سے مشتق ہے۔ سِجِّیْن: سختی سے قید کرنے والی۔ مادہ: س، ج، ن۔ (التحریر)

سجّین: اسم علم ہے جو کہ وصف سے منقول ہے۔ (الکشاف)۔ یہ سجنٌ سے مشتق ہے بروزن فِعِّیل جیسے شِرّیب اور فِسِّیق (بہت فاسق) ہے۔ اس صورت میں یہ صفت مشبہ ہوگا۔ (انوار البیان، البحر المحیط)

سوال: ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ "سِجِّیْن" سے کیا مراد ہے؟ یہ جگہ ہے یا کتاب وغیرہ کا نام ہے؟

جواب: مفسرین نے "سِجِّیْن" اس کتاب کو بھی قرار دیا ہے جس میں کفار، فاسقین اور شیاطین کا اعمال نامہ ہوگا۔ ایسی صورت میں "کتاب مرقوم" "سجین" کی وضاحت ہوگی یعنی "سجین" "كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ" ہے۔ (تدبر، تفہیم، الکشاف، انوار)

بعض مفسرین کے ہاں "سجین" جہنم میں ایک تنگ جگہ کا نام ہے اور اس جگہ فاسقین کا اعمال نامہ ہوگا۔ اس صورت میں "کتاب مرقوم" سے پہلے "ھو محل" محذوف ہوگا یعنی "ھو محل کتاب مرقوم"۔ (رازی، انوار)

بعض مفسرین کے ہاں "سجین" ساتویں زمین کی نچلی سطح کا نام ہے۔ اس کی تائید حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے۔ اس میں ہے: "أکتبوا کتاب عبدی فی السجین" (یعنی الکافر فی الأرض السابعة السافلة.) (مسند أحمد: ۴/ ۱۸۵۳، وصححه الالبانی فی المشکاۃ: ۱۶۰۰) یعنی "سجین" ایک حقیر اور کم تر جگہ کا نام ہے، اس صورت میں "کتاب مرقوم" "کتاب الفجار" کا بیان ہوگا۔ اور جملہ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ﴾ استفہام تحقیر (نچلے پن) کے لیے ہے۔ یہی راجح ہے۔ (فتح القدیر، التفسیر الثمین، الرازی)

سوال: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ﴾ میں "مَا سِجِّيْنٌ" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: "مَا سِجِّيْنٌ" "أدرٰی" کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ﴾ میں "كِتٰبٌ" اور "مرقوم" مرفوع کیوں ہیں؟

جواب: "كِتٰبٌ" مبتدا محذوف (ھو) کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور "مرقوم" "كِتٰبٌ" کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: مجرموں کو اگر اللہ تعالیٰ سزا دینا چاہے تو اپنے علم کلّی کی بنا پر دے سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی کتابت کیوں کروا رہے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ اس چیز پر قادر ہے اگر وہ چاہے تو بغیر لکھوائے کسی کو بھی سزا دے دے لیکن اللہ جل شأنہ سراپا عدل

ہیں۔ وہ کسی انسان پر ظلم نہیں کرتے اور انسان سراسر نافرمان ہے۔ وہ جس طرح دنیا میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہے روزِ قیامت بھی اللہ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی خاطر کاتبین (فرشتے) مقرر کئے ہیں۔ اسی لئے فرمایا: ﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۸۱) (ترجمہ: پھر ہر شخص کو پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے) حتیٰ کی بعض ایسے بدبخت بھی ہوں گے جو اس لکھے کا بھی انکار کر دیں گے۔ تو اس وقت ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ فرمایا ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (یٰس: ۶۵) (ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ہمارے ساتھ ان کے ہاتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے) اسی حکمت کے پیش نظر اعمال لکھے جا رہے ہیں۔ (رازی، سورۃ النبا، آیت ۲۹)

سوال: ﴿الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں "الَّذِيْنَ" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ میں موجود "المکذبین" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ﴾ میں استثناء کی کون سی قسم ہے؟ نیز "كُلُّ مُعْتَدٍ" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: اس آیت میں استثناء مفرغ حصر کے لئے ہے۔

"كُلُّ مُعْتَدٍ" "يُكَذِّبُ" کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: ﴿الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ○وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ○ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ "یوم الدین" کو جھٹلانے والوں کی اس سورت میں کتنی اور کون سی صفات بیان ہوئی ہیں؟

جواب: "یوم الدین" کو جھٹلانے والوں کی اس جگہ تین صفات بیان ہوئی ہیں۔

۱ "معتدٍ" حد سے تجاوز کرنے والے۔

۲ "أثیم" انتہائی گناہگار۔

۳ منکرین نبوت جو قرآن کو أساطیر الاولین (پہلے لوگوں کے قصے) قرار دیتے ہیں۔ (رازی)

سوال: "یوم الدین" عقلی اور نقلی طور پر ایک واضح حقیقت ہے، پھر بھی انسان اس کے انکار پر کیوں مصر ہے؟

جواب: یوم الدین عقلی و نقلی طور پر ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن انسان اپنی خواہشات و شہوات کی وجہ سے اس کا انکاری ہے۔ بعض اوقات انسان ان کا منکر تو نہیں ہوتا لیکن ذاتی خواہشات کی وجہ سے اس دن سے غافل ہو جاتا ہے۔ (تدبر)

اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اصلاً انسانی بداعمالیوں کی مکمل جزا اس دنیا میں نہیں بلکہ روزِ قیامت ملے گی۔

اس وجہ سے انسان اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ چونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ فوری اور سامنے موجود سزا سے زیادہ خوفزدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ دنیاوی سزا سے تو خوفزدہ ہوتا ہے لیکن "یوم الدین" کی ہولناکیاں اس کے ذہن میں ہر وقت مستحضر نہیں ہوتیں۔

سوال: واحد کی جمع اور جمع کی واحد بتائیں۔

معتدٍ، أساطیر، ربّ، الفجّار، الأوّلین۔

جواب: معتدٍ جمعه معتدون، أساطیر واحده أسطورةٌ، ربّ جمعه أرباب، الفجّار واحده فاجر، الأوّلین واحده الأوّل۔

سوال: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: یہ آیت ﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ﴾ میں موجود "معتدٍ" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ (التحریر) اور اگر اسے کُلُّ کی صفت بنائیں تو پھر محل رفع میں ہوگی۔ (اعراب)

سوال: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ میں "أساطیر" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: "أساطیر" مبتدا محذوف (هی) کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ کا ترجمہ کریں اور مفہوم حدیث کی روشنی میں واضح کریں۔

جواب: ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن العبد إذا أخطأ خطیئة نکتت فی قلبه نکتة فان هو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه فان عاد زید فیها حتی یعلو قلبه فهو الران الذی قال الله تعالیٰ ﴿كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾"

بلاشبہ جب کوئی انسان خطا کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک نکتہ لگا دیا جاتا ہے اگر وہ اس کام سے رک جاتا اور توبہ واستغفار کرتا ہے تو اس کا دل چمکدار ہو جاتا ہے اگر وہ دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس نکتہ کو بڑھا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر پھیل جاتا ہے۔ پس یہی ران ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (ترمذی: ۳۳۳۴، والنسائی فی التفسیر: ۶۷۸، وابن ماجہ: ۴۲۴۴، صحیح) (المنیر، تدبر)

سوال: ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ میں "لَمَحْجُوبُونَ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "لَمَحْجُوبُونَ" سے مراد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے محروم کر دیے جائیں گے۔ "محجوبون عن

رؤیته" (الثمین، فتح القدیر)

سوال: ﴿كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ کی روشنی میں بتائیں کیا اللہ کی رؤیت روز قیامت ممکن ہوگی؟ اگر ہو گی تو کن کیلئے ہوگی؟

جواب: روز قیامت اللہ تعالیٰ کی رؤیت اہل ایمان کے لیے ممکن ہوگی جب کہ مشرکین و کفار اللہ کی رؤیت سے محروم ہوں گے۔ ان کے محروم ہونے کی دلیل یہی آیت ہے ﴿كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ جب وہ محروم ہوں گے تو واجب ہوا کہ نیکوکار لوگ اللہ کی رؤیت کے شرف سے ممتاز ہوں گے۔ (رازی)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رؤیت مومنین کے لیے بالعین ہوگی۔ یہ بات قرآن وسنت، اجماع صحابہ وائمہ سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں ہے ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامۃ: ۲۲، ۲۳) (ترجمہ: کتنے ہی چہرے اس دن حشاش بشاش ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) حدیث میں ہے: "إنكم سترون ربكم عياناً كما ترون الشمس صحواً ليس دونها سحاب" (بخاری: ۵۵۴، ۷۴۳۵، مسلم: ۱۴۳۴) (بلاشبہ تم اپنے پروردگار کو کھلے عام دیکھو گے جس طرح تم سورج کو صاف مطلع (جب سورج کے سامنے بادل نہ ہوں) میں دیکھتے ہو) (الثمین، فتح القدیر)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں اور ان کے معانی بھی لکھیں۔

مرقوم، معتدٍ، أثيم، تُتلى، رانَ، محجوبون۔

جواب: مرقوم: "رَقَمَ يَرْقُمُ رَقْمًا" (ن) سے اسم مفعول ہے۔ مادہ: ر، ق، م۔ معنی: لکھی ہوئی۔

معتدٍ: باب افتعال "اِعْتَدٰى يَعْتَدِي اِعْتِدَاءً" سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ اصل میں "معتدِيٌ" تھا۔ مادہ: ع، د، و۔ معنی: حد سے تجاوز کرنے والا۔

أثيم: "أَثِمَ يَأْثَمُ أَثْمًا وَإِثْمًا" (ع) سے صفت مشبہ ہے۔ مادہ: أ، ث، م۔ معنی: سخت گناہ گار۔

تُتلى: "تَلَا يَتْلُو تِلَاوَةً" (ن) سے واحد مؤنث غائب مضارع مجہول ہے۔ مادہ: ت، ل، و۔ معنی: پڑھی جاتی ہیں۔

رانَ: "رَانَ يَرِيْنُ رَيْنًا" (ض) سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: ر، ی، ن۔ معنی: زنگ آلود ہوگیا۔

محجوبون: "حَجَبَ يَحْجُبُ حَجْبًا" (ن) سے جمع مذکر اسم مفعول ہے۔ مادہ: ح، ج، ب۔ معنی: پردے میں رکھے ہوئے۔

سوال: ﴿ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ﴾ کا ترجمہ کریں اور بتائیں "صالوا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: پھر یقیناوہ بھڑکتی آگ میں جلنے (یا داخل ہونے) والے ہیں۔

صالوا: "صَلِیَ یَصْلیٰ صَلْیًا وَ صِلِیًّا" (ع) سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ اصل میں "صَالِیُوْنَ" تھا۔ یاء مضموم ماقبل مکسور قاعدہ رَضُوْا کی نسبت ماقبل کسرہ کو حذف کر کے ضمہ ماقبل کو دیا "صَالُیُوْنَ" بنا، ضمہ کی مناسبت کی وجہ سے یاء کو واؤ سے بدلا ، پھر اجتماع ساکنین کی وجہ سے واؤ کو حذف کر دیا "صَالُوْنَ" ہو گیا۔ یہاں اضافت کی وجہ سے نون اعرابی کو حذف کر دیا ہے۔ مادہ: ص، ل، ی۔ معنی: آگ میں جلنا۔ تجرید معنی کے طور پر اس کا معنی "آگ میں داخل ہونا" کیا جاتا ہے۔ لیکن بغیر تجرید کے اصل معنی کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے تاکہ کلام میں تاکید آسکے۔

سوال: ﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ﴾ میں "الجحیم" پر کسرہ کیوں آیا ہے؟

جواب: "الجحیم" "صالوا" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

سوال: ﴿ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ﴾ "لَصَالُوا الْجَحِيْمِ" میں اضافت کون سی ہے؟

جواب: "لَصَالُوا الْجَحِيْمِ" میں اضافت لفظی ہے۔

سوال: ﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ میں جملہ "هٰذَا الَّذِيْ" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: یہ محل رفع میں ہے کیونکہ فعل مجہول کے بعد مقولہ نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوتا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ میں "تُكَذِّبُوْنَ" کا محل اعراب بتائیں۔

جواب: تُكَذِّبُوْنَ، كُنْتُمْ کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ﴾ میں "عِلِّيِّيْنَ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "عِلِّيُّوْنَ" کے معانی و مقصود کے بارے میں کئی اقوال ہیں جن میں سے اکثر اقوال میں "علوّ" کا معنی مشترک ہے۔ یعنی "عِلِّيُّوْنَ" سے مراد بلند جگہ و مقام ہے یعنی عزت و شرف کی جگہ۔ (رازی، فتح القدیر، انوار البیان)

علیین، عشرین کی طرح جمع ہے جس کی کوئی واحد لفظی طور پر نہیں ہے۔ (رازی، المنیر)

یہ عُلُوٌّ سے مشتق ہے اور عِلِّيٌّ بروزن فِعِّيْلٌ کی جمع ہے جو کہ اسم مبالغہ ہے۔ مادہ: ع، ل، و۔ عِلِّيُّوْن غیر قیاسی طور پر جمع مذکر سالم کے ساتھ ملحق ہے۔ امام فراء کے نزدیک عِلِّيُّوْن جنت میں نیک لوگوں کا خاص مقام ہے اور یہ نام اس کے ساتھ خاص ہے جس کا واحد نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک عِلِّيٌّ عرب کے ہاں مستعمل نہیں۔ (التحریر)

سوال: ﴿يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ گزشتہ آیت میں موجود "کتاب" کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں اور بتائیں کہ "الْمُقَرَّبُوْنَ" سے کون مراد ہیں؟

جواب: جس کے پاس مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ "الْمُقَرَّبُوْنَ" سے فرشتے مراد ہیں۔

سوال: ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ﴾ میں "لَفِيْ نَعِيْمٍ" کا مفہوم بتائیں۔

جواب: "لَفِيْ نَعِيْمٍ" سے مراد ہے کہ اہل جنت ہر طرف سے نعمتوں میں گھرے ہوئے ہوں گے، ان کی نگاہیں جدھر اٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی جیسا کہ اردو میں کہا جاتا ہے: وہ آدمی عیش وعشرت میں اور مزے میں ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ کا معنی ومفہوم ذکر کرتے ہوئے بتائیں کہ "أرائك" سے کیا مراد ہے اور وہ کسے دیکھ رہے ہوں گے؟ نیز "يَنْظُرُوْنَ" کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: ﴿عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ یہ جملہ ﴿كَلَّآ إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ اسی تناظر میں اس کی تفسیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ "أرائك" یہ أريكة کی جمع ہے اور یہ أريكة اس چارپائی کو کہتے ہیں جو کسی قبّے (خیمے) کے نیچے ہو (جیسے دلہن کے لئے مسہری سجائی جاتی ہے)۔ (السمین، الرازی)

اس روز جنتی اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ جملہ "لمحجوبون" کے مقابل آیا ہے۔ نیز اس کے بعد ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ کا جملہ ہے اور نضر انسانی چہرے پر اللہ کی رؤیت سے ہوگا۔ جس طرح سورۃ القیامۃ میں ہے ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامۃ: ۲۲، ۲۳) (ترجمہ: کتنے ہی چہرے اس دن حشاش بشاش ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) (الرازی، تدبر)

اس سے مراد مطلق تمام نعمتیں بھی ہوسکتی ہیں کہ وہ نعمتوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ لفظ "نضرة النعيم" استعمال ہوا ہے اور "النعيم" سے مراد تمام نعمتیں ہیں۔ (المنیر)

"يَنْظُرُوْن" کا مفہوم: وہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فضل وعنایات اور اس کی شانیں اور جلوے دیکھ رہے ہوں گے جیسا کہ اردو میں بھی بولا جاتا ہے کہ وہ بیٹھا نظارے کر رہا ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ میں "تنظر" کی بجائے "تعرف" کیوں لایا گیا؟ نیز "نضرة النعيم" سے کیا مراد ہے؟

جواب: دیکھنے اور پہچاننے میں خاصا فرق ہے، بعض دفعہ ایک آدمی کسی شخص کو دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن یہ پہچان نہیں پاتا کہ یہ

خوشی میں ہے یا غمی میں۔ لیکن بعض دفعہ کوئی شخص اس قدر خوش ہوتا ہے کہ اس کی خوشی اس کے چہرے سے ٹپک رہی ہوتی ہے ، ہر دیکھنے والا شخص یہ پہچان لیتا ہے کہ یہ آج کس قدر خوش ہے۔ اسی چیز کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جنتی اس قدر خوش ہوں گے کہ یہ خوشی ان کے چہرے کی حشاشت وبشاشت کی وجہ سے بالکل واضح ہوگی اور پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

"نضرۃ النعیم" سے مراد نعمتوں کی بنا پر چہرے پر آنے والی تروتازگی اور بشاشت ہے جس طرح ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ۝ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ﴾ (عبس: ۳۸، ۳۹) (ترجمہ: بعض چہرے اس دن روشن ہوں گے۔ ہنستے ہوئے ، بہت خوش) (رازی، المنیر)

نضرۃ اس تازگی وبشاشت کو کہتے ہیں جو نعمتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھلکتی ہے فرمایا جو بھی دیکھے گا ان کے چہروں پر نعمت کی تازگی اور بشاشت پائے گا۔ (تدبر)

سوال: ﴿يُسۡقَوۡنَ مِنۡ رَّحِيۡقٍ مَّخۡتُوۡمٍ﴾ "رحیق مختوم" کا معنی ذکر کرتے ہوئے بتائیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: رَحِيۡق: صاف اور خالص شراب کو کہتے ہیں۔ مَخۡتُوۡم: خَتَمَ يَخۡتِمُ خَتۡمًا (ض) سے اسم مفعول ہے، جس کے معنی "کسی چیز کو بند کر کے مہر لگانا ہے"۔ جسے عام زبان میں سیل کرنا کہتے ہیں۔

"رحیق مختوم" سے مراد ایسی خالص شراب ہے جس میں نہ کسی غیر کی آمیزش ہو اور نہ اس سے نشہ طاری ہو اور وہ شراب سر بمہر ہو۔ پہلی مرتبہ اہل جنت ہی اسے کھولیں گے۔ (رازی، المنیر، تدبر)

سوال: ﴿خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ﴾ کی اعرابی حالت کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: "خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ" رحیق کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

"خِتٰمُهٗ مِسۡكٌ" سے مراد ہے کہ اس شراب کی مہر مشک کی ہوگی۔ "ختام" کسی بھی چیز کے آخر کو بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا معنی ہوگا کہ پینے والے کو آخر پر مشک کی خوشبو آئے گی۔ (رازی، تدبر)

سوال: ﴿وَفِيۡ ذٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ﴾ میں واؤ کون سی ہے اور اس جملے کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿وَفِيۡ ذٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ﴾ اس جملہ میں واؤ اعتراضیہ ہے۔ اور جملہ معترضہ ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

سوال: ﴿وَفِيۡ ذٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ﴾ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بتائیں کہ "تنافس" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "تنافس" کا لغوی معنی ہے کسی چیز میں سبقت لے جانے کے لئے مقابلہ کرنا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ

انسان دنیاوی چیزوں کے حصول میں دوسروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ حالانکہ حق تو یہ ہے کہ "أبرار" کی مذکورہ بالا جزا کے حصول کے لئے مقابلہ کیا جائے۔ (رازی، الثمین)

سوال: ﴿وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ﴿وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾ یہ جملہ محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف "خِتٰمه مسك" پر ہو رہا ہے۔ اور "خِتٰمه مسك" رحيق کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: ﴿وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾ میں "مزاج" اور "تسنيم" کا معنی بتائیں، نیز اس کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: "مزاج" سے مراد آمیزش اور ملاوٹ ہے جب کہ تسنيم کا لغوی معنی رفعت و بلندی ہے۔ اس سے مراد جنت کا ایک عظیم چشمہ ہے۔ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ شراب ایسی ہوگی جس میں جنت کے بہت عظیم المرتبت چشمے تسنیم کی ملاوٹ ہوگی۔ (رازی، فتح القدیر)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں اور جہاں تعلیل ہوئی ہے وہاں تعلیل بھی ذکر کریں۔

الأبرار، يقال، نَضْرَة، يُسْقَوْنَ، خِتَام، متنافسون، مِزَاج، تسنيم۔

جواب: الأبرار: بَرٌّ کی جمع ہے اور بَرَرَة: بَارٌّ کی جمع ہے۔ مادہ: ب، ر، ر۔ معنی: نیک، فرماں بردار ہونا۔ (قاموس)

يقال: "قَالَ يَقُوْلُ قَوْلًا" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع مجہول ہے۔ اصل میں "يُقْوَلُ" تھا، واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن، واؤ کی حرکت ماقبل کو دی، واؤ کا ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے واؤ کو الف سے بدلا "يقال" ہو گیا۔ مادہ: ق، و، ل۔

نَضْرَة: نَضَرَ يَنْضُرُ نَضْرَةً وَنُضُوْرًا (ن) سے اسم ہے۔ مادہ: ن، ض، ر۔ معنی: تر و تازہ ہونا، بارونق ہونا۔

يُسْقَوْنَ: "سَقَى يَسْقِي سَقْيًا وَ سِقَايَةً" (ض) سے جمع مذکر غائب مضارع مجہول ہے۔ اصل میں "يُسْقَيُوْن" تھا، یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا اور پھر اجتماع ساکنین کی وجہ سے الف کو حذف کر دیا، يُسْقَوْنَ ہو گیا۔ مادہ: س، ق، ی۔ معنی: انکو پلایا جائے گا۔

متنافسون: باب تفاعل تَنَافَسَ يَتَنَافَسُ تَنَافُسًا سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ن، ف، س۔ معنی: مقابلہ کرنے والے۔

خِتام: "خَتَمَ يَخْتِمُ خَتْمًا وَ خِتَامًا" سے مصدر بمعنی "الخلط والمزاج" ہے۔ اور اسے اسم بنانا بھی درست

ہے بمعنی الذی یختم بہ۔ مادہ: خ، ت، م۔ معنی: مہر۔ (اعراب)

مِزَاج: مَزَجَ یَمْزُجُ مَزْجًا (ن) سے اسم ہے۔ مادہ: م، ز، ج۔ معنی: ملانے کی چیز۔

تسنیم: یہ ایک چشمے کا عَلَمْ ہے اور اصل میں باب تفعیل ''سَنَّمَ یُسَنِّمُ'' سے مصدر ہے، جس کا معنی ''کسی چیز کو کوہان نما بنانا'' ہے۔ مادہ: س، ن، م۔ (اعراب، قاموس)

فائدہ: قرآن پاک کی جس سورت میں کَلَّا ہو وہ سورت مکی ہوتی ہے۔ (اعراب القرآن، سورت مطففین: آیت ۱۸ تا ۲۱)

سوال: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ میں ''عینًا'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: ''عینًا'' امام زجاج کے ہاں تسنیم سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اسے فعل محذوف ''أعني یا أمدح'' کا مفعول بھی بنا سکتے ہیں۔ (رازی، المنیر)

سوال: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ میں ''یشرب'' فعل کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ''یشرب'' فعل ''عیناً'' کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ میں بھا کی ''باء'' کس معنی میں ہے؟ اور اس آیت کی تفسیر کیسے ہوگی؟

جواب: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ میں باء، مِنْ کے معنی میں ہے۔ لیکن اس سے بھی اچھی توجیہ یہ ہے کہ با اپنے اصل معنی میں ہے اور یشرب ''یَرْوِی'' کے معنی کو بھی متضمن ہے اور عبارت یوں ہوگی ''یروی بھا'' یہ معنی اس لئے اچھا اور احسن ہے کہ اگر پینے کے بعد بھی انسان سیراب نہ ہو تو اس چشمے کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ (الثمین)

سوال: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ﴾ میں ''یَضْحَکُوْنَ'' کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: ''یَضْحَکُوْنَ'' کانوا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾ میں ''یَتَغَامَزُوْنَ'' کا معنی کیا ہے؟

جواب: ''یَتَغَامَزُوْنَ'' کا معنی ہے کہ کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف (مسلمانوں کے استہزاء کے لیے) اشارے کرتے۔ (تدبر، الثمین)

سوال: ﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ میں ''فَکِہِیْنَ'' منصوب کیوں ہے؟

جواب: فکھین، انقلبوا کے فاعل کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ میں ''فَکِہِیْنَ'' کی واحد اور معنی ذکر کرتے ہوئے آیت کا

مفہوم بیان کریں۔

جواب: فَكِهِيْنَ فَكِهٌ صفت مشبہ کی جمع ہے۔ فَكِهِيْنَ کا معنی ہے خوش گپیاں کرتے ہوئے، اتراتے ہوئے۔ اس آیت کا مطلب ہے کہ جب مسلمانوں کو مذاق کر کے اور چھیڑ چھاڑ کر کے کافر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاتے تو بہت خوش ہوتے کہ آج ہم نے مسلمانوں کو بہت ذلیل وتنگ کیا۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوْٓا إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ﴾ میں "لضآلون" پر موجود "لام" کو اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟ نیز بتائیں کہ کافر مومنوں کو گمراہ کیوں کہتے تھے؟

جواب: اسے لام مزحلقة للتوكيد کہتے ہیں۔ (اعراب) لام مزحلقہ اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اصلاً یہ لام تاکید اسم پر ہوتا ہے لیکن إِنَّ کی وجہ سے پھسل کر خبر پر آ جاتا ہے۔

کافر مومنوں کو اپنے زعم اور عقیدے کی وجہ سے بھٹکے ہوئے اور گمراہ کہتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ سب کچھ یہی دنیا ہے، آخرت اور جزا و سزا سراسر وہم ہے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر کہتے ہیں دیکھو کیسے احمق ہیں جو آج کی نقد لذتوں کو کل کے خیالی وعدوں پر چھوڑ رہے ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

سوال: ﴿وَمَآ أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ﴾ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کا ذوالحال کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ "قالوا" کی هم ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَمَآ أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ﴾ اس آیت میں ضمیروں کو لوٹا کر مفہوم واضح کریں۔

جواب: اور وہ کافر ان مسلمانوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ﴿وَمَآ أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ﴾ میں أُرْسِلُوْا سے مراد کفار لوگ ہیں، جبکہ عَلَيْهِمْ سے مراد مسلمان لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کفار کے رویے کی مذمت فرما رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو مذاق کرتے ہیں اور انہیں گمراہ ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ مسلمانوں پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے کہ ان کے اعمال پر نکیر کریں۔ (رازی، التبیین، المنیر)

سوال: ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ﴾ اہل جنت، کفار کو دیکھ کر قیامت کے روز کیوں ہنسیں گے؟

جواب: اہل جنت کفار کو دیکھ کر قیامت کے روز اس لیے ہنسیں گے کہ دنیا میں کافر سمجھتے تھے ہم دنیاوی لذتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور یہ پگلے مسلمان ان آسائشوں سے متمتع نہیں ہو رہے اور وہ یہ دیکھ کر ہنستے۔ قیامت کے روز مسلمان دیکھیں گے کہ دنیاوی مصائب کے بدلے اب ابدی نعمتیں ہیں جب کہ یہ کفار ابدی تکلیف میں رہیں گے۔ اس لئے وہ ان پر ہنسیں

گے کہ وہ کفار دنیا کی زندگی میں بیوقوف بنے رہے۔ (رازی، الثمین)

سوال: ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: جملہ ﴿عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ﴾ میں "الذین" مبتدا کی خبر ثانی ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جملہ ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ جملہ مستأنفہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔ یا ایک محذوف قول کا مقولہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو سکتا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ میں "مَا كَانُوا يَفْعَلُون" کا محل اعراب بتائیں۔

جواب: یہ جملہ منصوب بنزع الخافض ہے۔ اصل میں تھا "هل ثوب الكفار مما كانوا يفعلون"۔ (اعراب)

سوال: ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ فعل مجہول کے دو مفعول آ سکتے ہیں؟ اگر آ سکتے ہیں تو ان کی اعرابی حالت کیا ہوگی؟

جواب: فعل مجہول کے دو مفعول آ سکتے ہیں۔ پہلا مفعول نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں اور دوسرا مفعول مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا مثلاً: جُعِلَ زَيْدٌ إِمَامًا۔ (معجم النحو)

سوال: ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ کس کا قول ہے؟

جواب: اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہو۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے پوچھیں گے کیا کفار کو اب ان کے کیے کی جزا مل گئی ہے؟ (رازی، تدبر)

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اہل جنت کا قول ہو۔ اہل جنت آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ (فتح القدیر، اعراب)

ایک قول یہ بھی ہے کہ هل استفہامیہ نہیں بلکہ قد کے معنی میں مؤکدہ ہے۔ اس صورت میں یہ کسی کا قول نہیں ہو گا، صرف اللہ تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ کافروں کو انکے کیے کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا۔ (انوار البیان)

پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار سے استہزاء کرتے ہوئے مسلمانوں سے یہ پوچھیں گے کہ کیا کفار کو ان کی سزا مل گئی؟۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور انکے معانی بتائیں۔

اٰمَنُوا، یَتَغَامَزُون، مَرُّوا، اَجْرَمُوا، رَأَوا، لضالون، ثُوِّبَ۔

جواب: آمَنُوا: باب افعال "اٰمَنَ یُؤمِنُ اِیْمَانًا" سے جمع مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں "أأمَنُوا" تھا۔ دو ہمزے پہلا متحرک دوسرا ساکن ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو دوسرے کو وجوبًا ماقبل کے موافق حرف علت سے بدلا، آمَنُوا ہو گیا۔ مادہ: أ،م،ن۔ معنی: وہ ایمان لائے۔

مَرُّوا: "مَرَّ یَمُرُّ مَرًّا وَمُرُوْرًا" (ن) سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں مرَرُوا تھا۔ مادہ: م،ر،ر۔ معنی: وہ گزرے۔

یَتَغَامَزُون: باب تفاعل تَغَامَزَ یَتَغَامَزُ تَغَامُزًا سے جمع مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: غ،م،ز۔ معنی: آنکھوں سے اشارے کرتے ہیں۔

اَجْرَمُوا: باب افعال اَجْرَمَ یُجْرِمُ اِجْرَامًا سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ج،ر،م۔ معنی: انہوں نے جرم کیا۔

رَأَوا: "رَاٰی یَرٰی رَاْیًا وَرُؤْیَةً" (ف) سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں رَأَیُوا تھا۔ یاء متحرک ماقبل مفتوح، یاء کو الف سے بدلا اور اجتماع ساکنین سے الف کو گرا دیا۔ مادہ: ر،ء،ی۔ معنی: انہوں نے دیکھا۔

ضَآلُّون: "ضَلَّ یَضِلُّ ضَلًّا وَضَلَالَةً" (ض) سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ اصل میں ضالِلُوْن تھا۔ مادہ: ض،ل،ل۔ معنی: گمراہ لوگ۔

ثُوِّبَ: باب تفعیل "ثَوَّبَ یُثَوِّبُ تَثْوِیْبًا" سے واحد مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔ مادہ: ث،و،ب۔ معنی: اس کو بدلا دیا گیا۔

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝١ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٢ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝٣ وَاَلْقَتْ مَا
فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝٤ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٥ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا
فَمُلٰقِيْهِ ۝٦ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝٧ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝٨
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝٩ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُوْا
ثُبُوْرًا ۝١١ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝١٢ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝١٣ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝١٤ بَلٰۤى
اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝١٥ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝١٦ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝١٧ وَالْقَمَرِ اِذَا
اتَّسَقَ ۝١٨ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝١٩ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٢٠ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ
الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝٢١ سجدہ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝٢٢ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝٢٣
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٢٤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُوْنٍ ۝٢٥

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: سورۃ مطففین اور انشقاق میں نہایت واضح مشابہت موجود ہے۔ دونوں سورتوں میں قدر مشترک یہ ہے، کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں کہ جو چاہے انسان کرتا پھرے، بلکہ ایک دن آنے والا ہے جس میں ہر نفس کو اس کے کیے کی جزا مل جائے گی۔ روزِ قیامت لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ پہلے خوش قسمت جو ہمیشہ جنت میں ہوں گے اور دوسرے بد بخت جو جہنم میں داخل ہوں گے۔

نیز سورۃ التکویر اور الانفطار میں مقدمات قیامت کا تذکرہ ہے۔ سورۃ مطففین میں قیامت کے احوال اور لوگوں کے دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا تذکرہ ہے، جب کہ سورت انشقاق میں تینوں سورتوں کے مضمون کی جامعیت پائی جا رہی ہے۔ اس میں مقدمات قیامت، روز قیامت کے خوفناک احوال اور آخر میں لوگوں کے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال

میں تقسیم ہونے کا تذکرہ ہے۔(المنیر ،روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع احوالِ قیامت کا بیان اور انسانی عقیدے کی اصلاح ہے۔شروع میں احوال قیامت کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد انسان کی اپنے رب سے ملاقات کی یقین دہانی ہے، پھر اس روز انسانوں کی جزا کا تذکرہ ہے کہ نیکو کار لوگوں کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں اور دنیا میں لا پرواہی کی زندگی گزارنے والوں کا نامہ اعمال پشتوں کے پیچھے ہوگا۔ پھر کائنات کے بعض آثار کو اس بات پر بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ انسان لمحہ بہ لمحہ اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخر میں مکذبین قرآن کے لیے وعید اور مومنین کے لیے اجر عظیم کی بشارت ہے۔(تدبر،المنیر ،تفہیم)

سوال: ﴿وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ﴾ میں ''اَذِنَتۡ'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: أَذِنَ يَأۡذَنُ (ع) سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔أَذِنَ لَه:استمع له یعنی توجہ سے سننا۔(التحریر،لسان)

سوال: ﴿وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ﴾ کا معنی ومفہوم بیان کریں۔

جواب: آسمان اللہ کی طرف کان لگائے گا اور اسے ایسا ہی کرنا واجب ہے(یہی اس کے لائق ہے)۔

''أَذِنَتۡ لِرَبِّهَا'' سے مراد ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا۔اس کے حکم کے لیے مطیع ہو جائے گا۔''حقّت'' کا صلہ جب لام ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس پر واجب ہے، لازم ہے۔یعنی اس کے لیے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرنا ہی واجب وحق ہے اصل عبارت یوں ہوگی ''أَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ لها إطاعته''۔(تدبر،تفہیم،رازی)

''حُقَّتۡ:وهي حقيقة بأن تنقاد ولا تمتنع'' یعنی اس کے لائق ہی یہ ہے کہ وہ حکم الٰہی کی اطاعت کرے، اطاعت کے انکار کی جرأت ہی نہیں ہے۔(کشاف)

سوال: ﴿وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: (۱)زمین پر موجود پہاڑ اور ٹیلوں وغیرہ کو ختم کر کے اسکو بالکل برابر کر دیا جائے گا اور یہ چٹیل میدان کی طرح ہو جائے گی جیسا کہ دوسرے مقام پر یوں فرمایا:﴿وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡجِبَالِ فَقُلۡ يَنۡسِفُهَا رَبِّيۡ نَسۡفًا۝فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفۡصَفًا۝لَّا تَرٰى فِيۡهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا﴾۔(طٰہٰ:۱۰۵۔۱۰۷)(ترجمہ:وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں،آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار ان کو مکمل اڑا دے گا، پھر زمین کو چٹیل میدان چھوڑ رکھے گا کہ اس میں آپ نہ کوئی ناہمواری دیکھیں گے اور نہ کوئی بلندی)

(۲)زمین کی سلوٹوں کو ختم کر کے اسکو مزید وسیع اور کشادہ کر دیا جائے گا۔(التحریر،روح)

سوال: پہلی پانچ آیات میں شرط پائی گئی ہے اس کی جزا کیا ہے؟

جواب: ان پانچ آیات کی جزا یا تو یہ محذوف نکالیں گے کہ "علمت النفوس أعمالها" یا بعد میں آرہی ہے یعنی "فملاقیه" (اعراب، انوار)

سوال: ﴿يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ میں "الإنسانُ" پر رفع کیوں ہے؟ نیز اس آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: "الإنسانُ" أيُّ سے بدل، عطف بیان یا صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ أيُّ مبنی بر ضمہ ہے۔

ترجمہ: اے انسان! بے شک تو سخت مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جارہا ہے پس اس سے روبرو ملنے والا ہے۔

سوال: ﴿يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بتائیں کہ یہ کونسی مشقت ہے؟ اور انسان کب تک اسے برداشت کرتا ہے؟

جواب: اس کا مطلب ہے کہ انسان تو زندگی بھر کسی نہ کسی کام کی مشقت برداشت کرتے ہوئے آخر کار اچھے یا برے اعمال لے کر اپنے رب کے حضور پیش ہونے والا ہے اور انسان ہر طرح کے سخت، آسان، مرض، صحت، تنگدستی اور مشقت کے حالات میں اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دنیا ہر حالت میں گزر ہی جائے گی۔ پھر آخر کار موت کے بعد قیامت کے دن اسے اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔ دنیا میں کام اور اعمال کی مشقت انسان پیدائش سے لے کر موت تک کرتا ہے۔ (رازی، تدبر)

سوال: مندرجہ ذیل کے معانی بتائیں۔

مُدَّتْ، تَخَلَّتْ، كَدْح۔

جواب: مدّت: اس کو پھیلا دیا گیا۔

تخلّت: وہ خالی ہوگئی۔ (یعنی وہ اندر سے خالی ہو جائے گی اور اسکی اوپر والی سطح بھر جائے گی)

كدْح: مشقت اٹھانا، کوشش کرنا۔ (مفردات)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور انکے معانی بھی بتائیں۔

انشقت، حقّت، مدّت، ألقت، تخلّت، ملقیه۔

جواب: انشقت: باب انفعال "اِنْشَقَّ يَنْشَقُّ اِنْشِقَاقًا" سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ش، ق، ق۔

معنی: وہ پھٹ گئی۔

حقّت: ''حَقَّ یَحِقُّ حَقًّا'' (ض) سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ اصل میں ''حُقِقَتْ'' تھا۔ مادہ: ح، ق، ق۔ معنی: اسکا یہی حق ہے، اسکے لئے یہی واجب ہے۔

مدّت: ''مَدَّ یَمُدُّ مَدًّا'' (ن) سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ مادہ: م، د، د۔ معنی: وہ پھیلا دی جائے گی۔

ألقت: باب افعال ''اَلْقٰی یُلْقِی اِلْقَاءً'' سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں ''أَلْقَيَتْ'' تھا۔ مادہ: ل، ق، ی۔ معنی: اس نے پھینک دیا۔

تخلّت: بابِ تفعُّل ''تَخَلّٰی یَتَخَلّٰی تَخَلِّیًا'' سے واحد مؤنث غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں ''تَخَلَّوَتْ'' تھا۔ مادہ: خ، ل، و۔ معنی: وہ خالی ہوگئی۔

ملاقيه: باب مفاعلہ ''لَاقٰی یُلَاقِی مُلَاقَاةً وَلِقَاءً'' سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ اصل میں مُلَاقِیٌ تھا۔ مادہ: ل، ق، ی۔ معنی: وہ ملنے والا ہے۔

سوال: ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ﴾ میں ''اُوتِیَ'' صیغہ بتائیں اور اس کا نائب الفاعل ذکر کریں۔

جواب: اُوتِیَ: باب افعال ''اٰتٰی یُؤْتِیْ'' سے واحد مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔ اصل میں ''اُءْتِیَ'' تھا۔ مادہ: أ، ت، ی۔ ''اُوتی'' کی ھُوَ ضمیر نائب الفاعل ہے۔

سوال: ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا﴾ کی روشنی میں وضاحت کریں کہ ''حِسَابًا یَّسِیْرًا'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''حِسَابًا یَّسِیْرًا'' سے مراد ہے کہ جب انسان کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو انسان کی چھوٹی موٹی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ علیحدگی میں بندے کو اس کے اعمال سیئہ یاد دلائیں گے تو بندہ ان کا اقرار کرے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''قد سترتها عليك في الدنيا وأنا أغفرها لك اليوم'' (یقیناً میں نے ان کو دنیا میں بھی چھپائے رکھا اور آج میں ان کو تیرے لئے معاف کردوں گا) (بخاری: ۲۴۴۱، مسلم: ۷۰۱۵) یہی حساب یسیر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''من نوقش الحساب فقد هلك'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو اعمال کی پیشی کے وقت ہے ''ولكن من نوقش الحساب فقد هلك'' (جس کے حساب کا مناقشہ کیا گیا تو یقیناً وہ ہلاک ہوگیا) (بخاری: ۱۰۳، مسلم: ۷۲۲۵) (رازی، تفہیم، الثمین)

سوال: ﴿وَیَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جملہ ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ محل جزم میں ہے کیونکہ اس کا عطف پچھلے جملے "فسوف یحاسب" پر ہے۔ وہ جواب شرط ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔

سوال: ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ میں "مَسْرُوْرًا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "مَسْرُوْرًا" "ینقلب" کی ھو ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ اس جامع اسلوب کے مضمرات بیان کریں۔

جواب: یہ جامع اسلوب کئی باتوں کو متضمن ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ انکو اور انکے مؤمن اہل وعیال کو ان کے ساتھ جنت میں داخل کردے گا۔ اگرچہ اہل وعیال اس بلند درجہ کے مستحق نہ بھی ہوں۔

(۲) یہ جنتی لوگ دنیا میں اپنے اہل وعیال میں عاقبت اندیشی کی فکر کو جلا بخشتے رہے اور ان کی اخروی کامیابیوں سے غافل نہیں ہوئے۔

(۳) جو شخص بھی اپنے خانوادہ سے حقیقی محبت کا دعویدار ہے اس کی محبت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ان کی آخرت کا خود بھی فکر مند رہے اور ان کو بھی وقتاً فوقتاً وعظ ونصیحت کرتا رہے۔ (تدبر، مفہوما)

سوال: ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ "أَهْلِه" سے کون سے اہل وعیال مراد ہیں؟ نیز بتائیں کیا جنت میں بھی دنیا والے اہل وعیال ساتھ ہوں گے؟

جواب: اس آیت میں "أَهْلِه" سے مراد حور عین بھی ہیں اور انسان کے دنیا والے مؤمن اہل وعیال بھی ہیں۔ اس کی تائید سورت طور کی آیت نمبر ۲۱ سے بھی ہوتی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾۔ (ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے کسی بھی درجے کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے)

سوال: کیا ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ...﴾ کے منافی تو نہیں؟

جواب: ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ...﴾ کی حالت دوران امتحان کی ہے اور ﴿وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ کی حالت رزلٹ کے بعد کی ہے۔

سوال: ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ "أَمَّا" کس معنی میں ہے؟ نیز بتائیں "وراء ظهره" منصوب کیوں ہے؟

جواب: أَمَّا یہاں تفصیلیہ ہے، کیونکہ جہاں بھی أَمَّا مکرر آیا ہے وہاں تفصیل کا معنی ادا کرتا ہے۔ (دراسات)

''وراء ظهره'' ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ میں دائیں ہاتھ کا ذکر ہے اس کے بالمقابل ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ میں بائیں ہاتھ کا ذکر نہیں بلکہ ''وَرَآءَ ظَهْرِهٖ'' کہا گیا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: سورۃ الحاقۃ میں وضاحت ہے ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ﴾ (الحاقۃ: ۲۵) (ترجمہ: اور رہا وہ جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں تھمادیا گیا تو وہ کہے گا: اے کاش مجھے میرا نامہ اعمال نہ دیا جاتا) اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قیامت کے روز مجرم بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال نہ ملنے کی تمنا کریں گے۔ اسی تمنا کے پیش نظر وہ اپنے ہاتھ پشتوں کے پیچھے کریں گے تاکہ ان کو نامہ اعمال نہ ملے لیکن اس روز جزا سے کوئی نہ بچ سکے گا اور اسی حالت میں نامہ اعمال ان کے پیچھے سے دے دیا جائے گا۔ (تفہیم، تدبر)

شیخ صالح العثیمین رحمہ اللہ نے اس کی ایک اور شاندار توجیہ کی ہے کہ مجرمین کو نامہ اعمال اس لئے پشتوں کے پیچھے دیا جائے گا کیونکہ انہوں نے دنیا میں کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ان کی کرتوتوں کے عین موافق ان کو مزید شرمندہ کرنے کے لیے ان کا نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا۔ (العثیمین)

سوال: ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟ نیز ثُبُوْرًا صیغہ اور معنی بتائیں۔

جواب: جملہ ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا﴾ محل جزم میں ہے کیونکہ یہ جواب شرط ہے اور اس پر فا داخل ہے۔

ثُبُوْرًا: ثَبَرَ يَثْبُرُ ثَبْرًا (ن) سے اسم ہے۔ مادہ: ث، ب، ر۔ معنی: ہلاکت و بربادی۔

سوال: ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سے مراد وہ بدبخت ہیں جو دنیا میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے رہے اور اللہ کے فرائض کی ادائیگی میں ان کی عیش وعشرت آڑے آجاتی تھی۔ ان کو خوشی میں روز جزا کا خیال نہ رہتا تھا۔ صرف اپنی اور اہل وعیال کی خوشی کی فکر تھی۔ (رازی)

سوال: ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ ''يَدْعُوْا ثُبُوْرًا'' اور ''وَيَصْلٰى سَعِيْرًا'' کے لیے تعلیل کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ یعنی یہ جملہ معلّلہ ہے۔

سوال: ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ ''ظَنَّ'' دو مفعول چاہتا ہے اس آیت میں دو مفعولوں کی نشاندہی کریں۔

جواب: "ظَنَّ" کے بعد أنْ مخففہ من المثقلۃ استعمال ہوا ہے۔أنْ مخففة من المثقلة کے بعد والا جملہ مبتدا اور خبر ہوتا ہے اس لئے أَنْ اپنے بعد والے جملے کے ساتھ مل کر سدّ مسدّ مفعولین ہوتا ہے (دو مفعول کے قائم مقام)۔

سوال: ﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ "ظَنَّ" کے بعد "أن" مخففة من المثقلة ہے۔اس کا اسم کون سا ہے؟

جواب: جب "أن" مخففة من المثقلة استعمال ہوتو اس کا اسم محذوف ضمیر ہوتا ہے (معجم النحو والصرف) یعنی "أنه لن يحور" جیسے سورۃ طہ میں ہے ﴿أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا﴾ (طہ:۸۹) (کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ وہ نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے) یعنی أنّه لا يرجع إليهم، اسی طرح سورۃ مزمل میں ہے:﴿عَلِمَ أَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى﴾ (مزمل:۲۰) (اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میں سے بعض بیمار ہوں گے) اصلاً یہ "علم أنه سيكون" ہے۔

سوال: ﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ يَحُور کا معنی ذکر کریں۔

جواب: الرجوع عن الشيئ والى الشيئ: کسی چیز سے لوٹنا اور کسی چیز کی طرف لوٹنا۔عرب میں ایک مثل مشہور ہے: حار بعد ما كار: گھومنے کے بعد لوٹا۔ (لسان) جیسا کہ نبی ﷺ کی سفر کی دعا میں ہے: " اللهم ! إني أعوذ بك من وعثاء السفر، وكآبة المنقلب، والحور بعد الكور، ودعوة المظلوم، وسوء المنظر في الاهل والمال " (اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں سفر کی مشقت سے اور حزن وملال، برے حالات اور فراوانی کے بعد کمی اور نقصان سے اور مظلوم کی بد دعا اور اہل ومال میں ناپسندیدہ مناظر سے) (ابن ماجہ:۳۸۸۸، صحیح)

سوال: ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ، وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾ میں "شفق" اور "وما وسق" کا صیغہ اور مفہوم واضح کریں۔

جواب: شفق سے مراد سورج غروب ہونے کے بعد باقی رہنے والی سرخی ہے جو کہ رات کی تمہید ہوتی ہے۔وسق: وَسَقَ يَسِقُ (ض) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔مادہ: و،س،ق۔معنی: اس نے جمع کیا۔"ما وسق" سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو رات سمیٹ لیتی ہے یعنی جس چیز پر رات کی تاریکی چھا جائے گی وہ "ما وسق" میں داخل ہوگی۔ (رازی، تدبر)

سوال: ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ○ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ○ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ﴾ مذکورہ چیزوں کی قسم اٹھانے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: "الشَّفَقِ، وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ، وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ" کی قسم اٹھانے میں ایک لطیف حکمت پوشیدہ ہے۔انسان کو قسم اٹھا کر ان چیزوں پر غور کر کے اپنی اصلاح کی دعوت دی جا رہی ہے۔دیکھو کس طرح سورج دن بھر سفر کے بعد غروب ہو جاتا ہے، پھر شفق آتی ہے، وہ بھی غائب ہو جاتی ہے تو رات چھا جاتی ہے۔اسی طرح رات میں چاند کیسے آہستہ آہستہ

طلوع ہوتا ہے اور پھر کئی راتوں تک بڑا ہوتا رہتا ہے۔ آخر کار چھوٹا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کے تغیر کی قسم اٹھا کر انسان کو ایک عظیم پیغام دیا جا رہا ہے کہ اے انسان! تو بھی ہمیشہ دنیا میں نہیں رہے گا بلکہ بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے قبر، قبر سے نئی زندگی، پھر میدان حشر اور پھر حساب کتاب کے بعد جزا وسزا کا مرحلہ ہوگا۔ اس لئے دنیا پر بھروسہ چھوڑ کر رب کا مطیع ہو جا اور آخرت کی تیاری کے لیے کمر بستہ ہو جا۔ (تفہیم، تدبر، رازی)

سوال: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ میں "عَنْ طَبَقٍ" کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "عَنْ طَبَقٍ" "طَبَقًا" کی محذوف صفت کے متعلق ہے۔ یعنی "لتركبنّ طبقاً كائناً عن طبقٍ" یہاں عنْ، بَعْدُ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات "عن" "بَعْدُ" کے معنی میں آجاتا ہے۔

سوال: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں اور بتائیں اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: تم بھی لازماً ایک حالت سے دوسری حالت کو چڑھتے جاؤ گے۔

﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ سے مراد ہے کہ ایک حال یا مرحلے سے دوسرے حال یا مرحلے کی طرف گرتے چلے جانا۔ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ کس طرح انسان بچپن، جوانی، بڑھاپے، موت، قبر، نئی زندگی، میدان حشر، حساب اور جزا کا مرحلہ طے کرے گا۔ ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ دنیا ہمیشہ تغیر پذیر ہے۔ (تفہیم، رازی)

سوال: ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ میں "فا" کون سی ہے؟

جواب: "فَمَا لَهُمْ" میں "فا" جزائیہ ہے۔ اس سے پہلے جملہ شرطیہ محذوف ہے۔ "إذا كان هذا أمرهم يوم القيامة فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ"

سوال: ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾ کیا سورت انشقاق کا سجدہ تلاوت عزائم السجود میں سے ہے؟ بالدلیل بیان کریں۔

جواب: سورت انشقاق کا سجدہ تلاوت عزائم السجود میں سے ہے۔ اس کے کئی دلائل ہیں۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت ہے کہ انہوں نے نماز میں یہ سورت تلاوت فرمائی اور سجدہ کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر سجدہ کیا ہے۔ (مسلم: ۱۲۹۹، نسائی فی الکبریٰ: ۱۱۸۹۶) (مزید تفصیل کے لیے تفہیم، رازی)

سوال: کیا جب بھی قرآن کا کوئی حصہ تلاوت کیا جائے تو سن کر سجدہ کرنا ضروری ہے؟ نیز کیا یہاں کفار کی مذمت سجدہ نہ

کرنے کی وجہ سے بیان کی ہے؟ اس کی وضاحت کریں۔

جواب: ﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَیۡہِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا یَسۡجُدُوۡنَ﴾ اس آیت سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ قرآن کی کوئی بھی آیت سن کر سجدہ کرنا ضروری ہے بلکہ اس کا خاص پس منظر ہے۔ اس وقت عرب معاشرے میں رواج تھا کہ وہ لوگ کسی بات کی عظمت ورفعت اور صداقت کا اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ مثلاً مشہور شاعر لبید کے ایک غیر معمولی شعر پر تمام شعراء سجدہ میں گر پڑے تھے۔

اس آیت میں اس وقت کے لوگوں کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ قرآن کریم اپنی فصاحت وبلاغت اور صداقت میں ہر قسم کی شاعری اور کلام سے انتہائی بلند مرتبہ ہے۔ پھر اسے سن کر تم اپنے رب کے حضور کیوں نہیں جھک جاتے؟ واللہ اعلم۔ (تدبر)

سوال: سجدہ تلاوت کا حکم بیان کرتے ہوئے بتائیں کیا ﴿فَمَا لَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ۝وَاِذَا قُرِئَ عَلَیۡہِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا یَسۡجُدُوۡنَ﴾ سے سجدہ تلاوت کے وجوب پر استدلال ہوسکتا ہے؟

جواب: بعض علماء اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ سجدہ تلاوت واجب ہے، کیونکہ کفار کی سجدہ نہ کرنے پر مذمت کی گئی ہے اور مذمت ترکِ واجب پر ہی کی جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی سجدہ تلاوت واجب ہے لیکن یہ قول مرجوح ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ سجدہ تلاوت سنتِ مؤکدہ ہے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں سورۃ النحل تلاوت کی اور آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا، پھر آئندہ جمعہ میں سورۃ النحل کی آیتِ سجدہ پر سجدہ نہیں کیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا ہاں اگر ہم خود کرنا چاہیں تو کرلیں۔'' (بخاری: ۱۰۷۷)

''فَعَلَیۡکُمۡ بِسُنَّتِیۡ وَسُنَّۃِ الۡخُلَفَاءِ الۡمَھۡدِیِّیۡنَ الرَّاشِدِیۡنَ'' (پس میرے طریقے اور ہدایت یافتہ خوش بخت خلفاء کے طریقے کو مضبوطی سے تھامو) (ابوداؤد: ۴۶۰۹، صحیح) کی روشنی میں سجود تلاوت فرض نہیں ہیں۔ (الثمین، رازی)

سوال: ﴿وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُوۡعُوۡنَ﴾ میں ''یُوۡعُوۡنَ'' کا محل اعراب بتائیں۔

جواب: ''یُوۡعُوۡنَ'' کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ ما موصول کا صلہ ہے۔

سوال: ﴿وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُوۡعُوۡنَ﴾ میں ''بِمَا یُوۡعُوۡنَ'' سے کون سی چیزیں مراد ہے؟

جواب: ''بِمَا یُوۡعُوۡنَ'' سے ان لوگوں کے اعمال بھی مراد ہوسکتے ہیں اور ان کے سینے میں چھپی عداوتِ دین اور مال وغیرہ جمع کرنا بھی مقصود ہوسکتا ہے۔ (تدبر، تفہیم، المنیر)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ﴾ میں استثناء کون سا ہے؟ اور ''غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ''

مرفوع کیوں ہے؟

جواب: سابقہ کلام میں کفار کا تذکرہ ہے کفر اور ایمان دونوں باہم الگ اجناس ہیں، اس لئے یہ استثناء منقطع ہے۔

"غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "اَجْرٌ" کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ میں "مَمْنُوْنٍ" کا معنی اور صیغہ بتلائیں۔

جواب: مَمْنُوْنٍ "مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا" (ن) سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔ مادہ: م، ن، ن۔ یہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں یہ "کم ہونے اور ختم ہونے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کے معانی لکھیں۔

ثبورا، یصلی، سعیراً، وسق، اتّسق، طبق، غیر ممنون۔

جواب: ثبورا: بڑی ہلاکت۔ یصلی: وہ جلے گا، وہ داخل ہوگا۔ سعیراً: بڑھکتی ہوئی آگ۔ یحور: وہ پلٹے گا۔ وسق: اس نے سمیٹا، جمع کیا۔ اتّسق: وہ پورا ہوا، مکمل ہوا۔ طبق: حالت، درجہ، منزل۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور ان کے معانی لکھیں۔

یدعو، یصلی، یحور، اتّسق، یُوعُون۔

جواب: یدعو: "دَعَا يَدْعُو دَعْوًا وَدَعْوَةً" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں "يَدْعُوُ" تھا۔ مادہ: د، ع، و۔ معنی: وہ پکارتا ہے۔

یصلی: "صَلِيَ يَصْلٰى صَلْيًا" (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں "يَصْلَيُ" تھا۔ مادہ: ص، ل، ی۔ معنی: وہ جلے گا، وہ داخل ہوگا۔

یحور: "حَارَ يَحُوْرُ حَوْرًا" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں "يَحْوُرُ" تھا۔ مادہ: ح، و، ر۔ معنی: وہ واپس لوٹے گا۔

اتّسق: باب افتعال "اِتَّسَقَ يَتَّسِقُ اِتِّسَاقًا" سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں "اِوْتَسَقَ" تھا۔ مادہ و، س، ق۔ معنی: وہ پورا ہوگیا۔

یُوعُون: باب افعال "اَوْعٰى يُوْعِيْ اِيْعَاءً" سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں "يُوْعِيُوْنَ" تھا۔ مادہ: و، ع، ی۔ معنی: وہ جمع کررہے ہیں۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ③ قُتِلَ اَصْحٰبُ
الْاُخْدُوْدِ ④ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ⑤ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ⑥ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ
بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ⑦ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ⑧ الَّذِيْ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑨ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ
الْحَرِيْقِ ⑩ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ⑪ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ⑬
وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ⑭ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ⑮ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ⑯ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ
الْجُنُوْدِ ⑰ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ⑱ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ⑲ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ
مُّحِيْطٌ ⑳ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ㉑ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ㉒

سوال: اس سورت کی گزشتہ سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: دونوں سورتوں میں مومنین کے لیے خوشخبری اور کافروں کے لیے وعید کا تذکرہ ہے اور دونوں سورتوں میں قرآن کی عظمت واہمیت کا اظہار ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا شان نزول اور دورِ نزول کیا ہے؟

جواب: جب مکہ مکرمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ابتدائی طور پر کچھ لوگ ایمان لائے تو ان کو بہت تنگ کیا جاتا تھا اور طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ مومنین کو اصحاب الاخدود کا قصہ سنا کر تسلی دی جارہی ہے کہ اہل حق پر ہر دور میں ظلم ہوتا رہا ہے، اس لئے تم صبر واستقامت کے ساتھ حق پر ڈٹے رہو، آخر کار فتح تمہاری ہوگی۔ یہ کافر لوگ تمہارے رب کی پکڑ سے بچ نہ سکیں گے۔

اس سورت کا دورِ نزول ابتدائی دورِ نبوت ہے جب چند لوگ مسلمان ہوئے تھے اور ان پر مختلف قسم کی سختیاں ہو رہی تھیں۔ (تدبر، تفہیم، المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع مومنین کو تکالیف برداشت کرنے پر خوشخبری و تسلی دینا اور ظالموں کی مذمت کرنا ہے۔ ابتدا میں اصحاب الاخدود کا تذکرہ ہے۔ پھر اس چیز کا تذکرہ ہے کہ اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ کیوں ڈھائے گئے۔ پھر مومنین کی اچھی جزا اور ظالمین کی بری جزا کا تذکرہ ہے۔ پھر قدیم قوموں کا تذکرہ ہے۔ اور ساتھ اللہ کی پکڑ کا بیان ہے۔ آخر میں قرآن کی رفعت و حفاظت کی وضاحت ہے۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ میں "ذَاتِ الْبُرُوْجِ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس بارے میں مفسرین سے بہت سے اقوال منقول ہیں، کسی قول کی تائید مرفوع حدیث سے نہیں ہوتی۔ اس لئے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ذَاتِ الْبُرُوْجِ" سے مراد ستاروں کا عظیم مجموعہ ہے اور ماہرین فلکیات کے ہاں بروج کی تعداد بارہ ہے۔ ویسے بھی "بروج" کا معنی علو، بیان اور ظہور ہے۔ (الثمین، تفہیم)

سوال: ﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سے مراد قیامت کا دن ہے، جس کا جزا و سزا کے لئے وعدہ کیا گیا ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: عن أبي هريرة مرفوعاً: اليوم الموعود يوم القيامة، و اليوم المشهود يوم عرفة، و الشاهد يوم الجمعة۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ "اليوم الموعود" سے مراد روزِ قیامت، "اليوم المشهود" سے مراد عرفہ کا دن اور "الشاهد" سے مراد جمعہ کا روز ہے۔ (السلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: ۱۵۰۲)

سوال: پہلی تین آیات میں قسموں کو کس چیز پر بطور استشہاد لایا گیا ہے؟

جواب: پہلی تین آیات میں قسم اس بات کی شہادت دینے کے لیے ہے کہ جو لوگ کمزور اہل ایمان پر ظلم ڈھا رہے ہیں ان کو اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اللہ جو عظیم آسمان، ستاروں اور روزِ قیامت کا مالک ہے، اس کے لئے ناممکن نہیں کہ تم کو تمہاری غلطیوں پر فوراً پکڑ لے، اس لئے اس کی پکڑ سے ڈر کر اپنی کرتوتوں سے باز آ جاؤ۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: پہلی تین آیات کا جواب قسم کیا ہے؟

جواب: جواب قسم کے بارے مختلف اقوال ہیں لیکن راجح یہ ہے کہ یہاں جواب قسم محذوف ہے اور اس کی طرف فوراً ذہن مائل ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے "إن یوم القیامة لآتٍ" "قیامت کا دن آنا ضروری اور یقینی ہے" (تدبر)

سوال: ﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ﴾ یہ عبارت میں کیا واقع ہو رہا ہے؟ نیز بتائیں "اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ" سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: ﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ﴾ یہ جملہ دعائیہ بھی ہوسکتا ہے کہ جلانے والے ہلاک ہو جائیں اور خبر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصحاب الاخدود کو قتل کیا گیا۔ لیکن بددعا کے معنی میں زیادہ واضح ہے کیونکہ اصحاب الاخدود وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقوں میں آگ بھڑکائی تھی۔ (الثمین، رازی)

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رومی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کوئی لڑکا ایسا مامور کردے جو مجھ سے یہ جادو سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی ملنے لگا۔ اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا۔ حتی کہ اس کی تربیت سے صاحب کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا تو توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر ثابت نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمع عام میں باسم رب ھذا الغلام کہہ کر مجھے تیر مار میں مر جاؤں گا چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے سے بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے ان میں آگ بھروائی اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھنکوا دیا۔ (مسلم: ۷۵۱۱)

طوالت کے خوف سے ہم نے اس واقعہ کو بالاختصار بیان کیا ہے۔ اس سے فراعنہ قریش مراد لینا درست نہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت اور تصریح کے بعد کوئی اور تفسیر کرنا اہل علم کے ہاں خیر کی راہ نہیں۔ اور یہ واقعہ ماضی کے تناظر میں بیان ہوا ہے۔ ﴿اِذۡ ھُمۡ عَلَیۡھَا قُعُوۡدٌ﴾ قریش نے نہ تو کسی کو زندہ جلایا اور نہ ہی وہ کسی گڑھے کے گرد جمع ہوئے۔

سوال: ﴿اِذۡ ھُمۡ عَلَیۡھَا قُعُوۡدٌ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ قاتلین یا مقتولین؟

جواب: ﴿اِذۡ ھُمۡ عَلَیۡھَا قُعُوۡدٌ﴾ سے مراد آگ جلانے والے لوگ ہیں، جنہوں نے لوگوں کو خندق میں پھینکا تھا اور پھر

بیٹھ کران کے جلنے کا نظارہ کررہے تھے۔ (الثمین ، رازی) اگرچہ بعض مفسرین کے ہاں مقتولین مراد ہیں جن کو آگ میں پھینکنے کے لئے خندق کے کنارے پر بٹھایا گیا تھا۔ لیکن سیاق کلام سے پہلا مؤقف راجح معلوم ہوتا ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں:

الموعود. الأخدود. الوقود۔

جواب: الموعود: جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الأخدود: خندق۔ الوقود: ایندھن۔

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد اور جمع لکھیں:

الأخدود. مشهود. قعود. شهود۔

جواب: الأخدود جمعه أخاديد۔ مشهود: جمعه مشهودون۔ قعود: مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اسم بھی۔ اگر اسم ہوتو قاعد کی جمع ہے۔ شهود: واحده شاهد۔

سوال: مندرجہ ذیل کا وجہ اعراب ذکر کریں۔

ذاتِ البروج. اليوم. الموعود. مشهود۔ نیز بتائیں کہ النار. أخدود سے کون سا بدل ہے؟

جواب: ذاتِ البروج: یہ "السماء" کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

اليوم: اس کا عطف "السماء" پر ہے۔

الموعود: یہ "اليوم" کی صفت ہے۔

مشهود: اس کا عطف بھی "السماء" پر ہے۔

النار: یہ "أخدود" سے بدل اشتمال ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب کیا ہے؟

قتل أصحٰب الأخدود. إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ. هم عليها قعود. يفعلون بالمؤمنين. ما يفعلون بالمؤمنين۔

جواب: قتل أصحٰب الأخدود: لا محل له من الاعراب کیونکہ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ: "قُتِلَ" سے ظرف ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

هم عليها قعود: "اذ" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

يفعلون بالمؤمنين: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اسم موصول کا صلہ ہے۔

مایفعلون: علیٰ کا مجرور ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے مع التعلیل بتائیں۔

موعود، وقود، شهود۔

جواب: **موعود**: ''وَعَدَ يَعِدُ وَعْدًا وَعِدَةً'' (ض) سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔ مادہ: و، ع، د۔ معنیٰ: جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

وقود: ''وَقَدَ يَقِدُ وَقْدًا وَوُقُوْدًا وَقِدَةً'' (ض) سے اسم ہے۔ مادہ: و، ق، د۔ معنیٰ: ایندھن۔ واضح رہے کہ اس باب سے مصدر بھی بضم الواو (الوُقُود: آگ جلنا، سلگنا) آتا ہے۔

شهود: ''شَهِدَ يَشْهَدُ شَهَادَةً'' (ع) سے شاهد اسم فاعل کی جمع ہے۔ مادہ: ش، ہ، د۔ معنیٰ: گواہ۔

سوال: ''قعود'' اور ''جلوس'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: ''قعود'' لمبے عرصے تک بیٹھنے کو کہتے ہیں اور ''جلوس'' مطلق بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ مدت کم ہو یا زیادہ۔ (انوار)

سوال: ﴿وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ﴾ میں واؤ کس معنیٰ میں ہے؟

جواب: جملہ ''وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ'' میں واؤ حالیہ بھی ہو سکتی ہے اور عاطفہ بھی۔ عطف کی صورت میں ''هم عليها قعود'' پر عطف ہوگا۔ (انوار، اعراب) اور واؤ حالیہ کی صورت میں ''قعود'' سے حال ہوگا۔

سوال: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ﴾ میں ''ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا'' سے کون سا اہم مسئلہ ثابت ہو رہا ہے؟

جواب: ''ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا'' سے ثابت ہو رہا ہے کہ جو بھی گناہ کبیرہ وصغیرہ کا مرتکب اللہ سے توبہ کر لے تو اس کی معافی ہو جائے گی۔ (رازی، المنیر)

سوال: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ﴾ میں ''عذاب جهنم'' عموم کے بعد ''عذاب الحريق'' خاص لانے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: ''عذاب جهنم'' عمومی عذاب ہے جس میں ہر طرح کا عذاب ہوگا اور ''عذاب الحريق'' جلنے کا سب سے سخت عذاب ہوگا اور یہاں ''عذاب جهنم'' کے بعد ''عذاب الحريق'' ان کے فعل کے موافق سزا ہوگی جو انہوں نے مومنین کو سزا دی تھی۔ (تدبر، المنیر، تفہیم)

سوال: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ میں ''فتن'' کا لغوی معنیٰ کیا ہے؟

جواب: "فتن" کا لغوی معنی سونے کو آگ میں ڈال کر کھوٹا کھرا جانچنا، آزمائش کرنا وغیرہ (انوار البیان)۔ تکلیف میں ڈالنا مفہومی معنی ہے۔

سوال: ﴿إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ○ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ . . .﴾ أصحاب الجنة اور أصحاب الجحیم کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کیوں بیان کی ہیں؟

جواب: کفار کی سزا اور مومنین کی اچھی جزا بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان کر کے مذکورہ بالا سزا و جزا کو مزید مؤکد کر دیا ہے کہ اس عظیم اللہ کے لیے کفار کو سزا دینا اور مومنین کو جزا دینا کوئی مشکل نہیں۔ (تدبر، المنیر)

سوال: مندرجہ ذیل کے معانی بتائیں:

نقموا ،الحریق، بطش، یبدئُ۔

جواب: نقموا: بدلہ دینا، سزا دینا، ملامت کرنا، ناپسند کرنا، مجرم گردانا۔

الحریق: جلنے والی آگ یا جلانے والی آگ۔ بطش: پکڑ۔ یبدئُ: وہ پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل واحد کی جمع اور جمع کی واحد لکھیں۔

الأرض، شهید، شیء، الأنهر، شدید۔

جواب: الأرض جمعه أرضون و أراضٍ۔ شهید جمعه شهداء۔ شیء جمعه أشیاء۔ الأنهار واحده النهر۔ شدید جمعه أشداء۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

"أن یؤمنوا" یہ منصوب ہے۔ کیا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے یا مفعول لاجلہ ہونے کی وجہ سے یا استثناء کی وجہ سے؟

"الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ..... الخ

"تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ..... الخ

جواب: "أن یؤمنوا": محل نصب میں ہے یا تو "نقموا منهم" کا مفعول ہے یا مستثنیٰ ہے اور اسے مفعول لاجلہ بھی بنا سکتے ہیں۔ (اعراب، انوار)

"الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" یہ جملہ لفظ اللہ کی صفت ثالث ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

"تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ" "جنت" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب بتائیں:

الحمید، شھید، جنت، لشدید۔

جواب: الحمید: یہ لفظ اللہ کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

شھید: لفظ اللہ کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع میں ہے۔

جنات: مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔

لشدید: یہ "اِنَّ" کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: "المؤمنات" پر کسرہ کیوں ہے حالانکہ یہ مفعول بہ ہے؟ اسی طرح "جھنم" پر فتح کیوں ہے حالانکہ یہ مضاف الیہ ہے؟

جواب: "المؤمنات" چونکہ جمع مؤنث سالم ہے اور اس کی نصبی حالت کسرہ کے ساتھ آتی ہے، اور "جھنم" علمیت اور مؤنث سماعی ہونے کی وجہ غیر منصرف ہے، اس لئے اس پر کسرہ نہیں آئی۔

سوال: ﴿إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ﴾ میں "ھو" کیا واقع ہو رہا ہے؟

جواب: ﴿إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ﴾ میں "ھو" ضمیر منفصل مبتدا ہے اور "يُبْدِئُ" اس کی خبر ہے۔ مبتدا خبر مل کر "اِنَّ" کی خبر ہونگے یا پھر ھو ضمیر "اِنَّ" کے اسم کی تاکید کے لیے ہے اور محل نصب میں ہے اور "يُبْدِئُ" "اِنَّ" کی خبر ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ﴾ "جَنّٰتٌ تَجْرِيْ" کے بعد "تلك" کی بجائے "ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ" کیوں کہا گیا؟

جواب: اگر "تلك" ہوتا تو مطلب ہوتا "تلك الجنات الفوز الكبير" جب کہ ذالك سے مراد "حصولُ جنّٰت ذالك الفوز الكبير" حقیقت میں جنات کا حصول بڑی کامیابی ہے نہ کہ فقط باغات۔ (رازی)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں اور جہاں تعلیل ہو وہ بھی بتائیں۔

الحمید، شھید، یتوبوا، الحریق، یبطش، یبدئ، یعید۔

جواب: الحمید: حَمِدَ يَحْمَدُ حَمْدًا (ض) سے صفت مشبہ ہے بمعنی محمود (جس کی تعریف کی جائے، ہر تعریف کے لائق) ۔ مادہ: ح، م، د۔

شھید: شَهِدَ يَشْهَدُ شَهَادَةً (ض) سے صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ش، ہ، د۔ معنی: گواہ۔

یتوبوا: تَابَ يَتُوْبُ تَوْبًا وَتَوْبَةً (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ اصل میں یتوبون تھا۔لم جازمہ کی وجہ سے نون اعرابی حذف ہوگیا۔ مادہ: ت،و،ب۔ معنیٰ: وہ توبہ کرتے ہیں۔

الحریق: حَرَقَ يَحْرُقُ حَرْقًا (ن) سے صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ح،ر،ق۔ معنیٰ: جلتی ہوئی آگ۔

بطش: بَطَشَ يَبْطِشُ بَطْشًا (ض) سے مصدر ہے۔ مادہ: ب،ط،ش۔ معنیٰ: پکڑ، گرفت۔

یبدیء: باب افعال ''اَبْدَءَ يُبْدِئُ اِبْدَاءً'' سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ب،د،ء۔ معنیٰ: پہلی بار پیدا کرتا ہے۔

یعید: باب افعال ''اَعَادَ يُعِيْدُ اِعَادَةً'' سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ع،و،د۔ معنیٰ: دوبارہ پیدا کرتا ہے۔

سوال: کیا ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ سے اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر وشر دونوں کے خالق ہیں؟ نیز بندہ مجبور محض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتے ہیں؟

جواب: سورۃ الانفطار میں ﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ کے تحت اس سوال کا جواب گزر چکا ہے۔

سوال: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ﴾ زمانہ ماضی کے بدبختوں اور برے انجام والوں میں سے صرف فرعون اور قوم ثمود کا ہی کیوں حوالہ دیا گیا ہے؟

جواب: دراصل مشرکین مکہ اور ان کے لیڈروں پر قوم ثمود اور فرعون کی شان وشوکت اور عظمت کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ان سے خاصے مرعوب تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے سب سے سرکش مخالفین کو تنبیہ کرنے کے لیے ان کے ذہن کے عین موافق قوموں کے زوال کی داستان بیان کی ہے۔ (تدبر) واللہ اعلم

سوال: فرعون اور قوم ثمود کے واقعات یہاں بیان کرنے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: اس جگہ فرعون اور قوم ثمود کے متعلق بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان قوم کو تسلی دی جائے اور کفار مشرکین کو ڈرایا جائے کہ تمہارا انجام بھی ماضی کی سرکش قوموں کی طرح ہوگا۔ آخر کب تک ظلم کرو گے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ مومنین کی ہی مدد فرمائیں گے۔ (المنیر)

سوال: ﴿وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز اس آیت میں ''وَّرَاۗىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اور اللہ ان کے پیچھے سے انہیں گھیرنے والا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ﴾ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں کہ یہ کافر لوگ اللہ کی قدرت سے بھاگ نہیں سکتے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اے نبی ﷺ آپ ان کی تکالیف پر پریشان نہ ہوں۔ اللہ جب چاہے ان کی پکڑ کر سکتا ہے۔

دوسرا معنی یہ کہ اب ان کی ہلاکت کا وقت قریب ہے۔اس لئے آپ مطمئن رہیں۔اس معنی کی تائید سورۃ یونس کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے ﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ﴾ (یونس:۲۲) (اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ بے شک ان کو گھیر لیا گیا) یعنی ان کی موت کا وقت قریب ہے۔(رازی)

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب ذکر کریں۔

ذوالعرش المجید، فرعون، ثمود، محفوظ۔

جواب: ذوالعرش: یہ ھو مبتدا کی خبر ثالث ہے۔

المجید: یہ بھی ھو مبتدا کی خبر رابع ہے۔

فرعون: یہ "الجنود" سے بدل ہے لیکن غیر منصرف ہونے کی وجہ سے کسرہ نہیں آیا۔

ثمود: یہ بھی فرعون کا معطوف ہے۔

محفوظ: یہ لوح کی صفت ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

یرید، فی تکذیب، فی لوح۔

جواب: یرید: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ مَا موصول کا صلہ ہے۔

فی تکذیب: یہ ایک محذوف (کائنون یا ثابتون) کے متعلق ہو کر مبتدا (الذین کفروا) کی خبر ہے۔

فی لوح: یہ ایک محذوف (ثابت) کے متعلق ہو کر قرآن کی صفت ثانی ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کے صیغے اور معانی بتائیں۔

غفور، ودود، مجید، تکذیب، فعّال، محیط، قراٰنٌ۔

جواب: غفور: "غَفَرَ يَغْفِرُ غَفْرًا وَغُفْرَانًا" (ض) سے اسم مبالغہ ہے۔مادہ: غ، ف، ر۔معنی: بہت زیادہ بخشنے والا۔

ودود: "وَدَّ يَوَدُّ وَدًّا وَوُدًّا وَمَوَدَّةً" (ع) سے اسم مبالغہ ہے۔مادہ: و، د، د۔معنی: بہت زیادہ محبت کرنے والا۔

مجید: "مَجُدَ يَمْجُدُ مَجْدًا" (ش،ن) سے صفت مشبہ یا مبالغہ ہے۔مادہ: م، ج، د۔معنی: بڑی شان والا۔

فعّال: "فَعَلَ يَفْعُلُ فَعْلًا" (ن) سے اسم مبالغہ ہے۔مادہ: ف، ع، ل۔معنی: سب کچھ کرنے والا۔

تکذیب: باب تفعیل كَذَّبَ يُكَذِّبُ تَكْذِيْبًا سے مصدر ہے۔فی تکذیب: جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

محیط : باب افعال ''أَحَاطَ يُحِيْطُ إِحَاطَةً'' سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ح، و، ط۔ معنی: گھیرنے والا۔

قرآنٌ: قَرَأَ يَقْرَأُ قِرَاءَةً(ف) سے مصدر برائے مبالغہ ہے۔اور یہاں بطور اسم استعمال ہوا ہے۔

مادہ: ق، ر، ء۔ معنی: بہت زیادہ پڑھا جانے والا۔

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد جمع بتائیں:

حدیث، جنود، لوح۔

جواب: حدیث جمعہ أحادیث، جنود جند اسم جمع کی جمع ہے۔لوح جمعہ ألواح۔

فائدہ: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ میں ''بل'' حرف اضراب ہے۔یعنی یہ ایک چیز کی ماقبل کلام سے نفی کر کے مابعد کے لیے اثبات کرتا ہے۔ (انوار معجم النحو)

سوال: ﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ ''لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: وہ لوح ہے جہاں تمام کائنات کی تقدیر لکھی ہوئی ہے۔اوراس میں جو کچھ ثبت ہے اس میں ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ اسے قرآن نے اُم الکتاب بھی کہا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ① وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ② النَّجْمُ الثَّاقِبُ ③ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ
لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ④ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ⑥ يَّخْرُجُ مِنْۢ
بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ⑦ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ⑧ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ⑨ فَمَا لَهٗ مِنْ
قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ⑩ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ
فَصْلٌ ⑬ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ⑮ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ⑯ فَمَهِّلِ
الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ⑰

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: دونوں سورتوں کی ابتدا آسمان کی قسم کے ساتھ ہورہی ہے۔ دونوں سورتوں میں بعث بعد الموت، اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ اور قرآن کی عظمت کا بیان ہے۔ اسی طرح انسان کو باور کرایا جارہا ہے کہ روزِ جزا ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی تکذیب کر کے بدبخت نہ بنو۔ اللہ تمہیں مہلت دے رہے ہیں لیکن جب اس کی پکڑ آئے گی تو کوئی تمہیں اس کے پنجہ عذاب سے نہ بچا سکے گا۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع دوسری مکی سورتوں کی طرح عقیدہ، بعث بعد الموت اور جزا و سزا کا بیان ہے۔ ابتدا میں آسمان اور ستاروں کی شہادت کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کی نگرانی ہورہی ہے۔ پھر بتایا کہ جس اللہ نے انسان کو پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا اس کے لئے مشکل نہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ کرے، پھر فرمایا جس روز انسان کے راز منکشف ہوں گے اس روز اسے کوئی قوت یا مدد نہ دے سکے گا۔ پھر آفاقی شہادت ہے کہ قرآن سچا کلام ہے۔ اس کی بات کو مذاق نہ سمجھو۔ پھر نبی ﷺ کو تسلی دی کہ ان کافروں کی تکذیب پر دلبرداشتہ نہ ہوں بلکہ مہلت دے دو۔ ان کی ہلاکت کا وقت قریب ہے۔ (تدبر، المنیر)

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ "السماء" اور "الطارق" کی قسمیں کس چیز پر بطور استشہاد لائی گئی ہیں؟

جواب: "السماء" اور "الطارق" کی قسمیں اس بات پر بطور استشہاد لائی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر نگران مقرر کر رکھے ہیں۔ جب عظیم ستارے اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں تو یہ انسان اس کی نگرانی اور قبضہ قدرت سے کیسے خارج رہ سکتا ہے؟ (تفہیم)

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ "الطارق" سے کیا مراد ہے؟

جواب: لغت میں "الطارِقُ" راستہ پکڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں صبح نمودار ہونے والے ستارے کو کہتے ہیں جیسا کہ خود قرآن کریم نے وضاحت کی کہ: ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾ (انوار)

سوال: ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾ "الثَّاقِبُ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: الثَّاقِبُ: ثَقَبَ يَثْقُبُ (ن) سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ث، ق، ب۔ معنیٰ: ستارے وغیرہ کا روشن ہونا۔ (قاموس)

سوال: آیت ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ میں "إِنْ" کون سا ہے؟

جواب: آیت میں "إِنْ" نافیہ ہے۔

سوال: آیت ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ میں "لمّا" کس معنی میں ہے اور حرف پر کیوں داخل ہوا ہے؟

جواب: یہاں "لمّا" بمعنی "إلّا" ہے اور حرف استثناء حرف (علیہا) پر ہی نہیں بلکہ پورے جملے (علیہا حافظ) پر داخل ہے۔ (انوار)

سوال: ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ "لمّا" کتنے معانی میں اور کہاں کہاں استعمال ہوتا ہے؟

جواب: "لمّا" تین معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر صدر کلام میں فعل ماضی پر داخل ہو تو ظرف ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ﴾ (ترجمہ: پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو) (الاسراء: ٦٧)، اگر مضارع پر داخل ہو تو حرف نفی ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (ترجمہ: اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) (الحجرات: ١٤) اگر ان کے علاوہ کسی اور چیز پر داخل ہو تو حرف استثناء بمعنی الا ہوتا ہے۔ ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ (معجم النحو: حرف لما، ص ٣٢٥)

سوال: ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ میں "حَافِظٌ" سے اللہ تعالیٰ مراد ہیں یا فرشتے؟

جواب: ”حَافِظٌ“ سے مراد اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ کوئی چیز اس کی نگرانی سے باہر نہیں۔ ”وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) (اور ان کی حفاظت اس کو تھکاتی نہیں) اور فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ قرآن پاک میں کئی مقامات پر فرشتوں کو ”حفظة“ کا لقب دیا گیا ہے۔ ﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ﴾ (الانفطار: ۱۰) (رازی، الثمین)

سوال: ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾ ”مِمَّ“ اصل میں مِمَّا تھا اس کا الف کیوں حذف ہوا ہے؟ اور یہ الف کب حذف نہیں ہوتا؟

جواب: ’مِمَّ“ اصل میں مِمَّا تھا۔ جب ما استفہامیہ پر حرف جار داخل ہوتو اس کا الف ما استفہامیہ اور غیر استفہامیہ میں فرق کے لیے حذف کیا جاتا ہے۔ مثلاً ﴿فِيْمَ أَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا﴾ (النازعات: ۴۳)

جب حرف جار ماذا پر داخل ہوتو اس وقت ما کا الف حذف نہیں کیا جاتا مثلاً لماذا۔

سوال: ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ ”مَآءٍ“ اور ”دَافِقٍ“ کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: مَآء کی اصل مَوَهٌ ہے، جیسا کہ اس کی جمع اَمْوَاهٌ آتی ہے۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا اور غیر قیاسی طور پر ھاء کو ہمزہ سے بدلا، مَآء ہو گیا۔ (اعراب: ج ۱ ص ۴۷)

دَافِقٍ: دَفَقَ يَدْفُقُ دَفْقًا (ن) سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: د، ف، ق۔ معنی: پانی گرانا، زور سے بہانا۔

سوال: ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ ایک جگہ سورت حجر میں ہے کہ انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور یہاں ہے کہ ”مَّآءٍ دَافِقٍ“ سے پیدا کیا۔ دونوں میں تطبیق دیں۔

جواب: جو سورۃ حجر میں ہے کہ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (الحجر: ۲۶) ”ہم نے انسان کو سڑی ہوئی سیاہ رنگ کی مٹی کے خشک گارے سے پیدا کیا“ وہ انسان کی ابتدائی پیدائش ہے۔ پھر اس مٹی کے ڈھانچے میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی تھی۔ جب کہ مادہ منویہ سے جو انسانی پیدائش ہوتی ہے وہ موجودہ انسانی نسل کے ارتقاء کا باعث ہے۔ اس سے ابتدائی پیدائش مراد نہیں۔

سوال: مادہ منویہ سائنسی تحقیق کے مطابق فوطے (TESTICLES) میں پیدا ہوتا ہے اور (PROSTATE) نامی غدود سے خارج ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا ﴿يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾؟

جواب: حقیقت میں مادہ منویہ فوطے میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان غدودوں میں پیدا ہوتا ہے جن کا مرکز صُلب اور ترائب کے درمیان ہے۔ پھر ان غدودوں سے فوطے میں آ کر جمع ہو جاتا ہے لیکن مادہ منویہ کے اخراج کا مرکز تحریک ”بین

الصلب والترائب" ہی ہے۔ دماغ سے جب اعصابی رواس مرکز تک پہنچتی ہے تب اس مرکز کی تحریک سے کیسہ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی صورت میں نکلتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿خُلِقَ مِن مَّآءٍ دَافِقٍ ○ يَخْرُجُ مِنۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾ ان آیات میں انسانی تخلیق کے ابتدائی مرحلے کا بیان ہے، اسے کس چیز پر بطور استشہاد بیان کیا گیا ہے؟

جواب: انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو احساس دلایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ انسان کو عدم سے اتنے پیچیدہ نظام کے ذریعے وجود میں لا سکتا ہے وہ انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿يَخْرُجُ مِنۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾ "صلب" اور "ترائب" کا معنی ذکر کرتے ہوئے بتائیں کہ یہ کس چیز سے کنایہ ہیں؟

جواب: "صلب" کا معنی ہے مضبوطی۔ اسی مضبوطی کی وجہ سے صلب کا اطلاق پشت پر ہوتا ہے۔ اور ترائب تَرِيْبَةٌ کی جمع ہے جو کہ سینے کی ہڈی یا پسلی یا چھاتی کی ہڈی کو کہتے ہیں۔ اکثر مفسرین کے ہاں صلب سے مراد مرد کا نطفہ ہے اور ترائب سے مراد عورت کا نطفہ ہے۔ کیونکہ دونوں کے اجتماع سے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض کے ہاں صلب اور ترائب کسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ انسانی مادہ منویہ ان دونوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے۔ (انوار، رازی)

سوال: ﴿إِنَّهُۥ عَلَىٰ رَجْعِهِۦ لَقَادِرٌ﴾ "رَجْعِهِ" کی "ہ" ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟

جواب: "رَجْعِهِ" کی "ہ" ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ (رازی، تدبر)

سوال: ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بتائیں کہ "تبلی" یہاں کتنے معانی کا احتمال رکھتا ہے؟

جواب: "تُبْلَى السَّرَآئِرُ" میں "تُبلى" دو معانی کا احتمال رکھتا ہے۔

ظاہر کئے جائیں گے۔

جانچے جائیں گے۔

اور یہ دونوں معانی درست ہیں۔ اس روز انسان کے تمام پوشیدہ اعمال ظاہر کیے جائیں گے جو لوگوں سے مخفی رہے یا خود انسان کو بھی جن اعمال کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح اس کے اعمال کے نتائج کا بھی جائزہ لیا جائے گا کہ تمہیں تو علم نہیں مگر تمہارے اعمال کے نتیجے میں فلاں فلاں شخص پر اچھے یا برے اثرات مرتب ہوئے۔ ان سب کی جانچ پڑتال ہوگی۔

یہی ''تُبْلَى السَّرَآئِرُ'' ہے۔ (تفہیم، انوار)

سوال: ﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟ اور مَا یہاں کون سا ہے؟

جواب: شرط غیر جازم کا جواب ہونے کی وجہ سے اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ یہاں مَا مشبہ بلیس ہے۔

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ ''ذَاتِ الرَّجْعِ'' سے کیا مراد ہے؟ نیز اس آیت میں ''الرَّجْع'' بطور اسم استعمال ہوا ہے یا بطور مصدر؟

جواب: ''ذَاتِ الرَّجْعِ'' سے مراد بارش والا آسمان۔ رجع کا لغوی معنی پلٹنا ہے۔ اس کا اطلاق بارش پر اس لئے ہوتا ہے کہ بارش بھی ایک بار برس کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بار بار ہوتی رہتی ہے۔ اس کو اس وجہ سے بھی رجع کہا گیا ہے کہ بارش کا پانی سمندر میں جاتا ہے۔ پھر سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے اور بھاپ پلٹ کر پھر پانی کی صورت میں بارش بن کر برستی ہے۔ واللہ اعلم (تفہیم)

''الرَّجْع'' اصل میں تو رَجَعَ یرجِع سے مصدر ہے لیکن اس آیت میں بارش کے لئے اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (انوار)

سوال: ﴿وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾ کی وضاحت کریں۔

جواب: صَدْع کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یہ اس حالت کی تعبیر ہے جب بارش سے زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول پودوں سے لہلا اٹھتی ہے۔ (البیان)

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

ما الطارق، ممّ خلق، یخرج من بین الصلب والترائب، تبلی السرائر، من قوۃ ولا ناصر۔

جواب: ما الطارق: یہ ''أدراك'' کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

مِمَّ خُلِقَ: یہ جملہ ''فلینظر'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

﴿یخرج من بین الصلب والترائب﴾ یہ جملہ ''ماء'' کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

تبلی السرائر: یہ جملہ ''یوم'' کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

من قوۃ ولا ناصر: یہاں ''من'' زائدہ ہے اور ''قوۃ ولا ناصر'' مَا مشبہ بلیس کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب بتائیں۔

السماء، الطارق، النجم، الثاقب، کلُّ نفس، حافظ، دافق، لقادر، یوم، ذات الرجع۔

جواب: ''السماء'' یہ فعل محذوف ''أُقسِمُ'' کے متعلق ہے۔

النجم: یہ مبتدا محذوف "ھو" کی خبر ہے۔

الثاقب: یہ "النجم" کی صفت ہے۔

کل نفس: یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

حافظ: یہ "کلُّ" (مبتدا) کی خبر ہے۔

دافقٍ: یہ "ماء" کی صفت ہے۔

لقادرٌ: یہ "اِنَّ" کی خبر ہے۔

یوم: یہ "رجعه" کی ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ذاتِ الرجع: یہ "السماء" کی صفت بن رہی ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور انکے معانی بتائیں۔

الطارق، أدرٰك، تبلی، الرجع۔

جواب: الطارق: "طَرَقَ یَطْرُقُ طَرْقًا" (ن) سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ مادہ: ط، ر، ق۔ معنی: رات کو نمودار ہونے والا۔

أدرٰك: باب افعال "أَدْرٰی یُدْرِی اِدْرَاءً" سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اصل میں "أَدْرَیَ" تھا۔ مادہ: د، ر، ی۔ معنی: اس نے باخبر کیا۔

تبلی: باب افعال "أَبْلٰی یُبْلِی اِبْلَاءً" سے واحد مؤنث غائب مضارع مجہول ہے۔ اصل میں "تُبْلَیُ" تھا۔ مادہ: ب، ل، ی۔ معنی: جانچ پڑتال کی جائے گی۔

الرجع: "رَجَعَ یَرْجِعُ رَجْعًا" (ض) سے مصدر ہے۔ مادہ: ر، ج، ع۔ معنی: لوٹنا، بار بار آنا۔

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد جمع ذکر کریں۔

نفس، ماء، صلب، الترائب، السرائر۔

جواب: نفس جمعه نفوسٌ، ماءٌ جمعه میاہ، صلب جمعه أصلاب، الترائب واحده التریبة، السرائر واحده السریرة (راز)۔

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ○ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ﴾ آسمان اور زمین کی قسم کس چیز پر بطور استشہاد اٹھائی گئی ہے اور کیوں اٹھائی گئی ہے؟

جواب: آسمان سے بارش برسنا اور زمین کا انگوریاں اگانا، اس کو اس بات پر بطور استشہاد لایا گیا ہے کہ جس طرح یہ بارش اور انگوریاں اگنا مذاق نہیں اسی طرح قرآنی خبر کے مطابق روزِ آخرت کوئی مذاق نہیں۔ اس دن سب کو پیش ہونا ہوگا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ﴾ میں ''قولٌ فصل'' سے قرآن پاک مراد ہے یا مذکورہ بات؟

جواب: بعض مفسرین کے نزدیک ''قولٌ فصل'' سے مراد قرآن پاک ہے کہ اس کی خبریں قطعی ہیں۔ لیکن اگر پچھلی آیات اور قسموں کی مناسبت کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''قولٌ فصل'' سے مراد انسان کو دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت کو برپا کرنے کی بات منطقی اور دوٹوک ہے اور دوبارہ زندہ کرنے کی بات کوئی مذاق نہیں۔ (تدبر، تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا﴾ میں ''يَكِيدُونَ كَيْدًا'' سے کن کی اور کون سی تدبیر مراد ہے؟

جواب: ''یکیدون'' سے مراد کفارِ قریش وغیرہ ہیں جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر طرح طرح کے الزامات لگاتے تھے اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے۔ (رازی، تفہیم)

سوال: ﴿وَأَكِيدُ كَيْدًا﴾ اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ ''کید'' کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے لیے ''کید'' کا استعمال بطور مشاکلہ ہوا ہے۔ اللہ کی کید سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنا اور مشرکین کو مہلت دینا ہے۔ جب وہ مزید سرکشی میں بڑھ جائیں گے تو اللہ ان کو اچانک اپنی پکڑ میں گرفتار کر لیں گے۔ (تدبر، رازی)

سوال: ﴿أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ سے کتنی مدت مراد ہے؟

جواب: ﴿أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ سے قلیل مدت مقصود ہوتی ہے۔ یعنی کفار کو تھوڑی دیر مہلت دیں پھر اللہ کی پکڑ آجائے گی۔ (تدبر، رازی)

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب بتائیں۔

الصدع، کیدًا، رویدًا، فصلٌ۔

جواب: الصدع: ''الأرض'' کی صفت ہے۔

کیدا: یہ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

رویدا: یہ محذوف مفعول مطلق (امهالًا) کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (رازی)

فصلٌ: یہ قول کی صفت ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

بالهزل، أمهلهم۔

جواب: بالهزل: یہ لفظاً مجرور ہے لیکن محلاً مَا کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

أمهلهم: اس جملے کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جملہ مستانفہ ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے اور انکے معانی بتائیں۔

الصدع، الهزل، يكيدون، أمهلهم، رويدا۔

جواب: الصدع: ''صَدَعَ يَصْدَعُ صَدْعًا'' (ف) سے مصدر ہے۔ مادہ: ص، د، ع۔ معنی: پھٹنا۔ ذات الصدع: پھٹنے والی، وہ زمین جس سے کھیتی وغیرہ اگتی ہے۔

الهزل: ''هَزِلَ يَهْزَلُ هَزْلًا'' (ع) سے مصدر ہے۔ مادہ: ہ، ز، ل۔ معنی: مذاق، بیہودہ گوئی، کھیل کود، بیہودہ کلام۔

يكيدون: ''كَادَ يَكِيْدُ كَيْدًا'' (ض) سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ک، ی، د۔ معنی: وہ تدبیر کرتے ہیں۔ کیدا: خفیہ تدبیر۔

أمهلهم: باب افعال ''أَمْهَلَ يُمْهِلُ إِمْهَالًا'' سے واحد مذکر امر حاضر ہے۔ مادہ: م، ہ، ل۔ معنی: مہلت دو۔

رويدا: یہ باب افعال ''أَرْوَدَ يُرْوِدُ'' کے مصدر ''إرْوادًا'' کی تصغیر ترخیم ہے، یعنی زائد حروف کو حذف کر کے اسکی تصغیر بنائی گئی ہے۔ معنی: جز وقتی، تھوڑی سی۔ مادہ: ر، و، د۔ (اعراب)

سوال: ''مهّل'' اور ''أمهل'' کے معنی میں کوئی فرق ہے؟

جواب: ''مهّل'' اور ''أمهل'' دونوں ایک معنی میں ہے۔ (انوار)

سوال: ''رويدا'' کب مفعول مطلق کے طور پر اور کب اسم فعل بن کر استعمال ہوتا ہے؟

جواب: جب ''رويدا'' پر تنوین ہو تو مفعول مطلق ہوتا ہے اور اس سے قبل فعل محذوف ہوتا ہے اور جب بغیر تنوین کے ہو اور مابعد منصوب ہو تو اسم فعل امر ہوتا ہے۔ اور اگر اس کا مابعد اضافت کی وجہ سے مجرور ہو تو اس وقت بھی یہ مفعول مطلق ہوگا (اعراب)

''رويداً'' اسم فعل بھی ہوتا ہے مثلاً ''رُوَيدَ زيداً''، یہ مصدر کی طرح ہوتا ہے اور مابعد کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسا کہ ''فَضَرْبَ الرِّقَابِ'' (محمد: ۴) (ان کی گردن مار چلو) ہے۔ اور یہ صفت بن کر استعمال ہوتا ہے مثلاً ''ساروا سيرا رُويداً'' (رازی)

سُوْرَةُ الْأَعْلٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝۱ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳ وَالَّذِىْٓ
اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ۝۵ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ
يَعْلَمُ الْجَــهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝۱۱ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝۱۲ ثُمَّ لَا
يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۱۳ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝۱۵ بَلْ تُــؤْثِرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۸ صُحُفِ
اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝۱۹

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے اور اس کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: دونوں سورتوں میں انسان اور نباتات کی پیدائش کا تذکرہ ہے۔ سورت طارق میں ﴿خلق من ماء دافق﴾ اور سورت الاعلیٰ میں ہے "خلق فسوّٰی" الطارق میں ہے ﴿والأرض ذات الصدع﴾ اور الاعلیٰ میں ہے ﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ○ فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى﴾ (المنیر)

اس سورت میں عقائد یعنی توحید باری تعالیٰ، قرآن، تہذیب انسانی اور فکر آخرت کی بحث ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی ہدایت ہے، پھر جس طرح نباتات وغیرہ میں تدریجی انداز ہے کہ آہستہ آہستہ کمال کو پہنچتی ہیں اسی طرح انسانی جسم اور عقل کا معاملہ ہے۔ نیز یہی قانون وحی کے حفظ کے معاملے میں ہوگا۔ وحی آپ کو درجہ بدرجہ دی جائے گی۔ آپ اسے حفظ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کو کیا کیا باتیں یاد کروانی ہیں۔ پھر آپ کی رہنمائی کی گئی ہے کہ جس وقت آپ محسوس کریں کہ اس وقت نصیحت کارگر ہوگی اس وقت نصیحت کریں۔

تزکیہ کرنے والے مومنین کے لئے خوشخبری ہے اور آخرت سے غافل لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہی تعلیم پہلے انبیاء کے صحیفوں کی ہے۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کی فضیلت میں اگر کوئی صحیح حدیث ہے تو بیان کریں۔

جواب: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو عیدین اور نماز جمعہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم: ۲۰۲۸)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر کی نماز میں اس سورت کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم: ۱۰۳۰)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز وتر میں اکثر سورۃ الاعلی کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (ابوداؤد: ۱۱۷۱، ۱۴۲۳، صحیح)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ میں روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے مقتدیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ معاذ رضی اللہ عنہ نماز میں لمبی قرات کرتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ! سورۃ الشمس، سورۃ الاعلی، سورۃ اللیل یا سورۃ العلق کی قرات کیا کرو۔ (بخاری: ۷۰۵)

ان روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورت پسند تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز کا پسند ہونا کسی فضیلت سے کم نہیں۔

سوال: کیا ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ کے بعد امام اور مقتدی ''سبحان ربی الأعلی'' کہیں گے؟

جواب: مسند احمد، ابوداؤد اور سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت روایت ہے کہ انہوں نے سورۃ الاعلی کی تلاوت کی اور ''سبحان ربی الأعلی'' کہا۔ (مسند احمد: ۲۰۶۶، ابوداؤد: ۸۸۳، بیہقی: ج ۲ ص ۳۱۰، صحیح موقوفا)

ابن ابی شیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ انہوں نے سورۃ الاعلی کی تلاوت کی اور ''سبحان ربی الأعلی'' کہا اور وہ حالت نماز میں تھے۔ (ابن ابی شیبہ: ج ۲ ص ۲۴۷، رقم الحدیث: ۸۶۴۱)

ان آثار کی وجہ سے جواز کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ قاری ''سبحان ربی الأعلی'' کہے، سننے والوں کے لئے ''سبحان ربی الأعلی'' کہنا نہ سنت رسول سے ثابت ہے اور نہ آثار صحابہ سے۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بتائیں کہ ''اسم ربك'' سے اللہ کے نام کی تسبیح مراد ہے یا اللہ کی ذات کی؟

جواب: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ سے اللہ کے نام کی تنزیہہ مراد ہے یا اس کی ذات کی؟ اس بارے مختلف اقوال ہیں

لیکن درست موقف یہ ہے کہ اس سے اللہ کے نام اور ذات دونوں کی تسبیح وتنزیہہ مراد ہے۔ کیونکہ جب نام کی تنزیہہ ہوگی تو ذات کی بالاولیٰ ہوگی یا ذات کی ہوگی تو نام کی اس کے ضمن میں ہوجائے گی۔

یہاں مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز سے منزہ قرار دیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ یہاں اللہ کی ذات، اس کے اسماء وصفات، اس کے افعال اور اس کے احکام کی تنزیہہ مقصود ہے۔

اللہ کے اسماء کی تنزیہہ سے مراد ہے کہ اس کو صرف انہی ناموں سے پکارا جائے جو اللہ اور اس کے رسول سے منقول ہیں۔ اس کے ناموں کے ساتھ مخلوق کو متصف نہ کیا جائے۔ اس کے اسماء کو حقارت اور ذلت کے موقع پر نہ پکارا جائے اور ہر طرح کی گندی مجلس سے اس نام کو محفوظ رکھا جائے وغیرہ۔ (رازی، تفہیم، الثمین، قرطبی، البحر المحیط)

سوال: ﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بتائیں کہ انسان کو عطا کردہ ہدایت کی کتنی اقسام ہیں؟

جواب: ﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ سے مراد کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر مقرر کی ہے کہ اسے دنیا میں کیا کرنا ہے؟ کب کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ کیوں کرنا ہے؟ کب تک کرنا ہے؟ وغیرہ۔ گویا انسانی تخلیق ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ جو چیز جس مقصد کے لیے پیدا کی اسے اس مقصد کی طرف راہنمائی بھی عطا کی۔ ﴿الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (طہٰ: ۵۰) (ترجمہ: وہ ذات جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی، پھر راستہ دکھایا) ہر چیز کی ہدایت الگ الگ ہے۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، ستارے، جمادات، معدنیات، نباتات اور جانور وغیرہ کی ہدایت ان کی طبیعت کے موافق ہے۔

جب کہ انسانی ہدایت ان سے الگ ہے۔ ایک قسم کی ہدایت تو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے۔ یعنی کیسے کھانا، پینا، سونگھنا، دیکھنا، سننا اور کام کرنا ہے۔ اسی ہدایت کے موافق انسان کا پورا جسمانی نظام فعال رہتا ہے۔ دوسری ہدایت ایسی ہدایت ہے جو انسان کے علاوہ کسی کو عطا نہیں کی گئی۔ وہ اس کی شعوری اور عقلی ہدایت ہے جس سے کام لے کر ترقی کرتا ہے اور کائنات کے مضمر رازوں کو منکشف کرتا ہے اور اپنے خالق حقیقی کو پہچانتا ہے۔ اسی ہدایت کے ذریعے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى﴾ ''غثاءً أحوی'' کے معنی مفہوم میں صاحب تدبر کو بقیہ مفسرین سے اختلاف ہے، اس اختلاف کی حقیقت ونوعیت واضح کریں۔

جواب: "غُثَآءً اَحْوٰى" کے مفہوم کے بارے صاحب تدبر قرآن اور بقیہ مفسرین میں اختلاف ہے۔ صاحب تدبر

فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے ''اس چارے کو اللہ نے گھنا سرسبز وشاداب بنایا'' جب کہ بقیہ مفسرین کے ہاں اس کا معنی ہے ''پھر اسے سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنادیا'' (تفہیم، رازی)

صاحب تدبر کا معنی بھی درست ہے کیونکہ عربی کلام میں ''غثاء'' فقط کوڑا کرکٹ کے لیے نہیں بلکہ اس سبزے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو زمین کی زرخیزی کے باعث گھنا سیاہی مائل ہوگیا ہو۔ انہوں نے عربی کلام سے اس کے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ دوسرا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''أحویٰ'' مرعیٰ سے حال ہو یعنی ''والذی أخرج المرعیٰ أحوی أسود من شدّة الخضرة فجعله غثاء أحوی'' یعنی اس اللہ نے چارہ اس حالت میں اگایا کہ وہ گہرا سیاہی مائل سبز تھا، پھر اسے کوڑا کرکٹ بنادیا۔ ویسے بھی نباتات تدریجی انداز سے کمال کو پہنچتی ہیں، پھر جیسا کہ ہر کمال کو زوال ہے، اسی طرح نباتات بھی زوال کا شکار ہوکر کوڑا کرکٹ بن جاتی ہیں۔ (کشاف، تدبر)

سوال: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی﴾ سے لے کر ﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی﴾ تک کی آیات سے انسانیت کو کون سا اہم پیغام مل رہا ہے؟

جواب: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی﴾ سے لے کر ﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی﴾ تک انسانیت کو ایک عظیم پیغام ملتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں تدریج پائی جارہی ہے۔ اس لئے انسان کو بھی اپنے معاملات میں تدریجی منہج اپنانا چاہیے۔ (تدبر)

سوال: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی﴾ کا شانِ نزول بتائیں۔

جواب: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ اس خوف سے دہرائے چلے جاتے کہ بھول نہ جائیں۔ (حاکم: ۳۲۹۴)

کلبی اور مجاہد کہتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائی حصہ دہرانے لگتے۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفہیم، المنیر)

سوال: کیا ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی﴾ سے قرآن پاک کی حفاظت کا اثبات ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کیسے؟

جواب: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی﴾ سے قرآن کی حفاظت کا اثبات ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ہر چیز، ہر لفظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح یاد کرادیا کہ اب بھولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی مفہوم سورۃ القیامۃ میں بھی بیان ہوا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ''فلا تنسیٰ'' صیغہ نفی ہے یا نہی؟

جواب: ''فلا تنسیٰ'' یہ صیغہ نفی ہے۔ (رازی، انوار)

سوال: مندرجہ ذیل کے معانی بتائیں۔

المرعیٰ، غثاءً، أحویٰ۔

جواب: المرعیٰ: چارہ بمعنی انسانوں اور حیوانوں کی خوراک۔

غثاءً: سیلاب کا کوڑا اور جھاگ، گلے سڑے پتے۔

أحویٰ: کالا سیاہ جو سبزی مائل ہو۔ (تدبر)

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب بتائیں۔ اسم، غثاءً۔

جواب: اسم: یہ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

غثاء: یہ جَعَلَ کا مفعول ثانی ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

الأعلیٰ، الذی خلق فسوی، أحویٰ۔

جواب: الأعلیٰ: یہ محل جر میں ہے، کیونکہ "ربك" کی صفت ہے۔

الذی خلق: یہ بھی "ربك" کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

أحویٰ: یہ "غثاءً" کی صفت بھی ہوسکتی ہے اور "المرعیٰ" سے حال بھی ہوسکتا ہے، دونوں صورتوں میں محل نصب میں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے مع التعلیل بتائیں۔

اسم، الأعلیٰ، سوّیٰ، المرعیٰ، أحویٰ، نقرئك، لا تنسیٰ۔

جواب: اسم: "سَمَا يَسْمُو سُمُوًّا" (ن) سے مصدر ہے۔ اصل میں سِمْوٌ تھا۔ واؤ کو خلاف قیاس آخر سے حذف کیا اور شروع میں ہمزہ وصلی بڑھا دیا۔ مادہ: س، م، و۔ معنی: نام۔

الأعلیٰ: "عَلَا يَعْلُو عُلُوًّا" (ن) سے اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ع، ل، و۔ معنی: سب سے بلند۔

سوّیٰ: باب تفعیل "سَوّٰى يُسَوِّي تَسْوِيَةً" سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: س، و، ی۔ معنی: سیدھا کیا، درست کیا، مناسب و معتدل بنایا۔

المرعیٰ: "رَعٰى يَرْعٰى رَعْيًا" (ف) سے ظرف مکان ہے یا اسم ہے۔ مادہ: ر، ع، ی۔ معنی: چارہ۔

أحویٰ: "حَوِيَ يَحْوٰى حَوًى" (ع) سے صفت مشبہ ہے۔ مادہ: ح، و، ی۔ معنی: سیاہ۔

نقرئك: باب افعال ''أقرأ یُقرِءُ'' سے جمع متکلم مضارع معروف ہے۔ مادہ: ق، ر، ء۔ معنیٰ: ہم پڑھائیں گے۔

لا تنسیٰ: ''نَسِیَ یَنْسٰی نِسْیَانًا'' (ع) سے واحد مذکر حاضر مضارع معروف ہے۔ مادہ: ن، س، ی۔ معنیٰ: آپ نہیں بھولیں گے۔

سوال: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ سے نسیان ہی مراد ہے یا نسخ مراد ہے؟ نیز یہاں استثناء کون سا ہے؟

جواب: ﴿فَلَا تَنْسٰى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ سے مراد نسیان بھی ہے اور نسخ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرۃ: ۱۰۶) (ترجمہ: جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لے آتے ہیں) گویا نسخ اور نسیان دونوں ﴿فَلَا تَنْسٰى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ کے قول کے تحت داخل ہیں۔ (المنیر)

اس آیت میں استثناء متصل ہے۔

سوال: کیا ﴿فَلَا تَنْسٰى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ نبی ﷺ قرآن پاک کا کچھ حصہ بھول گئے ہوں؟ اس کا صحیح مفہوم ذکر کریں۔

جواب: ''اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ'' سے مراد یہ نہیں کہ آپ قرآن کا کچھ حصہ بھول جائیں گے جو امت تک پہنچ نہ سکے گا بلکہ اس سے مراد ہے کہ اللہ کی قدرت میں ہے کہ وہ آپ کو بھلا دے ﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا﴾ (الاسراء: ۸۶) (ترجمہ: اور یقیناً اگر ہم چاہیں تو ضرور ہی وہ وحی واپس لے جائیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے پھر تو اپنے لئے اس کے متعلق ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں پائے گا) یہ معنیٰ نہیں کہ بھلائے گا۔ یا دوسرا معنیٰ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ بھولیں گے نہیں مگر وہی چیز جسے اللہ کو منسوخ کرنا مقصود ہوگا، جس حکم کی اب ضرورت نہیں رہی۔ (رازی، الثمین، علوم القرآن لمناع القطان)

ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن نہیں بھولیں گے۔ وقتی طور پر کوئی آیت بھول سکتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے ایک مرتبہ صبح کی نماز میں آپ ﷺ ایک آیت بھول گئے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ: کیا یہ آیت منسوخ ہوگئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں میں بھول گیا تھا۔ (تفہیم)

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ یہ کیوں نہ فرمایا ''ونیسر الیسری لك'' اس کی حکمت واضح کریں۔

جواب: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ کہنے میں ایک لطیف حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ''فکل میسر لما خلق له'' اصل میں انسان کے اندر کسی بھی فعل کے لئے دو رجحان ہوتے ہیں۔ کروں یا نہ کروں؟ اللہ

تعالیٰ اپنی رحمت سے انسان کی بہتر فعل کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں۔ یہی تیسیر ہے اور یہ انسان سے متعلقہ ہے، اسی لیے "نیسرك" کہا گیا۔ (رازی)

سوال: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ سے کون سی آسانی مراد ہے؟

جواب: ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى﴾ حقیقت میں یہاں نبی ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (الشرح:٦) (ترجمہ: بلاشبہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے) کے تحت آپ کی تکالیف جلد کم ہو جائیں گی اور ہم آپ کے لئے آسانیاں پیدا فرما دیں گے۔ (تفہیم)

اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے لئے آسانی فراہم کریں گے کہ آپ خاموش رہ کر جبریل سے وحی سنیں گے اور آپ کو سنتے ہی یہ وحی یاد ہو جائے گی۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ سے کونسا دعوتی منہج واضح ہوتا ہے؟ اور بتائیں کہ کیا کیا جسے تذکیر فائدہ دے صرف اسے تذکیر کرنی چاہیے، حالانکہ نبی ﷺ تو تمام انسانیت کیلئے رحمت اور ہادی ہیں؟

جواب: تذکیر ہر انسان کو کرنی چاہیے مگر مائل الی الحق لوگوں کو ترجیح دینی چاہیے۔ ویسے بھی الفاظ ''اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى'' کے ہیں ''مَنْ نَفَعَتْهُ الذِّكْرٰى'' کے نہیں۔ جس کا تعلق موقع و محل وغیرہ سے ہے یعنی تذکیر اس جگہ اور اس موقع پر کرنی جہاں اس کے نفع کی توقع ہو۔ (تدبر، المنیر، رازی)

سوال: ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ میں ''نفعتِ'' پر کسرہ کیوں آیا ہے حالانکہ ''ت'' ساکن ہے؟

جواب: "نفعت" اصل میں ساکن تھا مگر جب اگلے لفظ سے ملایا تو کسرہ دیا۔ (انوار)

سوال: ﴿الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ "النَّارَ الْكُبْرٰى" سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''النَّارَ الْكُبْرٰى'' سے مراد جہنم کا عذاب ہے، کیونکہ وہ تمام آگوں سے شدید آگ ہوگی۔ (تدبر، رازی)

سوال: ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ اگر انسان نہ تو مرے نہ زندہ رہے تو وہ کیسی زندگی ہوگی؟

جواب: ﴿ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ اصل میں عرب شدید تکلیف میں مبتلا شخص کو کہتے ہیں ''لا هو حيٌّ ولا هو ميت'' یعنی نہ تو اس کو موت آتی ہے کہ سکون مل جائے اور نہ ایسی زندگی ہے کہ سکون والی ہو۔ (رازی)

سوال: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بتائیں کیا ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ سے طریقہ نماز پر کوئی دلالت ہوتی ہے؟

جواب: فلاح سے دنیا اور آخرت کی خوشحالی مراد ہے، ان آیات میں پاکیزگی سے مراد کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، برے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق سے اختیار کرنا، برے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا ہے۔ ذکر سے مراد دلی یاد اور زبان سے اللہ کو یاد کرنا ہے۔ ان دونوں آیات سے طریقہ نماز پر دلالت ہوتی ہے کہ نماز سے پہلے تزکیہ نفس ہونا ضروری ہے۔ پھر نماز سے پہلے تکبیر ہوگی اور اس کے بعد نماز۔ (تفہیم، رازی)

سوال: ﴿إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى﴾ میں "هٰذَا" ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟

جواب: ﴿إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى﴾ میں "هٰذَا" ضمیر کا مرجع بعض کے ہاں ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ ہے لیکن درست یہ ہے کہ اس کا مرجع ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ سے لے کر ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ تک ہے، کیونکہ تزکیہ، صلوۃ اور آخرت کی تیاری کی تعلیم ہر نبی نے دی۔ (تدبر، رازی)

سوال: ﴿صُحُفِ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ ﴿الصُّحُفِ الْأُوْلٰى﴾ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے؟ کیا پہلی امتوں میں صرف دو صحیفے تھے حالانکہ ایک روایت میں ہے اور بھی کئی انبیاء پر صحیفے نازل ہوئے تو اس کا جواب کیا ہے؟

جواب: ﴿صُحُفِ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ کو اگرچہ الصُّحُفِ الْأُوْلٰى سے بدل یا عطف بنانا جائز ہے لیکن زیادہ درست مفہوم اس طرح واضح ہوگا کہ عبارت حذف ہے۔ اصل میں ہے "إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى التي منها صحف ابراهيم و موسىٰ" (رازی)

سوال: مندرجہ ذیل کا وجہ اعراب بتائیں۔

الدنيا، صحف، إبرٰهيم۔

جواب: الدنيا: الحيوة کی صفت ہے جو کہ منصوب ہے۔

صحف: یہ الصحف الأولی سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

ابراهيم: یہ صحف کا مضاف الیہ ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

ماشاء الله، وما يخفى، فذكر، يخشى، الذى يصلى، الكبرى، لا يموت فيها، صلّى، الآخرة، خير وأبقى۔

جواب: ماشاء الله: یہ مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

وما يخفى: اس کا عطف "الجهر" پر ہے، اس لئے محل نصب میں ہے۔

فذکر: یہ محل جزم میں ہے کیونکہ اس کی شرط مقدر ہے۔ اصل میں تھا ''ان نفعت الذکری المنذکر فذکر''

یخشی: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ من موصول کا صلہ ہے۔

الذی یصلی: یہ جملہ ''الأشقی'' کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

الکبری: یہ ''النار'' کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

لا یموت فیہا: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اس کا عطف ''یصلی'' پر ہے جو کہ صلہ ہے۔

صلّٰی: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اس کا عطف ''ذکر'' پر ہے، جو کہ مَنْ موصول کا صلہ ہے۔

الآخرۃ: یہ جملہ حالیہ ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے مع التعلیل بتائیں۔

شاء، یخفی، نیسرك، الیسری، الذکری، یذّکّر، یخشی، أشقی، یصلی، الکبری، یموت، یحیٰی، تزکّٰی، صلّٰی، الحیوۃ، تؤثرون، الدّنیا، اخرۃ، خیر، أبقٰی، أولٰی۔

جواب: شاء: ''شَاءَ یَشَاءُ شَیْئًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں ''شَیِئَ'' تھا۔ مادہ: ش، ی، ء۔ معنی: اس نے چاہا۔

یخفی: ''خَفِیَ یَخْفٰی خَفْیًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: خ، ف، ی۔ معنی: پوشیدہ ہونا، چھپا ہونا۔

نیسرك: باب تفعیل ''یَسَّرَ یُیَسِّرُ تَیْسِیْرًا'' سے جمع متکلم مضارع معروف ہے۔ مادہ: ی، س، ر۔ معنی: ہم آسان بنا دیں گے۔

الیسری: ''یَسَرَ یَیْسِرُ یُسْرًا'' (ض) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ی، س، ر۔ معنی: سب سے زیادہ سہولت والی۔

الذکری: ''ذَکَرَ یَذْکُرُ ذِکْرًا'' (ن) سے مصدر ہے۔ مادہ: ذ، ک، ر۔ معنی: نصیحت۔

یَذَّکَّرُ: باب تفعل ''تَذَکَّرَ یَتَذَکَّرُ تَذَکُّرًا'' سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں ''یتذکر'' تھا۔ مادہ: ذ، ک، ر۔ معنی: نصیحت قبول کرے گا۔

یخشی: ''خَشِیَ یَخْشٰی خَشْیًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: خ، ش، ی۔ معنی: وہ ڈرتا ہے۔

أشقی: ''شَقِیَ یَشْقٰی شَقًا وَ شَقَاءً'' (ع) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ اصل میں اَشْقَیُ تھا۔ مادہ: ش، ق، ی۔ معنی: سب سے بڑا بدبخت۔

یَصْلٰی: ''صَلِیَ یَصْلٰی صَلْیًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ص، ل، ی۔ معنی: وہ جلے گا، داخل ہوگا۔

کبریٰ: ''کَبُرَ یَکْبُرُ کِبْرًا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ک، ب، ر۔ معنیٰ: سب سے بڑی۔

یموت: ''مَاتَ یَمُوْتُ مَوْتًا'' (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ اصل میں یَمْوُتُ تھا۔ مادہ: م، و، ت۔ معنیٰ: وہ مرے گا۔

یحیٰ: ''حَیِیَ یَحْیٰی حَیَاۃً وَ حَیَوَانًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ح، ی، ی۔ معنیٰ: وہ زندہ ہوگا۔

تزکّیٰ: باب تفعل ''تَزَکّٰی یَتَزَکّٰی'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ز، ک، و۔ معنیٰ: وہ پاک ہوا۔

صلیٰ: باب تفعیل ''صَلّٰی یُصَلِّیْ صَلٰوۃً'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ص، ل، و۔ اس نے نماز پڑھی۔

الحیاۃ: ''حَیِیَ یَحْیٰی حَیَاۃً وَ حَیَوَانًا'' (ع) سے مصدر ہے۔ مادہ: ح، ی، ی۔ معنیٰ: زندگی۔

تؤثرون: باب افعال ''اٰثَرَ یُؤْثِرُ اِیْثَارًا'' سے جمع مذکر حاضر مضارع معروف ہے۔ مادہ: أ، ث، ر۔ معنیٰ: تم ترجیح دیتے ہو۔

الدنیا: ''دَنَا یَدْنُوْ دُنُوًّا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ مادہ: د، ن، و۔ سب سے زیادہ قریب۔

آخرۃ: واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: أ، خ، ر۔ معنیٰ: موت کے بعد کی زندگی۔ اس کا باب مستعمل نہیں ہے۔

خیر: ''خَارَ یَخِیْرُ خَیْرًا'' (ض) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ اصل میں اَخْیَرُ تھا۔ مادہ: خ، ی، ر۔ معنیٰ: بدرجہا بہتر۔

أبقیٰ: ''بَقِیَ یَبْقٰی بَقَاءً'' (ع) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ اصل میں اَبْقَیُ تھا۔ مادہ: ب، ق، ی۔ معنیٰ: سب سے زیادہ بقا والی۔

أولیٰ: اَوِلَ یَاْوَلُ اَوْلًا (ع) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ا، و، ل۔ معنیٰ: سب سے اول۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿۲﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ تَصْلٰى
نَارًا حَامِيَةً ﴿۴﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿۵﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿۶﴾ لَّا يُسْمِنُ
وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾ لَّا
تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّاَكْوَابٌ
مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ
كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى
الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾
اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ
عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سورۃ الاعلیٰ میں مومنوں اور کافروں کی صفات، جنت وجہنم کے احوال کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے جبکہ اس سورت میں بھی انہی چیزوں کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (المنیر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کی ابتدا قیامت کی صفت "غاشية" سارے عالم پر چھا جانے والی سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد قیامت کے روز لوگوں کے دو گروہوں (نیکوں اور بدوں) کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ ان دونوں کو کن حالات سے سابقہ پڑے گا۔

اس کے بعد آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کو بیان کیا گیا ہے جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کا خالق بڑی عظیم حکمت و قدرت والا ہے جو ہرگز ظلم نہیں کرے گا بلکہ نیک اور بد کو انکے اعمال کے مطابق ہی جزا دے گا۔ آخر میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ کافر آپ کی نصیحت کی طرف توجہ نہیں کرتے تو آپ بددل نہ ہوں بلکہ آپ صرف نصیحت

کریں اگر یہ نہیں مانتے تو بالآخر انہوں نے ہماری طرف ہی آنا ہے ہم خود ہی ان کا حساب لے لیں گے۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ میں "هَلْ" کا معنی ومفہوم ذکر کریں۔

جواب: هَلْ استفہامیہ "قد" کے معنی کو متضمن ہے۔ قد أتاك حديث الغاشية۔

اس طرح استفہام لاکر خبر کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی خبر ہے جو کہ سامع کو معلوم ہونی چاہیے تھی۔ (التحریر)

سوال: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ میں "حَدِيْث" کا وجہ اعراب اور معنی بتلائیں۔

جواب: حَدِيْث، أَتَى فعل ماضی کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

حَدِيْث: باب حَدَثَ يَحْدُثُ حُدُوْثًا سے فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔ حدیث بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ اس کا معنی ہے "ہر وہ خبر جس کے بارے میں بات کی جاتی ہو یا ایسی خبر جو کسی واقعہ کے رونما ہونے سے حاصل ہو"۔ (التحریر)

سوال: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ میں "الْغَاشِيَة" کی لغوی تشریح کریں۔

جواب: الْغَاشِيَة : "غَشِيَ يَغْشٰى غَشْيًا" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: غ، ش، ی۔ جس کا معنی "ڈھانپ لینے والی" ہے۔

اس سے مراد قیامت ہے چونکہ ظہورِ قیامت کے وقت لوگ اس کی ہولناکیوں سے بھاگ نہ سکیں گے اور یہ سب لوگوں کو ڈھانپ کر اپنے احاطہ میں کر لے گی اس لئے اسکو "غاشية" کے لفظ سے تعبیر کیا۔ (التحریر)

سوال: قرآن مجید میں قیامت کے لئے مؤنث الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسے "الغاشية، الداهية، القارعة، الحاقة، الصاخة" وغیرہ ان کی توجیہ ذکر کریں۔

جواب: ان سے پہلے "الحادثة" موصوف محذوف ہوتا ہے اس لئے اسکو بھی مؤنث ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی وصف کے صیغے کو بطور اسم استعمال کیا جائے تو اکثر اسکو مؤنث ہی لایا جاتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ خَاشِعَةٌ﴾ میں "وُجُوْهٌ" پر تنوین کس معنی میں ہے اور "وُجُوه" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: وجوہ پر تنوین تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض چہرے ایسے ہوں گے۔

وجوہ، وجه کی جمع ہے جس کا معنی "چہرہ" ہے لیکن بسا اوقات وجه بول کر مکمل ذات مراد ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الرحمن میں ہے ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۲۷) (ترجمہ: اور تیرے رب کا بڑی شان اور عزت والا چہرہ باقی رہے گا)۔ اسی طرح یہاں بھی مکمل ذات ہی مراد ہے کیونکہ آگے فرمایا "ليس لهم طعام" یہاں هم ضمیر کو ذکر کیا ہے جو کہ

ذوات پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں ذات سے کنایۃً وجه کو اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ جزا وسزا کے وقت انسانی چہرہ مکمل حالت کی عکاسی کرتا ہے۔ (التحریر، وجه کا اصل معنی کیا ہے اور قرآن مجید میں کہاں کس معنی کے لئے استعمال ہوا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے فتاوی ابن تیمیہ: ج ۲ ص ۴۲۷)

سوال: ''وجوہ'' کا ترجمہ کچھ چہرے یا بعض چہرے کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: جب نکرہ میں نوع کا معنی پایا جائے تو اس وقت اس سے مراد چند لوگ یا کوئی خاص گروہ ہی ہوتا ہے جیسا کہ اسی سورت میں ہے ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ○وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ دونوں آیات میں علیحدہ علیحدہ ''وجوہ'' کا تذکرہ بذات خود کچھ چہرے یا کئی چہرے کا ترجمہ ثابت کر رہا ہے۔

سوال: ''وجوہ'' نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا کیسے بن گیا؟

جواب: ''وجوہ'' اگرچہ نکرہ ہے لیکن جب نکرہ کی صفت آجائے تو اس کو مبتدا بنانا جائز ہے۔ یہاں ''خاشعة'' اور دوسری جگہ ''ناعمة'' اس کی صفت ہے۔ اسی طرح جب نکرہ میں نوع کا معنی پایا جائے تب بھی مبتدا بنانا جائز ہے۔ یہاں بھی دو طرح کے چہرے ہیں۔ ''وجوہ خاشعة'' اور ''وجوہ ناعمة''۔ (المنیر معجم النحو ''المبتدا'' ص ۳۴۶)

سوال: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ ''یوم'' معرب ہے یا مبنی؟

جواب: اس آیت میں یوم مبنی علی الفتح ہے کیونکہ جب ظرف مبہم فعل مبنی یا إذ کی طرف مضاف ہو تو ظرف مبہم کا اعراب مبنی والا ہوتا ہے مثلاً رجع کیومَ ولدته أمه۔

سوال: ﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ﴾ (المعارج: ۱۱) میں ''یوم'' پر کسرہ ہے یعنی معرب ہے اور ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ میں ''یوم'' پر فتحہ ہے اور یہ مبنی ہے اس فرق کی وضاحت کریں۔

جواب: اصلاً جب یوم، إذ کی طرف مضاف ہو تو یوم مبنی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات یوم کو معرب والا اعراب دینا بھی جائز ہے جیسا کہ سورۃ المعارج کی آیت نمبر ۱۱ ﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ﴾ (ترجمہ: مجرم تمنا کرے گا کہ اس روز عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں کا فدیہ دے دے) اور سورۃ ھود کی آیت نمبر ۶۶ ﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ﴾ (ترجمہ: پھر جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے صالح علیہ السلام کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی، بے شک تیرا پروردگار بڑا قوت والا اور بڑے غلبے والا ہے) میں یومِئِذٍ معرب ہے۔ (معجم النحو: الاضافة)

سوال: ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ ''إذٍ'' پر تنوین کیوں آئی ہے؟

جواب: اصلاً إذ ظرفیہ جملہ اسمیہ یا جملہ فعلیہ کی طرف مضاف ہوتا ہے بعض اوقات اس جملے کو حذف کر کے اسکے عوض تنوین لائی جاتی ہے اسے تنوین عوض کہتے ہیں مثلاً ﴿فَلَوۡلَآ إِذَا بَلَغَتِ الۡحُلۡقُوۡمَ وَاَنۡتُمۡ حِیۡنَئِذٍ تَنۡظُرُوۡنَ﴾ (الواقعۃ: ۸۳، ۸۴) (ترجمہ: پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچتی ہے اور تم اس وقت دیکھتے ہو) میں إذ کے بعد جملہ محذوف ہے إذ الروح یبلغ الحلقوم۔ ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ میں جملہ محذوف یوں ہے ''وجوہ یوم إذ تغشی الغاشیة خاشعة''۔

سوال: ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ بعض کے ہاں ''خاشعة'' ''وجوہ'' کی صفت ہے ایسی صورت میں ''وجوہ'' کی خبر کیا ہوگی؟

جواب: اگر خاشعة کو وجوہ کی صفت بنائیں تو اسکی خبر جملہ ''تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً'' ہوگی اور ''عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ'' وجوہ کی صفات ہوں گی۔

سوال: بعض کے ہاں ''خاشعة'' ''وجوہ'' کی خبر ہے ایسی صورت میں ''عاملة، ناصبة اور تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً'' کا محل اعراب کیا ہوگا؟

جواب: ایسی صورت میں ''عاملة، ناصبة اور تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً'' وجوہ کی اخبار ثانی، ثالث اور رابع ہوں گی اور محل رفع میں ہوں گی۔

سوال: ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ﴾ ''خَاشِعَةٌ'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: خَاشِعَة: خَشَعَ یَخۡشَعُ خُشُوۡعًا (ف) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ معنی: عاجزی و انکساری دیکھانا، بے حیثیت اور ذلیل ہونا، ڈرنا۔ مادہ: خ، ش، ع۔ (قاموس)

سوال: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ کا تعلق دنیا سے ہے یا آخرت سے؟

جواب: اگرچہ ماقبل اور مابعد والی آیات کا تعلق آخرت سے ہے لیکن اس آیت کا تعلق دنیا سے ہے۔ جیسا کہ مولانا حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کچھ چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر ذلت برس رہی ہوگی اور دنیا میں انہوں نے جتنے کام کئے تھے آج یہ محسوس کریں گے کہ وہ بجز نام، لقب اور بوجھ کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے''۔ (سراج البیان)

سوال: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ کونسا مرکب ہے؟

جواب:﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ کا باہمی تعلق کوئی نہیں یا تو دونوں وجوہ کی صفات ہیں یا دونوں وجوہ کی اخبار ہیں۔

سوال:﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً﴾ میں ''تصلی'' کیا صیغہ ہے؟ اسکی لغوی وضاحت کریں اور اس میں موجود ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب:تصلی: ''صَلِيَ يَصلىٰ صَلْيًا'' (ع) سے واحد مؤنث غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ص، ل، ی۔ صَلِيَ النارَ کا معنی ہے'' آگ میں جلنا''۔لیکن تجرید معنی کیلئے صَلِيَ النارَ کا ترجمہ'' آگ میں جلا'' کی بجائے'' آگ میں داخل ہوا'' کیا جاتا ہے کیونکہ جلانے کا معنی اور صفت تو'' النار ''میں بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (البقرۃ:٦٠) میں'' ولا تعثوا'' کا معنی'' تم نہ پھرو'' کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا حقیقی معنی'' تم فساد نہ کرو'' ہے۔ اسے تجرید معنی کہتے ہیں۔لیکن زیادہ بہتر یہی ہوتا ہے کہ تجرید کے بغیر اصل معنی ہی کیا جائے تاکہ کلام میں زیادہ تاکید آ سکے۔تصلی میں موجود'' ھی ''ضمیر کا مرجع وجوہ ہے۔

سوال:﴿تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ﴾ میں'' اٰنِيَةٍ'' کا ترجمہ کریں اور صیغہ بتلائیں۔

جواب:اٰنِيَةٍ: ''اَنٰى يَأْنِيْ اَنْيًا'' سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: أ، ن، ی۔ جس کا معنی ہے'' کھولتا ہوا اور ابلتا ہوا'' صاحب لسان رقمطراز ہیں: ''سخن وبلغ فی الحرارۃ'' یعنی جس کی گرمی ورحرارت اپنے آخری نقطے تک پہنچی ہوئی ہو جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ﴾ (ترجمہ: اس کے اور گرم کھولتے پانی کے درمیان پھریں گے) (الرحمن:٤٤) (لسان)

سوال:﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾ میں'' طعام'' مرفوع کیوں ہے؟

جواب:اس آیت میں'' طعام'' لیس کا اسم مؤخر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال:﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾ میں استثناء کی کونسی قسم ہے؟

جواب:'' إِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ'' میں استثناء منقطع حصر کے لئے ہے۔

سوال:﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾ میں استثناء حصر کے لئے ہے۔ حالانکہ کئی دوسرے مقامات پر اس حصر کی نفی ہوتی ہے مثلاً ﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ﴾ (ترجمہ: اور زخموں کی پیپ کے سوا کچھ کھانا نہیں ہے) (الحاقۃ:٣٦) اور ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ﴾ (ترجمہ: بے شک زقوم کا درخت بڑے مجرم کا کھانا ہوگا) (الدخان:٤٣، ٤٤) اسکی کیا توجیہ ہوگی؟

جواب:ضریع، غسلین اور شجرۃ الزقوم کے جہنمیوں کی خوراک ہونے میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ حصر لفظ ضریع میں

مقصود نہیں بلکہ جہنمیوں کے کھانے کی قباحت میں مقصود ہے۔یعنی جہنمیوں کا کھانا سوائے برے اور اذیت ناک کھانے کے کچھ نہ ہوگا اور اس برے کھانے کی اقسام ضریع ،غسلین اور شجرۃ الزقوم وغیرہ ہیں۔

ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس طرح جہنمیوں کی کئی اقسام ہوں گی تو ان کے اعمال کے موافق انکی سزا کی بھی کئی اقسام ہوں گی اور ہر گروہ کے ساتھ عذاب کی بھی خاص قسم ہوگی۔(الکشاف)

سوال:﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ﴾ میں "ضَرِيع" کی لغوی تشریح کریں۔

جواب:ضَرِیع خشک شبرق کو کہتے ہیں۔ یہ وہ بوٹی ہے جو تروتازگی کے وقت خاردار ہوتی ہے،اور جب خشک ہوتی ہے تو اس وقت زہرنما مہلک ہوجاتی ہے اس وقت اس کو ضریع کہتے ہیں۔

سوال: پہلی سات آیات میں کچھ لوگوں کے جہنم میں جانے کا تذکرہ ہے انکے سبب دخول کا تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب:دراصل قرآن پاک کا ایک خاص اسلوب ہے بعض جگہ صرف جنت کی نعمتوں یا جہنم کے عذاب اور اسکی ہولناکیوں کی تفصیل ہوتی ہے اور جہنم میں دخول کا سبب بیان نہیں ہوتا اسکی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں کئی مقامات پر بارہا ان اسباب کی تفصیل بیان ہوچکی ہوتی ہے اور ہر جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر اس جگہ دخول جہنم کا سبب معلوم کرنا ہو تو اسکی وضاحت بعد والی آیات اور اس سورت کے زمانہ نزول کی نشاندہی سے ہوجاتی ہے۔ یہ مکی سورت ہے جب لوگ توحید اور عقیدہ آخرت کے منکر تھے انہی دو باتوں کے اثبات کیلئے آیت نمبر ۱۷ تا ۲۰ کا مضمون بیان ہوا ہے۔ جس سے ان کے دخول جہنم کے سبب کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

سوال:﴿لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾ میں يُسْمِنُ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ نیز اس کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: يُسْمِنُ کی ضمیر کا مرجع "ضریع" ہے۔يُسْمِنُ: باب افعال أَسْمَنَ يُسْمِنُ إِسْمَانًا سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔جس کا معنی ہے "وہ موٹا نہیں کرے گی"۔(تفسیر القرآن الکریم)

سوال:لا یسمن......ضریع کی صفت ہے،کیا جملہ مفرد نکرہ کی صفت بن سکتا ہے؟

جواب:چونکہ جملہ بھی نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے،اس لئے اسے نکرہ کی صفت بنانا جائز ہے۔(معجم النحو،النعت)

سوال:﴿لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ میں "راضية" کا وجہ اعراب بتائیں۔

جواب:یہ "وجوهٌ" ثانی کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال:﴿لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ کا معنی ہے کہ وہ اپنی محنت اور کاوش سے راضی ہوں گے حالانکہ اپنے آپ کو راضی کرنے

کے لئے عبادات میں محنت نہیں کی جاتی۔اس آیت کا درست مفہوم واضح کریں۔

جواب: اس آیت کا ایک معنی تو یہ ہے کہ دنیا میں جو کاوشیں کی تھیں ان پر خوش ہوں گے کہ ہمیں ان کی اچھی جزا ملی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سعی سے پہلے جزاء محذوف ہوگا یعنی لجزاء سعیھا راضیة اپنی کوششوں کی جزا پر خوش ہوں گے۔ (کشاف، انوار)

سوال: ﴿لَا تَسۡمَعُ فِیۡهَا لَاغِیَةً﴾ میں ''لَا تَسۡمَع'' کی ''ھی'' ضمیر کا مرجع اور ''لاغیة'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: لا تسمع کی ھی ضمیر کا مرجع ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ میں لفظ ''وجوہ'' ہے۔

لاغیة: لَغَا یَلۡغُو لَغۡوًا (ن) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ معنی: بے کار، بری اور بے ہودہ بات کرنا۔ مادہ: ل، غ، و۔

سوال: مندرجہ ذیل کی لغوی وضاحت کریں۔

عین، جاریة، سرر، مرفوعة، اکواب، موضوعة۔

جواب: عین: آنکھ، چشمہ، جاسوس، سپہ سالار، معزز آدمی۔ یہاں یہ چشمہ کے معنی میں ہے۔

جاریة: جَرٰی یَجۡرِی جَرۡیًا (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے، معنی: بہنا، رواں ہونا، جاری ہونا۔

سرر: اس کی واحد سَرِیۡرٌ ہے، معنی: تخت، چارپائی اور بیڈ۔

مرفوعة: رَفَعَ یَرۡفَعُ رَفۡعًا (ف) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ معنی: بلند کئے گئے۔

اکواب: کُوۡبٌ کی جمع ہے، معنی: بے دستہ کوزہ، گلاس، پیالہ اور پیالی۔

موضوعة: وَضَعَ یَضَعُ وَضۡعًا (ف) سے اسم مفعول ہے، معنی: رکھے ہوئے۔

سوال: ﴿وَنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ﴾ ''نَمَارِق'' اور ''مَصۡفُوۡفَةٌ'' کا ترجمہ اور صیغہ ذکر کریں۔

جواب: ''نَمَارِق'' کا معنی ''تکیے'' ہے۔ یہ نُمۡرُقَةٌ کی جمع ہے۔

مَصۡفُوۡفَةٌ: ''صَفَّ یَصُفُّ صَفًّا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ معنی: قطاروں میں لگے ہوئے۔

سوال: ﴿وَزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ﴾ ''زَرَابِیّ'' کا ترجمہ کریں اور اس کی واحد ذکر کریں، نیز ''مَبۡثُوۡثَةٌ'' صیغہ اور معنی بتلائیں۔

جواب: اس کا معنی ''اَلۡبُسُط: قالین'' ہے۔ یا ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بچھائی جاتی ہے۔ اور اس پر ٹیک لگائی جاتی ہے۔ اس کی واحد زِرۡبِیَّةٌ ہے اور اس کی ز پر تینوں حرکات (فتحہ، ضمہ، کسرہ) پڑھے جاسکتے ہیں۔ (لسان العرب)

مَبۡثُوۡثَةٌ: ''بَثَّ یَبُثُّ بَثًّا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ معنی: پھیلائے ہوئے، بچھائے ہوئے۔

سوال: "عين، وجوه، سرر، أكواب، نمارق اور زرابيّ" کی صفات واحد مؤنث کیوں لائی گئی ہے؟

جواب: عين مؤنث سماعی ہے۔ وجوه، سرر، أكواب، نمارق اور زرابي یہ سب جمع مکسر ہیں اور جمع مکسر کی صفت واحد مؤنث ہوسکتی ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

ليس لهم ... من ضريع، لا يسمن، في جنة عالية، لاتسمع فيها لاغية، فيها عين جارية۔

جواب: ليس لهم: یہ "وجوهٌ" مبتدا کی خبر خامس ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

من ضريع: اگر "الاّ" حصر کے لئے ہو تو "من ضريع" ایک محذوف کے متعلق ہوکر "طعام" کی صفت بن جائے گی۔ یعنی "طعام كائن من ضريع"۔ اگر "الاّ" استثناء کے لئے ہے تو محذوف کے متعلق ہوکر مستثنیٰ بن جائے گا جو کہ محل نصب میں ہوگا۔

لا يسمن: "ضريع" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

في جنة عالية: ایک محذوف "ثابتة" کے متعلق ہوکر "وجوهٌ" مبتداء کی خبر ثانی ہوگی۔

لا تسمع فيها لاغية: "جنةٍ" کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

فيها عين جارية: "جنة" کی صفت ثالث ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے مع تعلیل بتائیں۔

ناصبة، حامية، تسقٰى، يغني، ناعمة، راضية، عالية، لاغية، جارية۔

جواب: ناصبة: "نَصِبَ يَنْصَبُ نَصْبًا" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ن، ص، ب۔

حامية: "حَمِيَ يَحْمٰى حَمًى" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ح، م، ی۔

تُسقٰى: "سَقٰى يَسْقِيْ سَقْيًا" (ض) سے واحد مؤنث غائب مضارع مجہول ہے۔ مادہ: س، ق، ی۔

يغني: باب افعال "اَغْنٰى يُغْنِيْ اِغْنَاءً" سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: غ، ن، ی۔

ناعمة: "نَعِمَ يَنْعَمُ نَعْمًا" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ن، ع، م۔

راضية: "رَضِيَ يَرْضٰى رِضًا و رِضْوَانًا" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ اصل میں "رَاضِوَةٌ" تھا۔ واؤ تیسری سے چوتھی یا اس سے زائد جگہ پر آئے تو واؤ کو ی سے بدل دیتے ہیں، راضية ہوگیا۔ مادہ: ر، ض، و۔

عالیة: ''عَلَا یَعْلُو عُلُوًّا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ اصل میں عَالِوَۃٌ تھا واؤ تیسری سے چوتھی یا اس سے زائد جگہ پر آئے تو واؤ کو ی سے بدل دیتے ہیں، عالیة ہو گیا۔ مادہ: ع، ل، و۔

لاغیة: ''لَغَا یَلْغُو لَغْوًا'' (ن) سے واحد مؤنث اسم فاعل بھی ہو سکتا ہے اور مصدر بروزن ''عافیة'' بھی ہو سکتا ہے۔ اصل میں ''لَاغِوَۃٌ'' تھا واؤ تیسری سے چوتھی یا اس سے زائد جگہ پر آئے تو واؤ کو ی سے بدل دیتے ہیں، لاغیة ہو گیا۔ مادہ: ل، غ، و۔

جاریة: ''جَرٰی یَجْرِیْ جَرْیًا'' (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ج، ر، ی۔

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد جمع بتائیں۔

غاشیة، عین، سرر۔

جواب: غاشیة کی جمع غاشیات، عین کی جمع عُیُوْنٌ، سُرُر کی واحد سَرِیْرٌ ہے۔

سوال: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ﴾ میں ''نظر'' کس معنی میں ہے؟

جواب: اس آیت میں نظر بمعنی ''اعتبار'' ہے یعنی کیا وہ اونٹوں کی کیفیتِ تخلیق سے عبرت حاصل نہیں کرتے؟

سوال: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ﴾ ''الإبل'' کے ساتھ فعل مؤنث ''خلقت'' کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: کیونکہ الإبل جنس ہے اور جنس تذکیر و تانیث میں برابر ہوتی ہے اس لئے فعل خلقت کو مؤنث لایا گیا ہے۔

سوال: ''کیف خلقت'' ''الإبل'' سے بدل ہے۔ یہ بدل کی کون سی قسم ہے؟

جواب: ''کیف خلقت'' ''الإبل'' سے بدل اشتمال ہے۔ (اعراب)

سوال: کیا جملہ مفرد سے بدل بن سکتا ہے؟

جواب: جملہ کو مفرد سے بدل بنانا جائز ہے جیسے الإبل مفرد سے کیف خلقت جملہ بدل ہے۔

سوال: کیا نکرہ معرفہ سے بدل بن سکتا ہے؟

جواب: نکرہ کو معرفہ سے بدل بنانا جائز نہیں۔ البتہ جب نکرہ کی کسی ذریعے سے تخصیص ہو جائے تو بدل بنایا جا سکتا ہے۔

سوال: ''کیف'' ''خلقت'' کی ''ھی'' ضمیر سے حال ہے۔ کیا حال اپنے عامل سے مقدم ہو سکتا ہے؟

جواب: حال اپنے عامل سے مقدم ہو سکتا ہے۔ (معجم النحو)

سوال: کیا حال اپنے ذوالحال سے بھی مقدم ہو سکتا ہے؟ اور کب ہو سکتا ہے؟

جواب: حال کو اپنے ذوالحال سے مقدم کرنا بھی جائز ہے۔لیکن اس وقت مقدم کرنا واجب ہے جب وہ صدرِ کلام چاہتا ہو یا جب ذوالحال محصور فیہ ہو۔مثلاً ''ما حضر مسرعاً إلا أخوك''۔(معجم النحو' الحال' ص۲۴۱ تا ۲۴۳)

سوال: کیا ''السماء'' اور ''الأرض'' مؤنث الفاظ ہیں؟

جواب: السماء بھی مؤنث ہے کیونکہ اس کی جمع السموات ہے اور الأرض بھی مؤنث ہے کیونکہ اس کی تصغیر أریضة آتی ہے۔

سوال: ''أفلا ینظرون'' سے ''وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ'' تک آیات لانے کا مقصد کیا ہے؟

جواب: ''أفلا ینظرون سے وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ'' تک آیات لانے کا مقصد انسانیت کو توحید اور عقیدہ آخرت کا عظیم درس دینا ہے۔اللہ تعالیٰ منکرین آخرت سے مخاطب ہیں کیا وہ اپنے اردگرد نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے بن گیا؟ آسمان کیسے بلند ہوا؟ پہاڑ کیسے نصب ہوئے اور یہ زمین کیسے ہموار ہو کر بچھ گئی؟ اگر اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے تو ان کو ختم بھی کر سکتا ہے۔اسی طرح اگر انسان کو پیدا کر سکتا ہے تو اسے مار بھی سکتا ہے۔جو اللہ پہلی مرتبہ پیدا کر سکتا ہے اس کے لیے دوسری مرتبہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں۔اس لیے آخرت کی تیاری کرو۔(تفہیم)

سوال: کیا ہر بندے کو ہدایت دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے؟

جواب: ہر بندے کو ہدایت دینا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے نہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے۔﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾(ترجمہ: بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے ،البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانیوالوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے)(القصص:۵۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری تو فقط تبلیغ دین ہے۔﴿فذکر إنما أنت مذکر﴾۔

سوال: ﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ﴾ میں ''مَن'' کس معنی میں ہے؟ شرطیہ،موصولہ یا کوئی اور؟

جواب: اگر إلا بمعنی لکن ہو تو من شرطیہ ہوگا،اگر إلا استثنائیہ ہو تو من موصولہ ہوگا۔

سوال: ﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ﴾ میں ''إلا'' کس معنی میں ہے؟

جواب: یہاں استثناء منقطع ہوگا کیونکہ اگر متصل ہو تو معنی ہوگا ''لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فانت علیهم بمصیطر'' تو معنی درست نہ ہوگا۔اس لئے إلا کو لکن کے معنی میں ماننا زیادہ بہتر ہے۔

سوال: ''إیاب'' اور ''رجوع'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: إیاب کا مادہ أوب ہے۔أوب فقط ذوارادہ کے لوٹنے کے لیے آتا ہے۔ جب کہ رجوع کسی بھی چیز کے لوٹنے کے لیے آتا ہے۔ (انوار البیان، المعجم المفصل فی تفسیر غریب القرآن)

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

فذکّر، بمصیطر، من تولّی، فیعذبه الله......

جواب: فذکّر: یہ محل جزم میں ہے۔ اس سے پہلے جملہ شرطیہ محذوف ہے۔ اور یہ جواب شرط ہے۔

بمصیطر: یہ لفظاً مجرور لیکن محلاً منصوب ہے کیونکہ لیس کی خبر ہے۔

من تولّی: اگر إلا بمعنی لکن ہو تو من تولّی مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور اگر إلا استثنائیہ ہو تو مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا لیکن پہلی ترکیب زیادہ درست ہے۔

فیعذبه الله: إلا اگر لکن کے معنی میں ہو تو فیعذبه الله کی ف زائدہ ہوگی۔ اور جملہ خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوگا۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں۔

موضوعة، لست، مصیطر، تولّٰی، أکبر، إیاب۔

جواب: موضوعة: ''وَضَعَ يَضَعُ وَضْعًا'' (ف) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ مادہ: و، ض، ع۔

لَسْتَ: واحد مذکر حاضر ماضی معلوم ہے۔ اس فعل سے ماضی کی مکمل گردان استعمال ہوتی ہے لیکن مضارع، امر، نہی وغیرہ اس سے نہیں آتے۔

مصیطر: باب ''سَيْطَرَ يُسَيْطِرُ سَيْطَرَةً'' بروزن دَحْرَجَ يُدَحْرِجُ سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ سین تجوید کے قواعد کی وجہ سے صاد سے بدلی ہے۔

إیاب: ''آبَ يَؤُوْبُ أَوْبًا وَإِيَابًا'' (ن) سے مصدر ہے۔ اصل میں إواب تھا۔ مادہ: أ، و، ب۔

سوال: مندرجہ ذیل کی واحد جمع بتائیں۔

أکواب، مصیطر۔

جواب: أکواب کی واحد کُوبٌ، مصیطر کی جمع مصیطرون ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کے معانی بتائیں۔

أکواب، نصبت، سطحت، مصیطر۔

جواب :أکواب: وہ پیالے جن کے کنڈے نہ ہوں۔

نصبت: نصب کی ہوئی۔

سطحت: کوئی چیز جو چھت کی طرح ہموار کر کے بچھائی جائے۔

مصیطر: ذمہ دار، نگران۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ (١) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (٢) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (٣) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (٤) هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ
لِّذِيْ حِجْرٍ (٥) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (٦) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (٧) الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ
مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (٨) وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (٩) وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ (١٠)
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (١١) فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (١٢) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ
عَذَابٍ (١٣) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (١٤) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ
وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (١٥) وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
اَهَانَنِ (١٦) كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (١٧) وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (١٨)
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (١٩) وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (٢٠) كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا
دَكًّا (٢١) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (٢٢) وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ
الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (٢٣) يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (٢٤) فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ
عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ (٢٥) وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ (٢٦) يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ (٢٧) ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (٢٨) فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (٢٩) وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (٣٠)

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت کا اختتام ﴿اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ پر ہوا تھا تو اس سورت میں بھی یوم حساب کو ہی ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الغاشیہ میں سعداء اور اشقیاء کا بیان ہے، سورۃ الفجر میں بھی ان دو گروہوں کو بیان کیا گیا ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع آخرت کی جزا وسزا کا اثبات ہے۔ اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے جزا وسزا کے

اثبات کیلئے فجر، دس راتوں، جفت طاق اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھائی ہے۔ اور یہ فکر دی ہے کہ کیا جو ذات ایسا حکیمانہ نظام چلا رہی ہے، آخرت کو برپا کرنا اور نیکی و بدی کا بدلا دینا اس کی قدرت سے باہر ہے؟

اس کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے بطور مثال عاد وثمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا کہ جب انہوں نے زمین میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کس طرح عذاب میں مبتلا کیا۔ کیا جو ذات ایسی طاقتور قوموں کو تباہ کر سکتی ہے اس کیلئے دوسرے فسادیوں کو دنیا یا آخرت میں سزا دینا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد انسانی معاشرے کی مادہ پرستی پر تنقید کی اور بتلایا کہ نہ تو دولت مندی کوئی انعام ہے اور نہ ہی رزق کی تنگی کوئی سزا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اصلاً تو لوگوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے کہ کون کس حالت میں کیا رویہ اپناتا ہے۔ اس کے بعد یتیموں کی حق پامالی کرنے والوں کو تنبیہ کی اور قیامت کے بعض احوال کو بیان کئے۔ آخر میں انسان کے دو گروہوں ''بدبخت اور نیک بخت'' کا تذکرہ کیا اور انکو ملنے والی جزا کا بھی تذکرہ فرمایا۔ (تفہیم، المنیر)

سوال: ﴿وَالْفَجْرِ ○ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ○ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ○ وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ﴾ کیا قرآن مجید میں قسمیں کسی چیز کے تقدس کی بنا پر ہوتی ہیں یا مدعا پر شاہد اور اس کو ثابت کرنے کیلئے؟

جواب: بعض مفسرین کرام قرآن مجید کی قسموں کو تقدس کیلئے مانتے ہیں یعنی ان کے نزدیک جو چیز اللہ کے ہاں عظمت و رفعت والی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی قسم اٹھاتے ہیں۔ جبکہ بعض دوسرے مفسرین کا موقف ہے کہ قرآن مجید کی قسمیں تقدس کی بناء پر نہیں ہیں بلکہ ان قسموں کو مدعا، مقسم علیہ پر بطور دلیل اور شہادت کیلئے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مضمون کو امثلہ کے ساتھ مضبوط کیا جائے۔ یہی موقف زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿وَالْفَجْرِ﴾ سے کونسی فجر مراد ہے؟

جواب: ''والفجر'' کی تعیین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے کوئی صحیح حدیث یا اثر منقول نہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین میں اسکی تعیین کا خاصا اختلاف ہے۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہر طلوع ہونے والی فجر ہی مراد لی جائے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿وَالْفَجْرِ﴾ کی شہادت سے کیا مقصود ہے؟

جواب: فجر اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ رات کی وحشت کے ختم ہونے اور صبح کے طلوع ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کا کئی مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ (ترجمہ: بے شک فجر کا قرآن ہمیشہ سے حاضر ہونے کا وقت رہا ہے) (الاسراء: ۷۸) ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ

﴿الْفَلَقِ﴾ (ترجمہ: کہ دیجئے میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں) (الفلق: ۱) ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ﴾ (ترجمہ: صبح کی قسم جب وہ خوب روشن ہو) (المدثر: ۳۴) ﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ (ترجمہ: صبح کی قسم جب وہ سانس لیتی ہے) (التکویر: ۱۸)

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے فجر کو قیامت پر بطور شاہد اور دلیل پیش کیا ہے کہ جس طرح رات کے وقت ہر طرف تاریکی چھائی ہوتی ہے، روشنی کی کرن کی کوئی امید نہیں ہوتی تو فجر طلوع ہو کر ان تمام تاریکیوں کو ختم کر کے ہر طرف روشنی پھیلا دیتی ہے۔ اسی طرح دنیا رات کی مانند ہے جس کی تاریکی صبحِ قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی ہے، اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہوگی اور جس کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ انکے سامنے ہوگی۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ سے کونسی دس راتیں مراد ہیں؟

جواب: مفسرین کے ہاں اس بارے میں بہت سے اقوال ہیں۔ لیکن کسی صحیح روایت سے کسی کی تائید نہیں ہوتی۔ صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت ہے کہ اس سے مراد عشر ذوالحجہ ہے۔ لیکن یہ روایت مرفوعاً منکر ہے جیسا کہ امام ابن کثیر نے خود اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ اور الشیخ عبدالرزاق المهدی نے امام صاحب کی تائید کی ہے۔ اگر یہ صحیح روایت ہوتی تو ہم کسی اور قول کو اختیار کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ اس لیے ہم نے ہر ماہ کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ چاند کی تاریخ کی پہلی دس راتیں یا درمیان والی یا آخر والی کیونکہ یہ نکرہ استعمال ہوا ہے اس لیے کوئی بھی دس راتیں مراد لی جاسکتی ہیں۔ ویسے بھی عربوں کی سماجی زندگی میں مہینہ کو تین عشروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ کی شہادت سے کیا مقصود ہو سکتا ہے؟

جواب: اس قسم میں چاند کی پوری کی پوری شکل پیش کی ہے۔ کس طرح چاند ہلال سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ بدر بن کر مکمل روشن ہو جاتا ہے، پھر کس طرح آہستہ آہستہ منزل بمنزل چلتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہو کہ ادھر چاند طلوع ہوا ہو اور وہ یکا یک مکمل روشن ہو کر چودھویں رات کا بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی مدت مقرر کی ہے۔ یہ کافر قیامت کے آنے پر اعتراض کرتے تھے کہ قیامت قیامت کرتے رہتے ہو تو کہاں ہے قیامت؟ حق تعالیٰ نے ان کا رد کیا ہے کہ اس کے ہاں ہر چیز کی میعاد مقرر ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ اس پر قادر نہیں بلکہ وہ تمہاری رسی دراز کر رہا ہے اور یوم محشر اپنے وقت مقررہ پر آ کر ہی رہے گا۔

سوال: ﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر نبی ﷺ سے اس بارے میں کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ اس لئے اس سے مراد بھی عام ہے۔ یعنی ہر طاق اور ہر جفت مراد لیا جا سکتا ہے۔ زمین و آسمان، نور و ظلمت، مذکر و مؤنث وغیرہ۔ فرمان الٰہی ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (ترجمہ: ہم نے ہر چیز سے جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو) (الذاریٰت: ۴۹)

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دنیا کا جوڑا بھی تلاش کیا جائے۔ وہ آخرت ہے۔ ہر شے اپنے جوڑے سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ﴾ يسرِ اصل میں کیا تھا نیز اس کی شہادت کس مقصد کے لیے ہے؟

جواب: یسرِ اصل میں "یسری" تھا۔ بقیہ فواصل فجر، عشر، وتر اور حجر کی رعایت رکھتے ہوئے "ی" کو حذف کر دیا۔ قرآنی فواصل نثر میں مسجع عبارت کی طرح ہیں اور مسجع عبارت میں قوافی کا لحاظ ہوتا ہے۔ (التحریر)

قیامت کو بعید از مکان سمجھنے والوں کے لیے ایک تمثیل ہے۔ دوسری بات یہ بھی مترشح ہوتی ہے کہ دنیا اپنے آخری کنارے کو چھو رہی ہے اور اس کی پشت پر قیامت کھڑی ہے بس اتنی دور ہے جتنا صبح کو نمودار ہونے اور رات کی تاریکی چھٹ جانے میں وقت ہے۔ اور انسان اس کو اپنی محدود ترین نظر سے ماپتا ہے کہ کب سے دنیا وجود میں آئی اور نا معلوم کتنی بہاریں اس کو اور بسر کرنی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ بالکل قریب ہے کیونکہ پوری دنیا آخرت کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے "أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ" میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَالْفَجْرِ﴾ اور مابعد کی قسموں کا جواب کیا ہے؟

جواب: ان قسموں کا جواب قسم محذوف ہے۔ بعض حضرات نے ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ سے لے کر ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ کو جواب قسم بنایا ہے۔ لیکن یہ جواب قسم نہیں بنتا بلکہ یہ دلیل الجواب ہے۔ جواب قسم کی تقدیر عبارت یوں ہوگی ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ لَيَصُبَّنَّ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ عَلَى مُكَذِّبِيكَ كَمَا صَبَّ عَلَى عَادٍ وَّثَمُودَ وَفِرْعَوْنَ" (التحریر)

سوال: ﴿هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: اس جملہ کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جملہ معترضہ ہے۔ (التحریر) اور جملہ معترضہ کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔

سوال: ﴿هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ﴾ میں "هل" کس معنی میں ہے؟

جواب: یہ استفہام تقریری ہے یعنی یہاں "ھل" "قد" (تحقیق) کے معنی ادا کررہا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ﴾ کا سلیس ترجمہ اور مفہوم بیان کریں نیز بتائیں عقل کو "حِجر" کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: ترجمہ: یقیناً اس میں عقل والے کے لئے بڑی قسم ہے۔

مفہوم: آیت میں استفہام کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جو اپنے اندر زجر وملامت اور اتمام حجت دونوں مفہوم رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر عقل سے کام لے تو آفاق کی ان نشانیوں میں شہادت تو بہت بڑی ہے لیکن یہ ہٹ دھرم ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے والے نہیں ہیں۔ (تدبر)

"حِجر" کا معنی ہوتا ہے روکنا، منع کرنا۔ چونکہ عقل انسان کو ایسے کاموں سے روکتی ہے جو اس کی شایان شان نہیں ہوتے اس لئے عقل کو "حِجر" کہا جاتا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے "حجر الحاکم علی فلان" جب حاکم کسی کے تصرف پر پابندی عائد کردے۔

سوال: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ میں تذکیر بالمثال ہے۔ تذکیر بالمثال سے کیا مقصود ہوتا ہے؟

جواب: تذکیر بالمثال کے بیان سے نادر الوقوع چیزوں کی جانب ذہن آسانی کے ساتھ مائل ہو جاتا ہے، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ جب لوگ واقعات کو بھول جاتے ہیں اور واقعات کے امکان کو غیر ممکن سمجھتے ہیں تو تذکیر سے ایسی چیزوں کو ذہن سے خارج کر دیا جاتا ہے اور بھولی باتوں کو یاد کرا دیا جاتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۔ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ قوم عاد کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے بتائیں کہ ان کو "عاد إرم" کیوں کہا جاتا تھا؟

جواب: قوم عاد جن کو اس سورۃ میں عاد ارم کے نام سے یاد کیا گیا ہے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں عاد اُولی کے نام سے بھی مشہور ہیں، ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ اس قوم کا مسکن احقاف تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے، ان کی شوکت وحشمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام ونشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل بن گیا۔ ان کو عاد ارم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ (تفہیم القرآن، سورۃ الفجر، سورۃ الاعراف: آیت نمبر ۶۵)

سوال: ﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ قوم عاد کی "ذات العماد" صفت لانے کی وجہ ذکر کریں۔

جواب: "عاد" سے مراد قبیلہ ہے۔ قبیلہ مؤنث ہے۔ اس لیے اس کی صفت مؤنث لائے ہیں۔ "عماد" اونچی اور موٹی لکڑی کو کہتے ہیں جس کو گاڑ کر خیمہ وغیرہ کے کپڑے تانے جاتے ہیں۔ یہاں یہ قوت سے استعارہ ہے کہ یہ قوم بڑی قدو قامت اور بڑا زور بازو رکھتی تھی۔ (التحریر، روح)

''عماد'' اونچے ستونوں کو بھی کہتے ہیں۔ قوم عاد نے سنگ تراشی کے آرٹ میں بہت ترقی کی، دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ انہوں نے ایجاد کیا تھا۔ ان کے امراء ہر اونچی جگہ پر کوئی یادگار تعمیر کرواتے تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو اس مسرفانہ اور نمائش پسندانہ شوق تعمیر پر ملامت بھی فرمائی۔ ﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ○ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ﴾ (الشعراء: ۱۲۸، ۱۲۹) (ترجمہ: تو کیا تم ایک محض فضول یادگار ہر اونچے مقام پر بناتے ہو اور بڑے بڑے محل بناتے ہو شائد کہ تم نے ہمیشہ ہی رہنا ہے) (تفہیم، تدبر) (آجکل بھی یہ ذہنیت پائی جاتی ہے جیسے قطب مینار، یادگار پاکستان، گھنٹہ گھر اور اسلامک سمٹ وغیرہ)

سوال: ﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ "اِرَم" اور "ذات العماد" دونوں موصوف صفت ہیں لیکن دونوں کے اعراب میں فرق کیوں ہے؟

جواب: ارم اور ذات العماد دونوں موصوف صفت ہیں۔ ارم اور ذات العماد دونوں تابع متبوع کے لحاظ سے اعراب میں یکساں ہیں لیکن علامت اعراب مختلف ہیں۔ اصلاً یہ دونوں محل جر میں ہیں۔ اِرم چونکہ غیر منصرف ہے اس لئے محل جر میں بھی اس کی علامت فتح ہے۔

سوال: ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ "ثمود" غیر منصرف کیوں ہے؟ نیز قوم ثمود کا مختصر تعارف بیان کریں۔

جواب: اس میں دو وصف علمیت اور عجمہ جمع ہیں۔ ثمود ایک قوم کا نام ہے۔

یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہے، زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، اسی طرح جغرافیہ نویس بھی ان کا تذکرہ کرتے ہیں، اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے، موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز پر ایک ریلوے اسٹیشن ہے جسے مدائن صالح کہا جاتا ہے، یہی ثمود کا صدر مقام تھا جسے حجر کہا جاتا تھا۔ اب بھی اس شہر خموشاں میں ہزاروں ایکڑ رقبے میں ان کی تراشی ہوئی عمارتیں موجود ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کو ان کے آثار عبرت دکھائے تھے۔ اس قوم کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا اور ایک اونٹنی معجزانہ طور پر ان کو دی گئی تھی۔ (تفہیم، الاعراف: آیت ۷۳)

سوال: ﴿وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ میں "جابوا" کا معنی بتائیں اور "الواد" سے کون سی وادی مراد ہے؟

جواب: جابوا کے معنی تراشنے کے ہیں۔اور "الواد" اصل میں دو پہاڑوں کے درمیان نشیبی جگہ کو وادی کہتے ہیں۔قوم ثمود وادی القری کے مکین تھے۔(روح،التحریر،تدبر)

سوال: ﴿وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ﴾ "ذی الأوتاد" سے کیا مراد ہے؟

جواب: وتد کے لفظی معنی میخ ہے۔لیکن یہ قوت اور فوج سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر فوج خیموں میں رہتی ہے اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں۔یہ تعبیر عرب میں عام ہے۔(تدبر)

سوال: "الفجر،لیال عشر،الشفع والوتر اور اللیل إذا یسر" کی قسمیں اٹھانے کے بعد قوم عاد،ثمود اور فرعون کی تباہی و بربادی کا تذکرہ کرنے میں کیا حکمت پیش نظر ہے؟

جواب: اس سورت میں جزاوسزا پر مختلف انداز میں دلائل پیش کئے گئے ہیں۔سورت کی ابتدا شب وروز کے آفاقی نظام سے روز قیامت پر استدلال کیا گیا ہے اور اس کے بعد اسی مسئلہ کو مزید واضح کرنے کے لیے تاریخی شواہد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کو بھی بطور شاہد پیش کیا گیا ہے۔اور ان قوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے عرب بخوبی آشنا تھے اور ان کے تذکرے عرب میں عام تھے۔

وہ قومیں جو اللہ سے بے خوف اور آخرت سے بےفکر ہو کر زندگی بسر کرتی ہیں وہ زمین میں فسادی بن کر زندگی گزارتی ہیں اور جس قوم نے بھی یہ روش اختیار کی اس قوم پر عذاب الٰہی کا کوڑا ضرور برسا ہے۔اور وہ دوسروں کے لئے عبرت بن کر رہ گئے۔ قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں اور نہ ہی کسی اندھے بہرے قانون پر چل رہی ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص قانون کے تحت چلا رہا ہے۔وہ قانون فطرت کے ساتھ ساتھ قانون اخلاق کو ملحوظ رکھتا ہے۔جب کوئی قوم قانون اخلاق سے تجاوز کرتی ہے اور آخرت کا انکار کرتی ہے آخر کار وہ تباہی کی اندھیری کھڈ میں جا گرتی ہے اور عذاب الٰہی سے دوچار ہوتی ہے۔

دوسری تنبیہ یہ کی جارہی ہے کہ اعمال کی مکمل باز پرس کے لیے بھی ایک ایسا دن ہونا چاہیے جس میں بداعمالیوں کے ابتدائی بیج بونے والوں کو اپنے کئے کا مکمل بدلہ مل سکے۔

سوال: ﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ﴾ میں "الذین" کا محل اعراب بیان کریں۔

جواب: اس پر تینوں محل اعراب صادق آتے ہیں۔اس کو مرفوع بنائیں کہ یہ "ھم" ضمیر مبتدا محذوف کی خبر ہے یا مذمت

کی وجہ سے محل نصب میں لیا جا سکتا ہے یا اس کو ماقبل مذکور کی صفت بنایا جا سکتا ہے۔ (رازی)

سوال: اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت وسیع ہے وہ جب چاہیں اور جیسے چاہیں انسان کو پکڑ سکتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے یہ الفاظ ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (آپ کا رب گھات لگائے ہوئے ہے) کیوں استعمال کئے؟

جواب: بلاشبہ اللہ کی قدرت و طاقت کی کوئی مثال نہیں ہے۔ یہ الفاظ تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ اس میں منکرین قیامت ظالموں اور مفسدین فی الارض کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ تمہارا رب کائنات کو پیدا کر کے اس سے الگ تھلگ نہیں جا بیٹھا بلکہ وہ ہر چیز پر نگاہ اور گھات لگائے ہوئے ہے۔ گھات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مسلح فوجی اپنے دشمن کے انتظار میں اس غرض سے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ زد پر آئے اسی وقت وہ حملہ کر دے۔ قریش مکہ کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ رب کائنات کے حملہ کی زد میں ہیں۔ اور یہ وہ جاہل نادان ہیں جو انجام سے بے فکر اور غافل دندناتے پھر رہے ہیں۔

سوال: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ﴾ میں "ما" کس معنی میں ہے اور "الْاِنْسَانُ" سے کون مراد ہے؟ نیز "ابتلی" کی وضاحت کریں۔

جواب: یہاں "ما" زائدہ ہے اور "الانسان" سے مراد عام انسان ہے کوئی معین شخص مراد نہیں ہے۔ یا یہ کہ انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں۔

ابتلی: باب افتعال اِبْتَلٰی یَبْتَلِی سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ جس کا معنی "امتحان میں ڈالنا، آزمائش کرنا" ہے۔ مادہ: ب، ل، ی۔

سوال: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ﴾ رزق میں فراوانی یا رزق کی تنگی میں اللہ تعالیٰ کو بندے کی کیا آزمائش مقصود ہے؟

جواب: اس آیت میں انسان کی مادہ پرستانہ سوچ پر ضرب لگائی گئی ہے کہ اگر مال ومتاع مل جائے تو اس کا معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کا محبوب نظر اور چہیتا ہے اور اللہ کے ہاں وہ بڑا محترم ومکرم ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے مالک نے اس کو مال صرف اسی مقصد سے دیا ہے کہ اس کی آزمائش اور جانچ پڑتال کرے کہ یہ شکر گزار بنتا یا متکبر۔

اللہ رب العزت صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون سا انسان اپنے مالک کی رضا پر راضی رہتا ہے۔ جاہ وجلال اور مال حاصل کر کے اتراتا ہے یا سراپا شکر وسپاس کی عملی تصویر بنتا ہے۔ فقر ومحتاجگی کے مصائب سے تنگ آ کر بے صبری کا اظہار کرتا ہے یا ہمیشہ صبر ورضا کا دامن تھامے رکھتا ہے۔

سوال: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ﴾ کے بعد لفظ "کلا" لانے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: "کلا" سے ماقبل کی دو آیات میں بیان ہونے والے انسانی رویہ کی نفی مقصود ہے کہ مال و دولت کی عطاء اللہ کی محبوبیت کی دلیل نہیں اور نہ ہی مال سے محرومیت اللہ کی ناراضگی کا اظہار ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اور غیر محبوب دونوں کو ہی نوازتے ہیں اور دونوں پر تنگ دستی بھی کر دیتے ہیں۔ (تدبر)

سوال: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ﴾ میں لفظ "أما" کس معنی میں ہے؟

جواب: اما یہاں تفصیلیہ ہے کیونکہ جہاں بھی اما مکرر آیا ہے وہاں تفصیل کا معنی دیتا ہے۔ (دراسات) "أما" یہاں تفصیلیہ ہے اور شرط کے معنی کو بھی متضمن ہے اسی لئے "الْاِنْسَانُ" کی خبر "فَيَقُوْلُ" پر فاء آئی ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ﴾ میں مبتدا اور خبر کی نشاندہی کریں۔

جواب: الْاِنْسَانُ مبتدا اور فَيَقُوْلُ اس کی خبر ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ﴾ میں یتیموں کے "إکرام" کا کیا مطلب ہے؟

جواب: "إکرام" سے مراد نہایت درجہ پیار و محبت ہے۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مال دار لوگ ان کی کچھ مدد کریں بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ سوسائٹی میں ان کو عزت کا مقام حاصل ہو وہ دھکے کھاتے نہ پھریں بلکہ جہاں بھی جائیں لوگ ان کو احترام سے دیکھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ نے ان کو جو مال عطا فرمایا ہے اس کی کوئی وقعت اللہ کے ہاں ہے تو اسی شکل میں جب یتیموں کی خدمت کر کے ان کا مال اپنے لئے شرف کا مقام پیدا کرے ورنہ شرف کا ذریعہ نہیں بلکہ وبال اور رسوائی ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ کی وضاحت کریں نیز بتائیں کہ یہاں لفظ "تحاضون" اور "طعام" لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: تحاضون کا مادہ ح، ض، ض ہے۔ الحض جس کے معنی الحث علی الخیر (بھلائی کے کام پر ابھارنا) ہے۔ والمحاضة أن يحث كل واحد منهما صاحبه۔ جب کوئی اپنے دوست کو کسی کام پر ابھارتا ہے۔ (لسان)

یعنی معاشرہ میں نہ صرف مسکینوں کی دیکھ بھال مطلوب ہے بلکہ ان کے لیے اپنے دوستوں، عزیز و اقارب کو ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی تلقین مقصود ہے۔ یعنی ان کے لیے اجتماعی اور قومی سطح پر کام ہونا چاہیے۔ ان کے لیے

ویلفیئر اور تنظیمیں تشکیل دی جائیں۔ جو ہمہ وقت ان کی دلجوئی کے لیے سرگرم عمل ہوں۔

سوال: ﴿وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے اسلام اور زمانہ جاہلیت کے قانون وراثت کا مختصر تقابل پیش کریں۔

جواب: زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو وراثت سے حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے زعم کے مطابق وراثت صرف ان لوگوں کا حق تھا جو لڑائی کے قابل ہوں اور کمائی کر سکتے ہوں۔ اگر کوئی بااثر شخص ہوتا تو وہ سارا مال شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کر جاتا۔ بوڑھی ماں، یتیم بچے اور بیوگان ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن اسلام نے اس اندھیر نگری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اگر کوئی ناسمجھ بھی ہے بلکہ اگر کوئی حمل کی صورت میں ہے اس کے حصہ کو محفوظ رکھا ہے۔

افسوس صد افسوس آج ہمارا معاشرہ جو بڑا ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے۔ اس کا دعوی ہے کہ اس نے علم ونور کی بڑی بڑی منازل طے کر لی ہیں تاہم وراثت کے باب میں ہم بدو اور اجڈ ہی ہیں۔ بیوگان اور یتیم بچوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اگرچہ حکومت نے ان کے حقوق کی قانون سازی کی ہے، لیکن پھر بھی طاقتور لوگ کبھی بزور طاقت اور کبھی مختلف حیلوں بہانوں سے کمزوروں کی وراثت پر قبضہ کرتے ہیں۔

سوال: ﴿وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ ''اَكْلًا لَّمًّا'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: کلام عرب میں ''لمم'' کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ لما: لَمَّ يَلُمُّ سے مصدر ہے۔ أكلا کی صفت لمًّا مصدر ہے جو مبالغہ کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ (انوار، التحریر)

سوال: ﴿وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ ''جمًّا'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: الجم الکثیر: عربی محاورے میں ''جم الماء فی الحوض'' اس وقت بولتے ہیں جب حوض میں پانی کی مقدار وافر ہو اور اسی طرح ''بِئْرٌ جَمُوْمٌ'' اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں وافر پانی ہو۔ یعنی یہ کثرت کے معنی ادا کرتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ○ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ کے بعد لفظ ''کلا'' کیا مفہوم ادا کر رہا ہے؟

جواب: یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کی تم دنیا میں یہ سب کچھ کرتے رہو اور اس کی باز پرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزاو سزا کا انکار کر کے تم یتیموں کے مال کھاتے ہو اور مال کی محبت میں حد سے بڑھے ہوئے ہو وہ سزا ضرور ملے گی۔ وہ کوئی نہونی اور خیالی بات نہیں ہے۔ بلکہ وہ پیش آنی ہے اور اس وقت آنی ہے جس کے ذکر آگے آ رہا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ "إذا" شرط کیلئے آیا ہے اس کا جواب شرط کونسا جملہ ہے؟

جواب: إذا شرط کیلئے ہے۔جس کا جواب شرط یومئذ یتذ کر الإنسان ہے۔(اعراب)

سوال: ﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ میں "دکت" کا لغوی مفہوم کیا ہے؟ نیز "دَكًّا دَكًّا" کی وضاحت کریں۔

جواب: پہاڑ اور دیوار کے گرنے کو الدك سے تعبیر کیا جاتا ہے یا دیوار اور پہاڑ کے ٹوٹنے کو بھی کہتے ہیں۔فراء کہتے ہیں زمین کا دک ہونا اس کا ہلنا مراد ہے۔(لسان)

دکا دکا: یہ دونوں مصدر مفرد کی تاویل میں مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہیں۔جو نوع کو بیان کرتے ہیں۔اس کی وضاحت اس طرح ہوگی "أنه دك يعقب بعضه بعضاً"۔ پے در پے زلزلہ کا واقع ہونا۔جس طرح کوئی کہے: قرات الكتاب بابا بابا میں نے کتاب سبق سبق کر کے پڑھی۔(التحریر) اس کا معنی یہ ہے کہ یہ زمین ہر لحاظ سے برابر کر دی جائے، پہاڑ ہونگے نہ دریا۔

سوال: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ کا ترجمہ کریں۔

جواب: اور آپکا رب آئے گا۔بعض مفسرین نے اس آیت میں تاویل کی کوشش کی ہے، جو اہل سنت کے موقف سے بالکل متضاد ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات وافعال کی نسبت اہل سنت کا موقف مبنی بر کتاب وسنت ہے کہ اللہ رب العزت کی صفات و افعال کو من وعن ہی جانا جائے جس طرح کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں کہ ان میں تعطیل وتمثیل ہے اور نہ ہی تشبیہ وتاویل۔

سوال: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ میں لفظ "رَبُّكَ" اور "الملك" کے درمیان "واو" عاطفہ ہے یا حالیہ ہے نیز اس سے معنی میں کیا فرق ہوگا؟

جواب: "والملك" اگر "ربك" سے حال ہو تب معنی ہوگا "اور تیرا رب آئے گا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف ہوں گے"۔اگر "والملك" کو "ربك" کا معطوف قرار دیں تب معنی ہوگا "اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے صف در صف آئیں گے"۔

سوال: ﴿وَجِاْىٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ﴾ جہنم کو کیوں اور کہاں لایا جائے گا؟

جواب: جنت اور جہنم دونوں کو اس دن بے نقاب کر کے پیش کیا جائے گا۔﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ﴾ (ترجمہ: اور جنت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی اور گمراہوں کے سامنے دوزخ ظاہر کر دی جائے گی) (الشعراء: ٩٠، ٩١) کیونکہ یہاں خطاب معاندین کو ہے۔اس لئے یہاں صرف جہنم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ان کو ان کی اصلی

صورت میں اس لئے پیش کیا جائے گا تاکہ منکرین کو اپنے ٹھکانہ معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے نابکار اور منکر کہیں گے: ﴿يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ (الفجر: ٢٤) اور مطیع وفرمانبردار جنت کو دیکھ کر کہے گا کہ کاش میں نے اور زیادہ نیکیاں کمائی ہوتیں تاکہ مجھے اور بلند مقام نصیب ہوتا۔

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ﴾ میں "یتذکر" کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اس روز یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اس پر نادم ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ کہ اس روز اس کو یہ سمجھ آئے گی جو کچھ انبیاء ورسل نے بتایا تھا وہی سچ تھا اور ان کی بات کو نہ مان کر اس نے حماقت کی ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى﴾ میں "أنّی" کس معنی میں ہے؟ نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: "أنّي" عام طور پر دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ "أین" کے معنی میں، یا "کیف" کے معنی میں۔ یہاں "أنّي" "کیف" کے معنی میں استعمال ہو تو ترجمہ یوں ہوگا "(اس وقت) انسان کا یاد کرنا کیسے سودمند ہو سکتا ہے" اور اگر یہ أین کا معنی میں ہو تب معنی ہوگا "اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں"۔

سوال: ﴿يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ یہ خوب کار کہے گا یا سیاہ کار؟

جواب: ممکن ہے ہر انسان جہنم کو دیکھ کر کہے۔ اگر سیاہ کار ہوگا تو خواہش کرے گا کہ کاش کچھ نہ کچھ نیکیاں کی ہوتیں اور جان بخشی ہو جاتی۔ اور اگر خوب کار ہوگا تو کہے گا: کاش میں مزید نیکیاں کما لیتا تاکہ اور بلند مقام حاصل کر لیتا۔ لیکن سیاق کلام سے یہ مجرموں کی کلام معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ﴾ میں "وثاقه" منصوب کیوں ہے؟ نیز آیت کا لغوی اور سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: "وثاقه" منصوب بنزع الخافض (مفعول مطلق) ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ترجمہ: "نہیں باندھے گا اس جیسا باندھنا کوئی ایک" (کوئی نہیں باندھے گا اس جیسا باندھنا)۔

سوال: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ "نفس مطمئنة" سے کون سا نفس مراد ہے نیز اطمینان کا کیا معنی ہے؟

جواب: نفس مطمئنہ سے وہ شخص مراد ہے جو کسی شک وشبہ کے بغیر اللہ رب العزت کو یکتا وتنہا الٰہ مانتا رہا اور ان اوامر ونواہی کی اخلاص دل سے تعمیل کرتا رہا۔ انبیاء ورسل کی اطاعت وفرمانبرداری کو نفسانی خواہشات پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا۔ اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات، مصائب اور آزمائشوں کو خوش دلی سے قبول کرتا رہا۔ (تفہیم، التحریر)

اطمینان: غیر متردد اور غیر مضطرب دل، طیب خاطر اور خوش دلی کو کہتے ہیں۔

سوال: ﴿ارْجِعِيْ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ یہ انسان کو کب کہا جائے گی؟

جواب: یہ بات اس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اٹھ کر میدان حشر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی اور جب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اس وقت بھی کہی جائے گی۔ ہر مرحلے پر اسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جارہا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ دونوں جگہ فعل ایک ہی ہے لیکن پہلے فعل کے بعد "فی" صلہ ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس فرق کی وضاحت کریں۔

جواب: "دخل" کے بعد اگر ظرف مکان ہو تو "فی" داخل نہیں ہوتا، جیسے: وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ اور دخل المدینة ہے، اور اگر ظرف مکان نہ ہو تو "فی" آئے گا۔ جیسے: ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ اور ﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ﴾ ہے۔ کیونکہ عباد میں اگر انسان داخل ہوگا تو ان میں گھل مل جائے گا، لیکن اگر مکان میں داخل ہوگا تو اس کیساتھ اختلاط نہیں ہوگا یعنی گھلے ملے گا نہیں۔ اسی لئے دخلت المسجد کہتے ہیں دخلت فی المسجد کہنا درست نہیں ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا وجہ اعراب بتائیں۔

إرم، مثلها، ثمود، فرعون، ذی الأوتاد، الفساد، سوط عذاب، الإنسان، أكلاً، لمًّا، جمًّا، الأرض، صفًّا، بجهنم، عذابه، وثاقه، النفس، المطمئنة، راضية، مرضية۔

جواب: إرم: یہ عاد سے عطف بیان ہے۔

مثلها: يخلق مضارع مجہول کا نائب الفاعل ہے۔

ثمود: یہ عاد کا معطوف ہے۔ غیر منصرف ہونے کی بنا پر جر کی علامت فتح ہے۔

فرعون: یہ بھی عاد پر معطوف ہے۔ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے جر کی علامت فتح ہے۔

ذی الأوتاد: فرعون سے صفت ہے۔ اور حالت جری ہے۔

الفساد: أكثروا کا مفعول بہ ہے۔

سوط عذاب: اضافی ترکیب ہے اور صَبَّ کا مفعول ہے۔

الإنسان: مبتدا ہے اور فیقول اس کی خبر ہے۔

أكلا: تأكلون سے مفعول مطلق ہے۔

لما: أكلا سے صفت ہے۔

جما: حباً کی صفت ہے۔

الأرض: دكت ماضی مجہول کا نائب الفاعل ہے۔

صفاً: پہلے صفاً سے بدل ہے۔

بجهنم: باء جارہ کی وجہ سے مجرور ہے اور علامت جر فتح ہے۔ کیونکہ جہنم غیر منصرف اسم ہے۔

عذابه: يعذب سے مفعول مطلق ہے۔

وثاقه: يوثق سے مفعول مطلق ہے۔

النفس: أيتها سے حال ہے۔

المطمئنة: النفس کی صفت ہے۔

راضية: ارجعي کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

مرضية: ارجعي کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب ذکر کریں۔

التى لم يخلق ، الذين جابو االصخر ، جابوا الصخر ، الذين طغوا ، صب عليهم ، ابتله ربه ، نعمه ، فيقول ، ربى أكرمن ، أكرمن ، جاء ربك ، جاى ء ، يتذكر الإنسان ، أنى له الذكرى ، الذكرى ، يقول يليتنى ، قدمت لحياتى ، لا يعذب ، ارجعى إلى ربك ، فادخلى۔

جواب: التى لم يخلق: إرم کی صفت ہونے کی بناء پر محل جر میں ہے۔

الذين جابو الصخر: ثمود کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

جابوا الصخر: لا محل لها من الاعراب۔ کیونکہ یہ موصول کا صلہ ہے۔

الذين طغوا: یہ فرعون کی صفت ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

صب عليهم: اس کا عطف أكثروا پر ہے أكثروا کا طغوا پر اور طغوا کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ الذين کا صلہ ہے۔

ابتلاہ ربہ: إذا کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

نعمہ: اس کا عطف ابتلاہ پر ہے اور محل جر میں ہے۔

فیقول: الإنسان مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

ربی أکرمن: یقول کا مقولہ ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

أکرمن: حالت رفع میں ہے۔ ربی مبتدا کی خبر ہے۔

جاء ربك: اس کا عطف دکت پر ہے اور دکت إذا کا مضاف الیہ ہے۔ اس لئے محل جر میں ہے۔

جائ: أیضاً

یتذکر الإنسان: إذا شرط غیر جازم کا جواب ہے اس لئے لا محل لھا من الأعراب۔

أنی لہ الذکریٰ: جملہ معترضہ ہے۔ لا محل لھا من الأعراب۔

قدمت لحیاتی: یقول کا مقولہ ہونے کی وجہ سے محل نصب ہے۔

لا یعذب: جملہ مستأنفہ ہے لا محل لھا من الأعراب۔

ارجعی الی ربك: جواب الندا ہے۔ (أیضاً)

فادخلی: أیضا

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں۔

یسر، لم تر، جابوا، طغوا، المرصاد، ابتلیٰ، نعم، أکرمنی، أھاننی، تحٰضّون، دکّت، جائیء، الذکریٰ، یوثق، وثاق، مطمئنۃ، ارجعی، راضیۃ، مرضیۃ، أدخلی۔

جواب: یسر: ''سَرٰی یَسْرِی سَرْیًا'' (ض) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے، اصل میں یَسْرِیُ تھا۔ ی طرف میں کسرہ کے بعد واقع ہوئی اس لئے اسکی حرکت کو گرادیا۔ مادہ: س، ر، ی۔ معنیٰ: وہ چلتا ہے۔

لم تر: ''رَاٰی یَرٰی رَاْیًا'' (ف) سے واحد مذکر حاضر مضارع معلوم نفی بلم۔ لم جازمہ کی وجہ سے حرف علت ی حذف ہوا۔ مادہ: ر، ء، ی۔ معنیٰ: تم نے نہیں دیکھا۔

جابوا: ''جَابَ یَجُوْبُ جَوْبًا'' (ن) سے جمع مذکر غائب، ماضی معلوم ہے۔ اصل میں جَوَبُوا تھا۔ ''واؤ متحرک ماقبل مفتوح'' واؤ کو الف سے بدلا جابوا ہوگیا۔ مادہ: ج، و، ب۔ معنیٰ: انہوں نے تراشا۔

طغوا: ''طَغٰی یَطْغِی طَغْیًا'' (ف) سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں طَغَیُوْا تھا۔ یا متحرک ماقبل مفتوح الف سے بدلا۔ طغاوا ہوا۔ اجتماع ساکنین کی وجہ سے الف کو گرایا۔ طغوا ہو گیا۔ مادہ: ط، غ، ی۔ معنی: انہوں نے سرکشی کی۔

المرصاد: ''رَصَدَ یرصُدُ رَصْدًا'' (ن) سے ظرف مکان ہے۔ مادہ: ر، ص، د۔ اس کی جمع مراصید ہے۔ بعض نے اس کی جمع مراصد بتائی ہے جو کہ خطا ہے۔ مراصد مرصد کی جمع ہے۔ مرصد کا معنی ہے: ستاروں کی گردش دیکھنے کی جگہ۔ (القاموس)

ابتلی: باب افتعال ''اِبْتَلٰی یَبْتَلِی اِبْتِلَاءًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ب، ل، ی۔ اصل میں ابتَلَیَ تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا، ابتلا، ابتلی یہ صورت رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ معنی: اس نے آزمایا۔

نَعَّمَ: باب تفعیل ''نَعَّمَ یُنَعِّمُ تَنْعِیْمًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ن، ع، م۔ معنی: اس نے نعمتوں سے نوازا۔

أکرمن: باب افعال ''أَکْرَمَ یُکْرِمُ إِکْرَامًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ نون وقایہ اور آخر میں یائے متکلم وقف کی وجہ سے محذوف ہے۔ مادہ: ک، ر، م۔ معنی: اس نے میرا اکرام کیا۔

أهانن: باب افعال ''أَهَانَ یُهِینُ إِهَانَةً'' سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ آخر میں نون وقایہ اور یائے متکلم وقف کی وجہ سے حذف ہوئی ہے۔ اصل میں أَهْوَنَ تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح واؤ کو الف سے بدلا، أهان ہو گیا۔ معنی: اس نے میری بے عزتی کی۔

تحاضّون: باب تفاعل ''تَحَاضَّ یَتَحَاضُّ تَحَاضًّا'' سے جمع مذکر حاضر، مضارع معلوم ہے۔ اصل میں تتحاضون تھا۔ اس کی ایک تا کو حذف کر دیا۔ مادہ: ح، ض، ض۔ معنی: تم ابھارتے ہو۔

دکت: ''دَكَّ یَدُكُّ دَكًّا'' (ن) مضاعف ثلاثی سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ مادہ: د، ک، ک۔ معنی: اس کو گرایا گیا۔

جائ: ''جَاءَ یَجِیْءُ جَیْئًا وَمَجِیْئًا'' (ض) واحد مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔ مادہ: ج، ی، ء۔ معنی: معنی: اسے لایا گیا۔

الذکریٰ: ''ذَکَرَ یَذْکُرُ ذِکْرًا'' سے مصدر ہے۔ ذکر یذکر ذکراً و ذُکرا ذِکری وتذکاراً۔ اور بطور اسم بھی مستعمل ہے جس کی جمع ذکریات آتی ہے۔ معنی: نصیحت۔

یوثق: باب افعال ''أَوْثَقَ یُوْثِقُ اِیْثَاقًا'' سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: و، ث، ق۔ معنی: وہ باندھے گا۔

وثاقه: باب افعال ''أَوْثَقَ یُوْثِقُ'' سے اسم مصدر ہے۔ اصل میں اس کا مصدر ایثاق ہے۔ یا اسم جامد ہے۔ (اعراب)
معنی: اس کا باندھنا۔

مطمئنة: باب افعِلّال ''اَطْمَأَنَّ یَطْمَئِنُّ اِطْمِیْنَانًا'' سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ معنی: خوش ہونے والی۔

ارجعی: ''رَجَعَ يَرْجِعُ رَجْعًا'' (ض) سے واحد مؤنث امر حاضر معروف ہے۔ مادہ: ر، ج، ع۔ معنی: تم لوٹو۔

راضیة: ''رَضِيَ يَرْضٰى رِضًا وَرِضْوَانًا'' (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ر، ض، و۔ معنی: راضی ہونے والی۔

مرضیة: ''رَضِيَ يَرْضٰى'' (ع) سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ مادہ: ر، ض، و۔ معنی: راضی کی جانے والی۔

اصل میں مَرْضُوْيَةٌ تھا۔ واؤ، یا دونوں ایک کلمہ میں اس طرح جمع کہ اول ساکن۔ پہلے کو یا سے بدلا۔ اور یا کا یا میں ادغام کیا، مَرْضُيَّةٌ ہوا۔ ضاد کی حرکت کو ی کی مناسب حرکت کسرہ میں بدلا۔ مَرْضِيَّةٌ ہوا۔

ادخلی: ''دَخَلَ يَدْخُلُ دُخُوْلًا'' (ن) سے واحد مؤنث امر حاضر معروف ہے۔ مادہ: د، خ، ل۔ معنی: تو داخل ہو۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ① وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ② وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا
الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ④ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ⑤ يَقُوْلُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ⑥
أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ أَحَدٌ ⑦ أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ⑧ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ⑨ وَهَدَيْنٰهُ
النَّجْدَيْنِ ⑩ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ⑪ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ⑫ فَكُّ رَقَبَةٍ ⑬ أَوْ
إِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ⑭ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ⑮ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ⑯ ثُمَّ كَانَ
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ⑰ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ
الْمَيْمَنَةِ ⑱ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ⑲ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ⑳

سوال: اس سورت کا ماقبل سورت سے کیا تعلق ہے؟

جواب: سورۃ الفجر اور سورۃ البلد کے مضمون میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ سابقہ سورت میں انسان کی غلط فہمی پر متنبہ کیا گیا ہے کہ جب وہ اللہ رب العزت کی نعمتوں سے سرفراز ہو تو اتراتا اور اکڑتا ہے اور کوئی آزمائش وابتلاء کا دور شروع ہو جائے تب مایوس شکستہ دل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں حالتوں میں عزت افزائی کا کوئی پہلو ہے اور نہ ذلت ورسوائی کا، بلکہ اس میں تو صبر ورضا اور شکر وسپاس کا امتحان ہے۔

اس سورت میں اسی قاعدہ کو قریش پر منطبق کیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ سرزمین مکہ وہ جگہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس زمانے میں بسایا جب یہ بے آب وگیاہ تھا اور امن وآشتی سے بالکل محروم، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا جو انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے فرمائی تھی اس کی وجہ سے یہاں رزق وامن کی فروانی ہے۔ اسی امن ورزق کا یہ فیضان ہے کہ اولاد اسماعیل یہاں خوب پھلی پھولی اور اس پورے ملک پر ان کی قیادت کا سکہ رائج ہے لیکن یہ نعمتیں پا کر یہ لوگ اترانے لگے اور ان نعمتوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان کی آنکھیں عبرت نگاہی سے محروم اور زبانیں حق گواہی

سے گنگ ہو چکی ہیں۔ان کا مال اپنی من پسند عیاشیوں اور فضول کاموں میں خرچ ہوتا ہے لیکن مسکینوں و یتیموں پر کوئی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔(تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع دنیا میں انسان کی حیثیت واضح کرنا اور اسے یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے سعادت و شقاوت کے دونوں راستے بڑی وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں اور پھر ان راستوں کے اختیار کے لئے مطلوبہ وسائل بھی فراہم کر دیئے ہیں اب یہ حضرت انسان پر منحصر ہے کہ وہ سعادت کا راستہ اختیار کر کے ابدی کامیابی حاصل کرتا ہے یا شقاوت کا راستہ اختیار کر کے ابدی ناکامی سے اپنا چہرہ سیاہ کرتا ہے۔

ابتدا میں شہر مکہ، اس شہر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والے مظالم اور تمام اولاد آدم کی عمومی حالت کو اس بات پر بطور گواہ پیش کیا گیا ہے کہ دنیا آرام کا گھر نہیں بلکہ سراسر آزمائش کی جگہ ہے۔ پھر اس انسان کے زعم باطل کا رد ہے جو دنیا کو کھیل تماشہ سمجھ کر من مانی کرتا ہے اور اسے کسی نگران اعلیٰ کا خوف نہیں ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو علم اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عطاء کر کے اچھائی اور بھلائی دونوں راستے واضح کر دیئے ہیں۔ ایک راستہ بہت دشوار گزار ہے جسے عبور کرنا دراصل بہت مشکل کام ہے لیکن یہ راستہ بلندی اور سرفرازی کا رستہ ہے۔ اسے عبور کرنے کے لیے اپنا مال یتامیٰ اور مساکین پر خرچ کرنا ہوگا، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لانے والے گروہ میں شامل ہو کر ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہوگا جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضے پورے کرنے والا اور مخلوق پر رحم کرنے والا ہو، اس راستے کے مسافر ابدی نعمتوں کے مستحق ہوں گے۔ اس کے برعکس راستے کے مسافر ہمیشہ کی جہنم میں داخل ہوں گے۔ جس سے نکلنے کے تمام راستے بند ہوں گے۔(تفہیم)

سوال: ﴿لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ میں "لا" کس معنی میں ہے؟

جواب: جب کلام کی ابتدا "لا" سے ہو رہی ہو اور اس کے بعد قسم کھا کر اگلی بات شروع کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخاطبین کے ذہن میں ایک باطل خیال موجود ہے جس کا رد "لا" کے ساتھ کرنا مقصود ہے۔ اس سورت میں مشرکین مکہ کے باطل نظریات کا رد مقصود ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہماری دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اس میں ہم جو چاہیں کریں ہم کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف اشیاء کی قسم اٹھا کر ان کے اس خیال کا رد کیا ہے اور صحیح بات کو واضح کیا ہے۔(تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ "بهذا البلد" سے کیا مراد ہے؟

جواب: راجح قول کے مطابق "هذا البلد" سے مراد شہر مکہ ہے۔ اس سے اگلی آیت ﴿وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ بھی

اس قول کی مؤید ہے۔

سوال: ﴿وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ﴾ کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: یہ جملہ معترضہ ہے اور جملہ معترضہ کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ﴾ میں ”حِلٌّ“ کا معنی ذکر کرتے ہوئے اس آیت کی تفسیر کریں۔

جواب: یہاں ”حِلٌّ“ میں تین معانی کا احتمال ہے۔

۱:۔ ”حلٌّ“ بمعنی ”حالٌّ“ یعنی ”أنت حالٌّ فی هذا البلد“ آپ اس شہر میں مقیم ہونے والے ہیں۔ اور آپکی اقامت کی وجہ سے اس کی عظمت میں اور اضافہ ہوگا۔

۲:۔ ”مستحِلّ“ یعنی آپ اس شہر کو حلال کرنے والے ہیں۔ ”أی یحلُّ لك هذا البلد“۔ اگرچہ یہ شہر حرم ہے مگر تھوڑے وقت کے لیے آپ کے لیے دشمنان دین پر حملہ کرنا اور بعض کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہو جائے گا۔

۳:۔ ”حِلٌّ“ بمعنی ”مستحَلّ“ یعنی آپکو اس شہر میں حلال سمجھ لیا گیا ہے جو چاہے آپ پر ظلم کرے۔ قریش کے ہاں ہر چیز یہاں تک کہ خون خوار جانوروں کے لیے بھی امن ہے اور خاردار جھاڑیوں کو کاٹنا ممنوع ہے لیکن امن کے خوگر، سچائی کا دلدادہ، امانت دار رسول کی عزت اور خون حلال سمجھ لیا گیا ہے۔ تیسرا مفہوم ہی لاحقہ نظم سے ملتا ہے۔ (تفہیم، روح، التحریر، البحر)

سوال: ﴿وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ﴾ ”بِهَٰذَا الْبَلَدِ“ کے لفظ کو مکرر کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: اس لفظ کو دوبارہ اس لئے لایا گیا ہے تاکہ دلوں میں تعجب کو برانگیختہ کیا جائے اور بظاہر ناممکن فتح مکہ کو یقینی طور پر بیان کیا جائے۔ (التحریر)

سوال: ﴿وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ﴾ سے کون مراد ہیں؟

جواب: یہاں والد اور اس کی ذریت کو بطور شہادت ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور انکی ذریت ہے یہ مؤقف امام فراء رحمۃ اللہ علیہ نے معانی القرآن میں اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے تفہیم میں اختیار کیا ہے۔ صاحب تدبر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد لئے ہیں۔

سوال: ﴿وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ﴾ ”ما“ غیر ذوی العقول کیلئے مستعمل ہے یہاں ذوی العقول کے لیے کیوں استعمال ہوا ہے؟

جواب: ما ذوی العقول کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس پر بہت سی قرآنی نظائر موجود ہیں۔ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ

وَالْاُنْثٰی﴾(اللیل:۳)﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾(النساء:۳)﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾(النساء:۲۲)

یہاں "مَن" کے استعمال سے اس لیے اعراض کیا گیا ہے کہ "ما" میں "مَن" کی نسبت ابہام بہت زیادہ ہے اور اس میں بالاتفاق مکمل نکارت پائی جاتی ہے۔ اور تفخیم شان کے لیے لفظ کو نکرہ استعمال کرنا عرب میں عام ہے۔

سوال: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ﴾ میں "كَبَدٍ" کا لغوی معنی اور اس آیت کی وضاحت کریں۔

جواب: "كَبَدٍ" مشقت کے معنی میں ہے۔ "کبد یکبد" بروزن "فرِح" سے مصدر ہے اس کے معنی ہیں: جب انسان کا جگر تکلیف میں ہو۔ پھر اس کے بعد ہر مشقت والے کام کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ (اعراب)

جہاں تک اس جملے کی تفسیر کا تعلق ہے یہ وہ بات ہے جس پر شہادت دی گئی ہے کہ انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے انسان اس دنیا میں مزے اڑانے اور نیند کے خراٹے بھرنے نہیں آیا بلکہ کوئی بھی انسان پیدائش سے موت تک پُر مشقت گھاٹیاں سر کئے بغیر زندگی کا سفر مکمل نہیں کر سکتا یہ شہرِ حرم گواہ ہے کہ کس طرح اس کے محبوب نے جانفشانی سے کام لیا اور یہ شہر بسایا۔ یہ مکہ مرکز بنا اس شہر حرام میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت زار بول بول کر گواہی دے رہی ہے کہ وہ ایک مقصد حقیقی کے لیے کس طرح جان جوکھوں میں ڈال کر مصائب جھیل رہے ہیں اور ہر انسان جس طرح کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر زندگی کے آخری لمحہ تک زندگی گزارتا ہے یہ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے (تفہیم)

سوال: ﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ﴾ "یحسب" کے دو مفعولوں کی وضاحت کریں۔

جواب: أن مخففہ من المثقلہ ہے اصل میں "أنه" تھا۔ جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں ہے: ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا﴾ (طٰہٰ:۸۹) "ألا یرجع" اصل میں "أنه لا یرجع" تھا اور "ہٗ" کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہے اور اس نے اپنے بعد والے جملے کو مصدر کی تاویل میں کر دیا اس لئے یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

سوال: ﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ﴾ کی اعرابی حالت واضح کریں اور آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: اس آیت کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قدرت نہیں پا سکے گا؟

سوال: ﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: اس آیت کا بھی کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جملہ مستأنفہ ہے۔

سوال: ﴿یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ میں "لُبَدًا" کی لغوی وضاحت کریں اور صیغہ بتائیں۔

جواب: لُبَدًا: "لبدۃ" کی جمع ہے۔ "لَبِدَ یَلْبَدُ لَبَدًا" (ع) کا معنی تہہ در تہہ جمع ہونا ہے۔ "لُبْدَۃٌ" کا معنی کثیر مال ہے یعنی تہہ در تہہ جمع مال۔ "لُبْدَۃٌ" باب "لبِد یلْبَدُ" سے اسم ہے۔ مادہ: ل، ب، د۔

سوال: "أَنْفَقْتُ مَالًا لُّبَدًا" کی بجائے ﴿اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ استعمال کیا ہے اسکی وضاحت کریں۔

جواب: ﴿اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ کے معنی ہیں میں نے بہت سا مال ہلاک کیا، اڑایا، لٹایا۔ یہ الفاظ اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ یہ کس قدر گھمنڈ اور فخر وغرور میں گھرا ہوا شخص ہے کہ اس کو اپنی مالداری پر کس قدر فخر تھا۔ اور یہ مال اس کے مقابلے میں کس قدر ہیچ تھا۔ اس کو لٹانے میں اس کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کیا یہ کسی رفاہی کام میں تھا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ جوئے میں لاکھوں کی بازی ہارنا، یا جوا جیتنے پر اونٹ پر اونٹ ذبح کرنا۔ اظہار و نمائش پر بے جا سرمایہ پانی کی طرح بہا دینا۔ یا تقریبات میں مختلف النوع کھانوں سے بھری میز ہوں، یا ڈیروں کی نمود کے لیے دن رات دعوت عام کا انتظام کرنا اس طرح کے کاموں میں خرچ کرتا ہے تاکہ دور دور تک اس کی دریا دلی، کشادہ دستی، فیاضی کے ڈنکے بجیں۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ۝ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ﴾ اور ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ﴾ میں استفہام کن معانی کے لئے استعمال ہوا ہے؟

جواب: ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ﴾ میں استفہام تہدیدی ہے کہ دھمکایا اور جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ تمھارا یہ صرف وہم ہے۔ ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ﴾ میں استفہام انکاری ہے کہ ضرور کوئی ہستی موجود ہے جو اس کے اعمال پر نظر رکھے ہوئے اور ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ﴾ میں استفہام تقریعی ہے یعنی انسان کی یاددہانی اور جھنجھوڑنے کے لیے۔

سوال: ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ﴾ کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: یہ جملہ مستأنفہ ہے اس لئے اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

سوال: ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ﴾ میں "نجعل" کے دو مفعولوں کی وضاحت کریں۔

جواب: بعض علماء نے اس کو "نخلق" کے معنی میں لیا ہے تب اس کے دو مفعولوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر "نجعل" کے معنی بذاتہ مراد ہوں تب "لہ" "کائنا" مفعول بہ ثانی محذوف کے متعلق ہوگا۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ﴾ "شفتین" صیغہ بتائیں، تعلیل کریں اور اسکی جمع ذکر کریں۔

جواب: یہ "شفة" کی تثنیہ ہے۔ "شفة" اصل میں "شفهة" تھا اس لئے کہ اس کی تصغیر "شفيهة" اور جمع "شفاه" آتی ہیں۔ اس کی جمع سالم نہیں آتی۔ مادہ: ش، ف، ہ۔

سوال: ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ میں "نجد" کی لغوی وضاحت کریں اور آیت کی مناسب تشریح کریں۔

جواب: اس کی جمع "نجود" آتی ہے۔ اس کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہے۔ اس کا مرادی معنیٰ یہ ہے کہ انسان کی خیر اور شر دونوں راستوں کی طرف راہنمائی کی گئی ہے، یہ نہیں کہ اسے محض عقل وفکر کی طاقتیں عطاء کر اسے چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ اس کی مختلف ذرائع سے راہ نمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر کے رکھ دیے، تا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کر لے۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (ترجمہ: پھر اس کی بدی اور نیکی اسکو سمجھا دی) (الشمس: ۸) اور ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (ترجمہ: ہم نے اسے راستے کی راہنمائی کردی، چاہے تو شکر گزار ہو جائے یا ناشکرا بن جائے) (الانسان: ۳) میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔

سوال: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "اقتحم المكان" کا معنیٰ کسی جگہ زبردستی گھسنا، "اقتحم الأمر العظيم" کسی عظیم کام کے انجام سے بے پرواہ ہو کر کود پڑنا۔ "اقتحم العقبة" کسی گھاٹی کو عبور کرنے کا خطرہ مول لینا۔ عقبة: دشوار گزار پہاڑی راستہ۔ (القاموس)

سوال: جب ماضی پر "لا" داخل ہو تو اسکا تکرار ضروری ہے مثلاً ﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ (القیامۃ: ۳۱) لیکن ﴿ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ کے بعد "لا" کا تکرار نہیں ہے اسکی توجیہ ذکر کریں۔

جواب: قاعدہ یہی ہے کہ جب ماضی پر "لا" داخل ہو تو اس کا تکرار ضروری ہے لیکن صرف لفظاً تکرار ضروری نہیں معنیً بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً "لا جائني زيدٌ وعمروٌ" یہاں اگرچہ "لا" کا لفظاً تکرار نہیں لیکن معنیً تکرار ہے یعنی "لا جائني زيد ولا جائني عمروٌ"۔ اسی طرح اس سورت میں بھی ہے۔ "فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ......ولا فك رقبة ولا أطعم مسكينا أو يتيما ثم لا كان من الذين امنوا ...... الخ۔ (روح، التحریر)

سوال: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ﴾ کی ترکیب کریں۔

جواب: "وما أدْرٰكَ" میں "ما" اسم استفہام مبتدا "أدرىٰ" فعل هُوَ ضمیر فاعل، "كَ" ضمیر مفعول اول "ما" مبتدا اور "العقبة" اصل میں "اقتحام العقبة" ہے جو کہ خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ "أدرىٰ" کا مفعول ثانی ہوا۔ یہ جملہ فعلیہ "ما" مبتدا کی خبر ہوا۔

سوال: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ میں "فَكُّ" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: یہ "هِيَ" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ "مسغبة" کیا صیغہ ہے؟

جواب: یہ "سَغَبَ يَسْغُبُ" (ن) سے مصدر میمی ہے اور آخر میں تا مبالغہ کے لیے ہے۔ مادہ: س، غ، ب۔ (اعراب)

سوال: ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ میں "مَسْغَبَةٍ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: مَسْغَبَةٍ: "سَغَبَ يسغُبُ سَغْبًا وَسُغُوبًا" (ن) سے مصدر میمی ہے جس کا معنی سخت بھوکا اور تھکا ہوا ہونا یا "سغِبَ يسْغَبُ" (ع) سے ہے جس کا معنی قحط زدہ ہونا یا فاقہ کشی میں ہونا گویا "مَسْغَبَةٍ" کا معنی قحط، بھوک اور فاقہ کشی ہے۔

سوال: ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ "ذِي مَسْغَبَةٍ" ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے؟

جواب: "ذِي مَسْغَبَةٍ" مضاف مضاف الیہ ہو کر "يَوْمٍ" مجرور کی صفت واقع ہو رہا ہے۔

سوال: ﴿يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ "يتيما" منصوب کیوں ہیں؟ نیز "ذا مقربة" کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: يتيما إطعام مصدر کا مفعول بہ ہے اور "ذا مقربة" "يتيما" کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بتائیں اس سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف انسان کا ذاتی ایمان مطلوب نہیں بلکہ یہ مطلوب ہے کہ وہ ایمان لا کر مؤمنین میں شامل ہو جائے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے جہاں ایمان و عمل کی بہار ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دو ایسی خصوصیات مطلوب ہیں جن کی مدد سے انسان کا ذاتی اور معاشرتی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ وہ دو خصوصیات صبر اور رحم کی باہمی تلقین ہے۔

مومن کی تمام زندگی صبر کی متقاضی ہے کیونکہ روز مرہ معاملات اور عبادات میں صبر کی ہی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح منہیات سے رکنے کے لئے بھی صبر کی شدید ضرورت ہے اگر اکیلے انسان کو یہ سب کام سرانجام دینے ہوں تو یہ بہت مشکل کام ہے لیکن اگر سارا معاشرہ مومنین پر مشتمل ہو اور وہ ایک دوسرے کو صبر و رحم کی تلقین کرتے رہیں تو باہمی تعاون سے مل کر مشکلات کا سامنا کرنا آسان ہوتا ہے۔

دوسری صفت رحم بہت اہم وصف ہے کیونکہ رحم کے جذبے سے معاشرے میں باہمی اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور ایک

دوسرے کی غلطیاں برداشت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ رحم کی اہمیت احادیث میں بھی بکثرت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً:
''الراحمون یرحمهم الرحمٰن ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السمآء''۔ (ابوداؤد: ۴۹۴۱، ترمذی: ۱۹۲۴، صحیح)
''لا یرحم الله من لا یرحم الناس''۔ (بخاری: ۷۳۷۶، مسلم: ۲۳۱۹)''لا تنزع الرحمة إلا من شقی''۔ (ابوداؤد: ۴۹۴۲، ترمذی: ۱۹۲۳، اسنادہ حسن)''لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا''۔ (ترمذی) (تفہیم)

سوال: ﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ﴾ ''مُؤْصَدَةٌ'' کیا صیغہ ہے؟ نیز اس کا لغوی معنی ذکر کرتے ہوئے بتلائیں کہ آگ لوگوں پر کیسے بند کی جائے گی؟

جواب: مُؤْصَدَةٌ: باب افعال ''اٰصَدَ یُؤْصِدُ إِیْصَاد'' سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے (اعراب) مادہ: أ، ص، د۔
''آصد علیه'' کا معنی ہے اس پر بند کیا۔ ''نار مؤصدۃ'' سے مراد بند کی گئی آگ۔ بندے کو آگ میں داخل کر کے آگ کو ہر طرف سے بند کر دیا جائے گا تاکہ آگ کی حدت زیادہ سے زیادہ ہو، جیسا کہ اینٹوں والے بھٹے میں کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کو آگ کا سخت ترین عذاب ہوگا۔

سوال: مقربة، متربة، مرحمة، مشئمة اور میمنة کیا صیغے ہیں اور ان کے معانی کیا ہیں؟

جواب: مقربة: ''قَرُبَ یَقْرُبُ قَرَابَةً وَ قُرْبًا'' (ش) سے مصدر میمی ہے اسکا لغوی معنی قریبی ہونا ہے۔ ''مَقْرَبَةٌ'' بمعنی قرابت ہے۔ مادہ: ق، ر، ب۔

مَتْرَبَةٌ: باب ''تَرِبَ یَتْرَبُ تَرَبًا'' (ع) سے مصدر میمی ہے۔ ''تَرِبَ'' سے مراد محتاج ہونا، غبار آلود ہونا اور ''مَتْرَبَةٌ'' سے مراد غربت وافلاس ہے۔ مادہ: ت، ر، ب۔

مَرْحَمَةٌ: ''رَحِمَ یَرْحَمُ رَحْمَةً وَ رُحْمًا'' (ع) سے مصدر میمی ہے۔ ''رَحِمَ'' سے مراد کسی پر شفقت اور مہربانی کرنا اور ''مَرْحَمَةٌ'' بمعنی رحمت وشفقت ہے۔ مادہ: ر، ح، م۔

مشئمة: ''شَئُمَ یَشْئُمُ شَآمَةً'' (ش) سے مصدر میمی ہے۔ ''شَئُمَ'' کا معنی منحوس ونامبارک ہونا جبکہ ''مشئمة'' کا معنی بدبختی، بائیں جانب اور بدشگونی ہے۔ دراصل بائیں جانب بے برکتی اور بدبختی کی علامت ہے اسلئے بائیں جہت کو ''مشئمة'' کہا جاتا ہے۔ مادہ: ش، ء، م۔

مَیْمَنَةٌ: باب ''یَمَنَ یَیْمِنُ یَمْنًا'' (ض) اور ''یَمُنَ یَیْمُنُ یُمْنًا'' (ش) سے مصدر میمی ہے اسکا معنی دائیں جانب ہونا اور مبارک ہونا ہے۔ ''میمنة'' سے مراد دائیں جانب، برکت اور خوش بختی ہے۔ مادہ: ی، م، ن۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۞١ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۞٢ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۞٣ وَالَّيْلِ اِذَا
يَغْشٰهَا ۞٤ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۞٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۞٦ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۞٧
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۞٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۞٩ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۞١٠
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ۞١١ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۞١٢ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ
وَسُقْيٰهَا ۞١٣ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۞١٤ وَلَا
يَخَافُ عُقْبٰهَا ۞١٥

سوال: اس سورت کا ماقبل سورت سے کیا تعلق ہے؟

جواب: سابقہ سورت کے اختتام میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب المیمنۃ اور اصحاب المشئمۃ کا تذکرہ فرمایا ہے جب کہ اس سورت میں بھی ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ فرما کر ان کی مکمل وضاحت فرمائی ہے۔

اسی طرح سابقہ سورت کے آخر میں اصحاب المشئمۃ کی جزا ''جہنم'' کا تذکرہ کیا تو اس سورت میں بطور مثال قوم ثمود کو دنیا میں ملنے والے عذاب کا تذکرہ کیا۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں قریش مکہ کو طغیان وسرکشی کے برے انجام سے ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے۔ دیکھو یہ کائنات اضداد کی رزم گاہ ہے۔ لیکن اللہ قادر وقیوم کسی کو حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتا، ہر کوئی اپنے مدار میں گھوم رہا ہے اور کائنات کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد نفس انسانی کی تشکیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی جو حال عالم اکبر کا ہے وہی حال عالم اصغر کا ہے۔ یہ بھی اضداد کا مرکب ہے۔ اس کی فطرت میں بھی خیر وشر، نیکی اور بدی ودیعت ہیں۔ اور اس کا امتیاز بھی اسکی فطرت میں رکھا ہے۔ خیر سے محبت، شر سے نفرت کا ذوق بھی بخشا ہے۔

اس کا تقاضا یہ ہے طبیعت میں اس توازن کو برقرار رکھا جائے۔ بدی کے محرکات کو اچھائی کے محرکات پر غلبہ نہ

پانے دیا جائے۔ ورنہ طغیان وفساد پیدا ہوگا اور خالق کائنات کی سنت یہ ہے کہ وہ طغیان وفساد کو پسند نہیں کرتا۔
آخر میں عرب کی ایک فسادی قوم کو بطور عبرت پیش کیا جس سے قریش آشنا تھے۔

سوال: ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ ''ضحی'' صیغہ اور معنی بتلائیں نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: ضحی: باب ''ضَحَا یَضْحُو ضَحْوًا'' (ن) سے اسم مشتق ہے۔ ''ضحی'' کا معنی ''سورج کی روشنی، چاشت کا وقت، دن کا چڑھاؤ اور ظہور ووضاحت'' ہے۔ مادہ: ض، ح، و۔ ترجمہ: سورج اور اس کی دھوپ کی قسم۔

سوال: اس سورت کی ابتدائی آیات میں واؤ کون سی ہے؟

جواب: پہلی آیت ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ کی واؤ قسمیہ ہے جبکہ آگے والی آیات کی واؤ عاطفہ ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا﴾ ''تلٰها'' کا معنی اور صیغہ ذکر کریں۔

جواب: تَلاَ: ''تَلاَ یَتْلُوْ تُلُوًّا'' (ن) سے واحد مذکر غائب فعل ماضی معروف ہے۔ اس کا معنی ''پیچھے آنا، پیروی کرنا، نقش قدم پر چلنا اور تابع ہونا'' ہے۔ مادہ: ت، ل، و۔ (قاموس)

سوال: ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا﴾ ''جَلّٰی'' صیغہ اور معنی ذکر کریں۔

جواب: ''جَلّٰی'' باب تفعیل ''جَلّٰی یُجَلِّیْ تَجْلِیَةً'' سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: ج، ل، و۔ ''جَلاَ الأمر'' کا معنی ہے واضح ہونا اور ''جَلّٰی النهار الظلمة'' سے مراد ''دن کا تاریکی کو دور کرنا'' ہے۔

سوال: ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا﴾ کا درست ترجمہ کرتے ہوئے بتائیں کیا دن سورج کو روشن کرتا ہے یا سورج دن کو؟

جواب: ''اور قسم ہے دن کی جب وہ اس سورج کو روشن (ظاہر) کر دے''۔
حقیقت میں دن کو سورج روشن کرتا ہے۔ نہ کہ دن سورج کو۔ لیکن جیسا کہ اگلی آیت میں ہے ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ سورج کو ڈھانپ لے''۔ گویا کہ رات سورج کی روشن کرنوں کو ختم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اسی مناسبت سے کہا دن سورج کو روشن کرتا ہے۔ کیونکہ رات کی طرح دن بھی ایک سبب ہے اور اس دن میں سورج طلوع ہوتا ہے گویا کہ وہ اسے روشن کرتا ہے۔

سوال: ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا﴾ ''جَلّٰها'' میں ''ھو'' اور ''ھا'' ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: ''جَلّٰی'' کی ''ھو'' ضمیر کا مرجع اکثر مفسرین کے ہاں ''النّھار'' ہے اور ''ھا'' ضمیر کا مرجع جمہور کے ہاں ''الشمس'' ہے اگرچہ بعض کے ہاں ''الظلمة'' اور ''الأرض'' بھی ہے۔

سوال: پہلی چھ قسموں میں اسم معرف باللام ہے اور ﴿نفس وما سوّٰها﴾ میں "نفس" نکرہ ہے اسکی توجیہ کریں۔

جواب: چونکہ یہاں کسی خاص نفس کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ انسان کے عمومی نفس کی شہادت مقصود ہے اس لئے یہاں نفس کو نکرہ لایا گیا ہے اور یہ نکرہ عام مفہوم میں ہے۔اس سے ہر نفس مراد ہے۔ جیسے ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾ (الانفطار:۵)(کشاف، التحریر)

سوال: ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ○ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ○ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا﴾ ان آیات میں "مَا" مصدریہ ہے یا "مَنْ" کے معنی میں؟

جواب: بعض علماء کے ہاں "مَا" یہاں "مَنْ" کے معنی میں ہے۔(ترجمہ: اور (قسم ہے) آسمان کی اور جس نے اسے بنایا۔۔۔۔) کیوں کہ آگے والی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ میں صریحًا اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہے۔

جبکہ بعض دوسرے علماء کے ہاں چونکہ پہلی آیات میں بھی سورج، چاند، دن اور رات کی قسموں کے ساتھ "وَضُحٰىهَا، اِذَا تَلٰىهَا، اِذَا جَلّٰىهَا، اِذَا يَغْشٰىهَا" کو ذکر کیا، لہذا یہاں بھی "مَا" کو مصدریہ ماننا زیادہ بہتر ہے تاکہ تمام قسموں میں یکسانیت رہے۔(ترجمہ: اور آسمان اور اس کی بناوٹ (کی قسم)۔۔۔۔)۔یہ نہ ہو کہ ایک ٹکڑا تو شہادت کے مفہوم میں ہو اور دوسرا تعظیم وتقدیس کے مفہوم میں۔(تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا﴾ "طَحٰىهَا" کا معنی ذکر کریں۔

جواب: "طَحَا يَطْحُوْ طَحْوًا" (ن) کا معنی ہوتا ہے: پھیلانا، بچھانا۔

سوال: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ الهام، فجور اور تقوی کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: الهام: باب افعال اَلْهَمَ يُلْهِمُ سے مصدر ہے۔اسکا لغوی معنی ہے: اللہ کا کسی کے دل میں نیک بات ڈالنا، اللہ کی جانب سے ایسی بات کا دل میں القاء جو اطمینان قلب کا باعث ہو۔یہ اللہ کے نیک بندوں کو ہوتا۔دل میں آنے والے خیال، فکر اور مفہوم ومطلب کو بھی کہتے ہیں۔

فجور: فَجَرَ يَفْجُرُ فَجْرًا (ن) سے مصدر ہے۔معنی: بے پرواہی کے ساتھ گناہوں میں مبتلا ہونا، بدکار رہنا، گناہ کرنا۔

تقوی: وَقٰى يَقِيْ وِقَايَةً (ض) سے اسم ہے۔معنی: پرہیزگاری، ڈر، عظمت وہیبت کا خوف، اللہ کے خوف سے اس کے احکام کی بجا آوری اور ممنوعات سے اجتناب کرنا۔(قاموس)

سوال: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ میں "دَسّٰى" فعل کی لغوی وضاحت، خلاف قاعدہ تعلیل اور مادہ ذکر کریں۔ نیز

بتائیں کہ ''ھَا'' ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

جواب: ''إذا أدخل شیئا تحت شیء فأخفاہ'' جب کوئی شخص کسی چیز کو کسی چیز کے نیچے چھپاتا ہے اس کو تدسیس کہتے ہیں۔صاحب کشاف نے اس کا معنیٰ ''النقص والإخفاء بالفجور'' کیا ہے۔

''دسَّ'' اصل میں ''دسَّسَ'' تھا آخری سین کو غیر قیاسی طور پر ''ی'' سے تبدیل کیا ''دَسَّیَ'' ہوا۔یاء متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا ''دَسَّا'' ہوگیا۔

''ھَا'' ضمیر ''نَفس'' کی طرف راجع ہے۔

سوال: ﴿كَذَّبَتۡ ثَمُودُ بِطَغۡوٰىهَآ﴾ ''كَذَّبَتۡ'' کا مفعول ذکر کریں نیز ''طغوٰھا'' کی لغوی اور صرفی وضاحت کریں۔

جواب: ''كَذَّبَتۡ'' کا مفعول لفظ رَسُوۡل محذوف ہے۔اصل عبارت یوں ہوگی: ''كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ رَسُوۡلَهَا بِطَغۡوٰىهَآ''۔

طغوا: ''طغیٰ یطغی'' بروزن ''فتح یفتح'' سے ''فَعلی'' کے وزن پر مصدر سماعی ہے۔جس کے معنیٰ ''مناسب حد سے بڑھ جانا'' کے ہیں۔طغی الماء: پانی کا جوش مارنا، پانی میں طغیانی آنا۔جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِی الۡجَارِیَةِ﴾ (الحاقۃ: ۱۱)۔

سوال: ﴿كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰىهَآ﴾ ''بِطَغۡوٰىهَآ'' کی باء کس معنیٰ میں ہے؟ اور ''ھا'' ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: یہاں باء سببیہ ہے، یعنی قوم ثمود نے اپنے رسول کو اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا۔

''ھا'' ضمیر کا مرجع ''قوم ثمود'' کی طرف راجع ہے۔

سوال: ﴿اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا﴾ میں ''إذ انبعث'' کا محل اعراب بیان کریں اور ''أشقٰھا'' کی ''ھا'' ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: ''إذانبعث'' ''کذبت'' یا ''طغوا'' کا مفعول فیہ ہے۔اور ''أشقاھا'' کی ''ھا'' ضمیر ''قوم ثمود'' کی طرف راجع ہے۔

سوال: ﴿اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا﴾ کا ترجمہ کریں نیز ''اَشۡقٰی'' صیغہ حل کرتے ہوئے بتائیں کہ اس سے کون مراد ہے؟

جواب: ترجمہ: جب اس قوم کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا۔

اَشۡقٰی: شَقِیَ یَشۡقٰی شَقًا (س) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔اصل میں اَشۡقَیُ تھا، یاء متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا، ''اَشۡقٰی'' ہوگیا۔مادہ: ش، ق، ی۔اس سے مراد قوم ثمود کا لیڈر قدار بن سالف ہے۔

سوال: ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللهِ﴾ کا مناسب ترجمہ کریں نیز بتائیں کہ "رَسُوْلُ اللهِ" سے کون مراد ہے؟

جواب: ترجمہ: اللہ کے رسول نے انہیں متنبہ کیا۔

"رَسُوْلُ اللهِ" سے حضرت صالح علیہ السلام مراد ہیں۔﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا﴾ (ترجمہ: اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا) (الاعراف: ۷۳)۔

سوال: ﴿نَاقَةَ اللهِ وَسُقْيٰهَا﴾ منصوب کیوں ہیں؟

جواب: یہ "ذَرُوْا" فعل محذوف کا مفعول بہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللهِ﴾ (الاعراف: ۷۳)

سوال: ﴿نَاقَةَ اللهِ وَسُقْيٰهَا﴾ "سُقْيٰهَا" صیغہ، اعراب اور اسکا مفہوم واضح کریں۔

جواب: "سقیا" باب "سَقٰى يَسْقِيْ سَقْيًا" (ض) سے اسم مصدر ہے یا پھر اسم بمعنی مفعول ہے یعنی "الماء الذی تسقٰى منه" (التحریر) صاحب تاج العروس نے یہ بات واضح کی ہے کہ: "والإسم من سقاه الله وأسقاه السقيا بالضم كما فى الصحاح"۔ یہ "سقاه الله وأسقاه" سے اسم ہے۔ (صحاح کا جو نسخہ ہماری لائبریری میں ہے اس میں یہ عبارت نہیں ملی) بہت سے مؤلفین نے اس کو مصدر قرار دیا ہے۔ جو کہ غیر درست معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

"سقیا" کا معنی سیرابی، آبپاشی، پانی پینے کی باری وغیرہ ہے۔ (قاموس، روح)

سوال: ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾ "فَعَقَرُوْهَا" کا لغوی معنی واضح کریں اور بتلائیں کہ کیا اس کا معنی "کونچیں کاٹ ڈالیں" درست ہے؟

جواب: "عقر يَعْقِرُ البعير" کا معنی اونٹ کو بوقت ذبح قابو کرنے کے لئے اسکے پاؤں پر ضرب لگانا اور کاٹ ڈالنا جب اسکو تکلیف ہوتی ہے تو اسے نحر کر کے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ اس آیت میں "فعقروها" اونٹنی کے قتل سے کنایہ ہے۔ کیونکہ "عقر" اسکے قتل کو لازم ہے۔ ہمارے اکثر مترجمین نے اس کا معنی کونچیں کاٹنا کیا ہے۔ جو کہ عام لوگوں پر شاق ہے۔ صاحب لسان نے اس کا معنی "قطع إحدى قوائمه" کیا ہے۔ اس کی کوئی ایک ٹانگ کاٹ دی۔ "عقر" کے کثرت استعمال کی وجہ سے عرب نے اس سے قتل کے معنی بھی لیے ہیں۔ (لسان)

سوال: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا﴾ "دمدم" اور "سوّٰها" کا ترجمہ کریں۔

جواب: دمدم: آفت توڑنا، عذاب برسانا۔ سوّٰها: برابر کرنا، بل نکالنا، پیوند خاک کرنا۔

سوال: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا﴾ "فسوّاھا" میں "ھا" ضمیر کا مرجع اور ترجمہ کریں۔

جواب: "ھا" ضمیر کا مرجع "دمدم" سے ماخوذ مصدر "دمدمة" ہے۔ یعنی "فسوّی الدمدمة علیھم" اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی برابر کر دی اور اس تباہی سے کوئی بھی نہ بچ سکا کیونکہ سب شریکِ جرم تھے۔ ایک دوسرا قول ہے کہ "ھا" ضمیر سے مراد بستی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تباہی کے بعد اس بستی کو برابر کر کے زمین کیساتھ ملا دیا۔ ترجمہ: پس اس عذاب کو سب پر برابر کر دیا کہ اس عذاب سے کوئی بھی نہیں بچ سکا۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو برابر کر دیا یعنی ملیامیٹ کر دیا۔

سوال: ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا﴾ میں "عُقْبٰهَا" کی صرفی تحلیل کریں اور "ھا" ضمیر کا مرجع ذکر کریں نیز آیت کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: عُقْبٰی: فُعْلٰی کے وزن پر اسم ہے۔ جس کے معنی: آخرت، انجام، بدلہ، جزا وغیرہ کے آتے ہیں۔ (القاموس)

"ھا" ضمیر "دمدمة" اور "تسویة" کی طرف راجع ہے۔

ترجمہ: "اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا۔"

سُوْرَةُ اللَّيْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝١ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝٢ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝٣ اِنَّ سَعْيَكُمْ
لَشَتّٰى ۝٤ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝٥ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝٧ وَاَمَّا
مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝٨ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝٩ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝١٠ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ
مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝١١ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝١٢ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝١٣ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا
تَلَظّٰى ۝١٤ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝١٥ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝١٦ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝١٧
الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝١٨ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝١٩ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ
الْاَعْلٰى ۝٢٠ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝٢١

سوال: اس سورت کا ماقبل سورت سے کیا تعلق ہے؟

جواب: دونوں سورتوں کے مضمون میں خاصی مماثلت موجود ہے۔ سورۃ الشّمس میں ہے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ یعنی نفس کا تزکیہ کرنے والے فلاح یافتہ ہیں اور نفس کو آلودہ کرنے والے ذلیل ورسوا ہونے والے ہیں جبکہ سورۃ اللیل میں تزکیہ نفس کے حصول کا طریقہ مذکور ہے اسی طرح ان اعمال کا تذکرہ ہے جو انسانی نفس کو آلودہ کر کے ہمیشہ کی ذلت اس کا مقدر کردیتے ہیں۔ (تدبر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع خوش بختی اور بدبختی کے راستوں کا بیان اور ان راستوں کو اختیار کرنے والوں کے نتائج کے اختلاف کو واضح کرنا ہے۔ ایک چیز اس سورت کا خاص موضوع ہے یعنی مال۔

جو لوگ مال کی محبت میں مبتلا ہیں ان کا مال بوقت ہلاکت انکے کسی کام نہ آئے گا اور جو لوگ اللہ کی رضا کے لئے مال کو خرچ کرتے ہیں ان کا یہ عمل انہیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ سورت کی ابتدا اس مضمون سے ہو رہی ہے کہ کائنات کے تمام انسانوں کی سعی اور عمل میں ایسا ہی تفاوت ہے جیسے دن رات اور مذکر مؤنث میں ہے۔ ایک گروہ کی سعی خیر و برکت پر مبنی

اور دوسرے کی ذلت وخسران پر مشتمل ہے۔

پہلا گروہ اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اچھی بات کو اچھی تسلیم کر کے اسے ترجیح دیتا ہے نتیجۃً اس کا انجام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھلائی کے راستے اس کیلئے آسان کر دیتے ہیں۔ دوسرا گروہ بخل سے کام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے خوف و تقویٰ سے بے پرواہ ہے اور اچھی بات کا انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے اعمال کے موافق برائی اور نقصان کا رستہ اس کیلئے سہل کر دیتے ہیں اس کے بعد ایک دلنشین جملے سے مضمون کا اختتام ہو رہا ہے کہ جس مال پر فخر وغرور کرتے ہوئے انسان ابدی حقیقتوں کا منکر ہوتا ہے اس مال کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ وہ انسان کو موت جیسی حقیقت سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔

اس کے بعد ایک بنیادی حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امتحان گاہ میں انسان کو بغیر رہنمائی کے نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کے لئے سامان ہدایت بھی پیدا فرمایا ہے نیز اس کیساتھ ایک تنبیہ بھی فرما دی کہ میں ہی دنیا وآخرت کا مختار کل ہوں، تاکہ انسان بے پرواہ نہ ہو جائے، اگر وہ اس سامان ہدایت کو بروئے کار لا کر اپنی اصلاح نہ کرے گا تو بھڑکتے شعلوں والی آگ اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ دوسری طرف اگر انسان نے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ سامان ہدایت کو بروئے کار لا کر درس عبرت حاصل کیا، مال کی محبت میں مبتلا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ بھی اسے ایسا نوازیں گے کہ وہ مالک حقیقی کی عطا سے راضی ہو جائے گا۔ (تفہیم، تدبر، المنیر)

سوال: ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ○ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ○ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى﴾ اضداد کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ وضاحت کریں۔

جواب: اللہ رب العزت نے دن اور رات، مذکر ومؤنث کو بطور شہادت پیش کیا کہ جس طرح دن اپنے مقاصد ونتائج میں رات سے یکسر مختلف ہے۔ اور جس طرح مذکر ومؤنث کی تخلیق یکساں نہیں۔ اسی طرح تمہارے اچھے اور برے اعمال میں ہرگز یکسانیت نہیں ہو سکتی۔

سوال: ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى﴾ کا معنی اور صیغہ کی وضاحت کریں۔

جواب: ''دن کی قسم جب وہ خوب روشن ہو''

تجلّی: باب تفعل ''تَجَلّٰی یَتَجَلّٰی تَجَلِّیًا'' سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ اس کا ثلاثی مجرد ''جلا یجلو جلوا'' ہے۔ یہ ناقص واوی ہے۔ مادہ: ج، ل، و۔

سوال: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى﴾ میں ''ما'' کون سا ہے؟ ہر صورت میں معنی کی وضاحت کریں۔

جواب: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى﴾ کی ترکیب میں ''ما'' کو موصولہ اور مصدریہ بنا کر دونوں طرح تراکیب کی گئی

ہیں۔اگر ''ما'' کوموصولہ مانیں تب یہ ''مَنْ'' کے معنی میں ہوگا۔اور ''مَنْ'' سے مراد حق تعالیٰ جل شانہ ہیں۔وَمَنْ خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ''اس عظیم و برتر ذات کی گواہی جس نے مذکر ومؤنث کو پیدا فرمایا''۔بعض اہل علم کا رجحان اس بات کی طرف ہی کہ ''ما'' اللہ رب العزت کے لیے نہیں آتا حالانکہ قرآن مجید میں صریح طور پر اللہ رب العزت کی ذات عالیہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ سورہ کافرون میں ہے ﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ﴾ (الکافرون: ۳) اصل عبارت ہوگی ''ولاأنتم عابدون من أعبد''۔یہاں ''ما'' سے مراد اللہ رب العزت ہی ہیں کوئی اور ذات نہیں۔

اس کی دوسری توجیہ اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ مَا موصولہ مَا کے معنی میں ہی ہو تب عبارت یوں ہوگی ''وَمَا خَلَقَهُ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى'' (ترجمہ: اور اس کی قسم جو اس نے پیدا کیا نر اور مادہ۔) اس جملے میں ایسی ضمیر کا ہونا ضروری ہے جو مَا موصولہ کی طرف راجع ہو وہ ''ہ'' ضمیر ہے ترکیب میں ''الذكر والأنثى'' ''ہ'' ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ''الذكر والأنثى'' کو ''خلقه'' کی ''ہ'' ضمیر سے بدل بنایا گیا ہے۔''ہ'' ضمیر مبدل منہ محذوف ہے۔اعتراض یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے مبدل منہ محذوف ہو اور بدل مذکور ہو۔جی کلامِ عرب میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔صاحب ذوق مغنی اللبیب کی طرف مراجعت فرمائیں۔

تیسری توجیہ: اگر ''مَا'' کو ''مَا'' مصدریہ بنائیں تو معنی ہوگا ''وَخَلْقِهِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى''۔''اور اس کے نر اور مادہ کو پیدا کرنے کی قسم''۔اس صورت میں ''الذكر والأنثى'' ''خَلْق'' مصدر کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

سوال: ﴿اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰى﴾ ''لَشَتّٰى'' کا معنی اور صیغہ بتائیں۔

جواب: اس کے معنی الگ الگ ہونا، منتشر ہونا اور مختلف ہونے کے ہیں۔یہ ''شتیت'' کی جمع ہے۔جس طرح ''قَتِیْلٌ'' کی جمع ''قتلى'' آتی ہے۔مادہ: ش، ت، ت۔

سوال: ﴿اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰى﴾ میں لام کیا ہے؟ اور اس کا اصطلاحی نام ذکر کریں۔

جواب: ''لَشَتّٰى'' میں لام تاکید کیلئے ہے۔جس کو اصطلاح میں ''لام المزحلقة'' کہتے ہیں۔مُزَحْلَقَة کا معنی ہوتا ہے جس کو پھسلا دیا گیا ہو، چونکہ اصلاً لام تاکید اسم پر داخل ہوتی ہے۔لیکن یہاں اسم پر پہلے ہی ''إِنَّ'' تاکید کے لیے موجود ہے اس لئے لام تاکید کو اسم سے پھسلا کر خبر پر لایا گیا۔اسی وجہ سے اسے لام المزحلقة کہتے ہیں۔

سوال: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى﴾ عَطَا يَعْطُو عطاء اور أعطى إعطاء میں فرق واضح کریں۔

جواب: ''عطا الشيء'' کا معنی کوئی چیز لینا، ''عَطَا فلانًا'' کا معنی کسی شے کے حصول میں دوسرے پر غالب آنا جبکہ

"أعطیٰ فلاناً الشيءَ" کا معنی کسی کو کوئی چیز عطا کرنا ہے۔ (قاموس)

سوال: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی﴾ "أما" کن کن معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں کس مقصد کے لیے ہے؟

جواب: "أما" تین معانی کیلئے مستعمل ہوتا ہے: (۱) شرط (۲) تاکید (۳) تفصیل۔

"أما" کے بعد فاء کا آنا ضروری ہے۔

(۱) شرط کے لیے۔ ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى﴾ (عبس:۸، ۹، ۱۰)

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾

(۲) تاکید کے لیے۔ "أمّا زيد فذاهب أي لا محالة ذاهب"۔ اگر ایسے ہوتا "زيد ذاهب" تو اس میں تاکید نہیں تھی۔

(۳) تفصیل کے لیے۔ جب "أمّا" تفصیل کے لیے ہو تو "أمّا" کا لفظاً یا معنیً تکرار ضروری ہے۔ مثلاً:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ (البقرة:۲۶)

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (الضحیٰ:۹)

"فأما من اعطیٰ" اور "وأما من بخل" میں "أما" شرط اور تفصیل کے لیے ہے۔ (معجم النحو، التحریر)

سوال: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی﴾ کے مفعولوں کی وضاحت کریں۔

جواب: جب "إعطاء" سے مراد "إعطاء المال بدون عوض" ہو تو "إعطاء" کو فعل لازم کے قائم مقام کر کے اس کے مفعول (المال) کو مشہور ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے مالِ موہوب کو "عطاء" کہا جاتا ہے اور مقصود "إعطاء الزكوة" ہے۔ اس آیت میں بھی اصل "فأما من أعطى المال فلانا لله" تھا۔ جبکہ "اتّقیٰ" کا مفعول لفظ "الله" ہے اور واضح ہونے کی وجہ سے محذوف ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾ کا سلیس ترجمہ کریں اور "حسنی" کی صرفی تحلیل کریں۔

جواب: اور اس نے سب سے اچھی بات کو سچ مانا۔

یہ "حَسُنَ يَحْسُنُ" سے "فُعلی" کے وزن پر واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ جیسی عسری، یسری ہے۔

سوال: ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے کو اور اس کی نازل کی ہوئی ہر بات کو سچ مان کر اس کا تابع

ہو جاتا ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

صاحب کشاف نے اس کے تین مفہوم بیان کیے ہیں:

"بالخصلة الحسنى وهى الإيمان أو بالملة الحسنى وهى ملة الإسلام أو بالمثوبة الحسنى وهى الجنة "۔یعنی اچھی خصلت، ایمان کی تصدیق کرتا ہے یا سب سے اچھے دین، دین اسلام کی یا بہترین جزا جنت کی تصدیق کرتا ہے۔

سوال: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ قرآن کے مطلوبہ کام کرنے پر اللہ آسانی کی راہ فراہم کرتے ہیں جبکہ سورۃ البلد میں ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (البلد:۱۱) سے دشوار گھاٹی قرار دیا ہے۔ان کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے انسان کو یہ راہ بڑی مشکل گھاٹی معلوم ہوتی ہے، جس پر چڑھنے کے لیے اسے اپنی نفس کی خواہشوں، مال وزر کی ہوس سے، اہل وعیال، اپنے عزیز واقارب سے اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر ایک اس راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر پیش کرتا ہے۔لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کرتا ہوا اس پر چلنے کا عزم مصمم کر لیتا ہے اور اپنے مال کو راہ حق میں صرف کرنے اور اللہ رب العزت کا تقوی اختیار کرکے اس عزم پر عملی مہر بھی ثبت کر دیتا ہے تو اس پر گھاٹی کو سر کرنا اور اخلاقی پستیوں کی کھڈ میں لڑھکنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ (تفہیم)

دوسرا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہ اپنے انجام کار کے اعتبار سے ہے کہ اس کا انجام آسانی والا ہوگا اور اس کا نتیجہ بہت خوش کن اور اس کا ثمرہ بہت لذیذ اور شیریں ہوگا۔﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ (الانشقاق:۷،۸) اور ﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ (الفجر:۲۹،۳۰) کی آخری منزل آجاتی ہے۔

سوال: ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى﴾ "بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى" کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: بَخِلَ کا صرف یہی مفہوم نہیں کہ آدمی اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ نہ کرے بلکہ بخل کا مفہوم اس سے بہت وسیع تر ہے۔اس میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان اپنی ذات پر تو خوب خرچ کرے لیکن جب اللہ کی راہ میں اور مظلوم انسانیت پر خرچ کرنے کا موقع ہو تو ہاتھ کھینچ لے۔

اسْتَغْنٰى کا مفہوم ہے: بے نیاز ہونا، کسی کی ضرورت محسوس نہ کرنا۔اسی لحاظ سے وہ اللہ، رسول اور آخرت سے بے نیاز ہو گیا۔نیز استغناء سے مراد یہ ہے کہ انسان مادہ پرستی کا اسیر ہو جائے اور فقط دنیا پرستی کی طرف مائل ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جائے۔نیز اسے اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کا کوئی خیال نہ رہے۔ (تفہیم، روح، تدبر)

سوال: ﴿وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾ کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: ''بھلائی کی تکذیب'' دراصل نیکی کی تصدیق کے مخالف ہے۔ جو آدمی نیکی کے افعال، اخلاقیات اور عقائد کے باب میں برائی کو ترجیح دے گا وہ دراصل ''تکذیب حسنیٰ'' کا مرتکب ہوگا۔ (تفہیم) نیز ﴿وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾ میں ''حسنیٰ'' کے وہ تینوں مفہوم داخل ہیں جو ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾ میں بیان ہوئے ہیں کہ وہ ان تینوں کو نہیں مانتا۔

سوال: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ اعمال سیئہ کے راستے کو سخت کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: اعمال سیئہ کو اس لئے مشکل کہا کہ یہ انسان کی فطرت اور مقصد تخلیق کے منافی ہیں۔ انسان کے سب اعضاء اللہ رب العزت کی تابع داری کرتے ہیں کہ جوان کو حکم ہوا ہے وہ اس پر کارفرما ہیں۔ زبان نے کبھی بولنے سے انکار نہیں کیا، ہاتھ نے پکڑنے سے کبھی نافرمانی نہیں کی، کیوں کہ ان کو اللہ کی طرف سے یہی حکم ملا ہے۔ لیکن انسان ان کو اللہ کی نافرمانیوں میں استعمال کرتا ہے تو یہ دو الگ راستے ہیں۔ انسان ان کو زبردستی نافرمانی کے راستے پر چلاتا ہے۔ دل اسکو ملامت کرتا ہے۔ جب کوئی برا فعل انجام دیتا ہے وہ اپنی فطرت کے، اپنے ضمیر کے، خالق کائنات کے وضع کردہ قوانین سے اور اپنے گردوپیش کے معاشرے سے ہمیشہ جنگ کرتا رہتا ہے اس لئے اس کو مشکل راہ قرار دیا ہے۔ یا یہ اپنے انجام کے اعتبار سے مشکل ہوگا۔ یعنی یہ چیزیں انسان کو قیامت کے دن تنگیاں مہیا کریں گی۔

سوال: ﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى﴾ ''تَرَدّٰى'' کا معنی ذکر کریں۔

جواب: ''تَرَدّٰى'' کا معنی ہے ''بلندی سے گرنا''۔ (قاموس)

سوال: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ کی ترکیب کریں اور ''ھدیٰ'' پر لام تاکید کس مقصد کے لیے ہے؟

جواب: ''إن'' حرف مشبہ بالفعل، ''عَلَيْنَا'' جار مجرور محذوف خبر (لَازِمٌ) کے متعلق، ''لَلْهُدٰى'' ''إن'' کا اسم مؤخر۔ ''ھدیٰ'' پر لام تاکید مضمون جملہ کو مزید مؤکد بنانے کیلئے آیا ہے۔ (التحریر)

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ اگر سیدھا راستہ دکھانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو پھر غلط راستے پر چلنے کی صورت میں انسان کو ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جائے گا؟

جواب: دراصل ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ حق کے راستے کی نشاندہی کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا اور اس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی ودیعت کی ہے۔ پھر مزید مخفی اور مشتبہ امور کی وضاحت کیلئے انبیاء و رسل کے ذریعہ بھی انسان کی ہدایت کا سامان مہیا کیا۔ (التحریر، تدبر)

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (الانسان: ۳) اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے دونوں راستے (خیر اور شر) کے واضح کر دیئے ہیں۔ اب انسان کی مرضی ہے کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی بھی راستے پر مجبور نہیں کیا۔ انسان خود ہی اپنے راستے کا انتخاب کرتا ہے اسی وجہ سے اس کو شر کے راستے کے اختیار پر سرزنش کی وعید ہے۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: یعنی دنیا اور آخرت پر ہماری ہی ملکیت ہے تم ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سوال: ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾ "تَلَظّٰى" صیغہ، معنی اور اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: تَلَظّٰى: باب تفعل "تَلَظّٰى يَتَلَظّٰى تَلَظِّيًا" سے واحد مؤنث غائب مضارع معلوم ہے۔ اصل میں "تتلظی" تھا ایک تا اختصار کے لیے حذف کر دی گئی۔ "تَلَظّٰى" کا معنی آگ بڑھکنا، شعلے اٹھنا ہے۔ مادہ: ل، ظ، ی۔

"تَلَظّٰى" یہاں "نَارًا" کی صفت واقع ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ (التحریر، قاموس)

سوال: کیا ﴿لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى﴾ سے یہ مراد ہے کہ صرف نہایت شقی ہی دوزخ میں جلے گا؟

جواب: اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے بلکہ قرآن نے انتہائی دو مختلف کرداروں کو باہم مقابلے میں پیش کر کے آپس کا مختلف انجام بیان کیا ہے۔ اگر اس کا یہی معنی مراد لیں کہ نہایت شقی اس میں داخل ہوگا تو بعد والی آیت سے کیا یہ نہیں ثابت ہوگا کہ صرف انتہائی متقی، پارسا انسان ہی اس آگ سے محفوظ و مامون ہوگا؟۔ حالانکہ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے۔

سوال: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ میں يُجَنَّبُ کو مجہول کیوں لایا گیا ہے؟ نیز "ھا" ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: اعمال تو انسان کرتا ہے لیکن یہ اللہ کی رحمت ہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو قبول کر کے اس کو جنت میں داخل کر دے اور اپنی کمال شفقت و عنایت کا معاملہ کرے۔

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ میں "ھا" ضمیر کا مرجع ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾ میں مذکور "نَارًا" ہے۔ چونکہ "نار" مؤنث سماعی ہے۔ اسی لئے اس کے مناسب ضمیر لائے ہیں۔

سوال: ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى﴾ یا تو پچھلی آیت ﴿الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى﴾ میں "يُؤْتِيْ" کی "ھو" ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے اس صورت میں اسکا کوئی محل اعراب نہ ہوگا۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى﴾ کی ترکیب کریں۔

جواب: واؤ حالیہ یا استئنافیہ، "ما" مشبہ بلیس، "لأحد" "ما" کی محذوف خبر (ثابتًا) کے متعلق، "عندہ" یا تو "تجزی" کا ظرف ہوگا (اسکو "کائنًا" محذوف کا ظرف کرکے "نعمة" سے حال بھی بنایا جا سکتا ہے) "مِن" زائدہ، "نعمة تجزی" موصوف صفت "ما" کا اسم۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزَى﴾ میں "نِعْمَةٍ" کا ترجمہ کیا کریں گے کہ بات واضح ہوجائے؟

جواب: اس آیت میں "نِعْمَةٍ" کا معنی احسان کیا جائے تب بات بالکل واضح ہوجائے گی۔

سوال: ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزَى﴾ میں "عِنْدَهُ" کا ایسا معنی کریں کہ کلام میں الجھن ختم ہوجائے۔ نیز آیت کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: ترجمہ: اس پر کسی کا کوئی قابل جزا احسان نہیں ہے۔

مفہوم: جن لوگوں کو وہ شخص مال ومتاع دے رہا ہے ان لوگوں کا اس شخص پر پہلے کوئی احسان نہیں تھا جسکا یہ بدلہ دے رہا ہے بلکہ یہ شخص محض اللہ کی رضا کے لئے ان کو اپنا مال دے رہا ہے۔

سوال: ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزَى ○ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾ اس جملے میں "إِلَّا" کس معنی میں ہے؟ نیز "ابتغاء" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "إِلَّا" یہاں استثناء اور "لکن" کے معانی میں استعمال ہوسکتا ہے۔

اگر "إِلَّا" کو استثناء کیلئے مانا جائے تو پھر "ابتغاء" مستثنیٰ منقطع ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا اور اگر "إِلَّا" کو "لکن" کے معنی میں تسلیم کیا جائے تب "ابتغاء" محذوف فعل کا مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا اور تقدیری عبارت یوں ہوگی "لکن فعل ذلك ابتغاء وجه..." (اعراب)

سوال: ﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾ "وَجْهِ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت میں اس کا دیدار مراد ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں ابن جریر سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ میں مسلمان کمزور غلاموں کو آزاد کراتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد صاحب نے ان سے کہا: بیٹے! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور غلام آزاد کرتے ہو اگر تم مضبوط نوجوانوں کی آزادی پر یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لئے قوت بازو بنتے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ابا جان "إنما أريد ما عند الله" میں وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے پاس ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا وجہ اعراب بتائیں۔

"الذَّكَرَ" "لَلْآخِرَةُ"

جواب: الذَّكَرَ: "خَلَقَ" کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یا "خَلَقَ" میں محذوف ضمیر (مفعول) سے بدل ہے۔

للآخرة: "إن" کا اسم ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

تلظّٰی، لا یصلٰها، الذی کذب وتولّٰی، الأتقٰی، یتزکّٰی۔

جواب: لا یصلاها: "نارًا" کی صفت ثانی یا "نارًا" سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

الذی کذب وتولّٰی: "الأشقٰی" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

الأتقٰی: "یُجَنَّبُ" فعل مجہول کا نائب الفاعل ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔

یتزکی: "یؤتی" کی "ھو" ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے یا یہ "یؤتی" سے بدل ہے اس صورت میں یہ لا محل لھا من الإعراب سے ہے کیونکہ اس کا مبدل منہ موصول کا صلہ ہے جو کہ لا محل لھا من الإعراب سے ہے۔ (اعراب)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں۔

یغشٰی، فسنیسّر، یسرٰی، تردّٰی، ھدٰی، أشقٰی، تولّٰی، سیجنّب، اتقی، تجزی، ابتغاء، یرضٰی۔

جواب: یغشٰی: "غَشِيَ يَغْشَى غَشْيًا" (ض) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: غ، ش، ی۔ معنی: وہ چھائے گی۔

فسنیسر: "نُيَسِّرُ" باب تفعیل "يَسَّرَ يُيَسِّرُ تَيْسِيْرًا" سے جمع متکلم مضارع معلوم ہے۔ مادہ: ی، س، ر۔ معنی: ہم آسانی کریں گے۔

یسرٰی: "يَسَرَ يَيْسِرُ يَسْرًا" (ض) سے واحد مؤنث اسم تفضیل ہے۔ مادہ ی، س، ر۔ معنی: آسان ترین، سب سے آسان۔

تردّٰی: باب تفعّل "تَرَدّٰى يَتَرَدّٰى تَرَدِّيًا" سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں "تَرَدَّيَ" تھا۔ ی متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا ہے۔ مادہ: ر، د، ی۔ معنی: وہ گرے گا۔

ھُدٰی: "هَدٰى يهدِىْ" (ض) سے مصدر ہے۔ مادہ: ہ، د، ی۔ معنی: راہ نمائی کرنا، راستہ بتانا۔

أشقٰی: "شَقِيَ يَشْقٰى شَقًا" (ع) سے واحد مذکر اسم تفضیل ہے۔ مادہ: ش، ق، ی۔ معنی: سب سے بڑا بدبخت۔

تَوَلّٰی: باب تَفَعُّل "تَوَلّٰی یَتَوَلّٰی تَوَلِّیًا" سے واحد مذکر ماضی معلوم ہے۔ مادہ: و، ل، ی۔ لفیف مفروق۔ معنی: منہ موڑا۔

سیجنب: "یُجَنَّبُ" باب تفعیل "جَنَّبَ یُجَنِّبُ تَجْنِیْبًا" سے واحد مذکر مضارع مجہول ہے۔ مادہ: ج، ن، ب۔ معنی: اسے دور رکھا جائے گا۔

اتقی: باب افتعال "اِتَّقٰی یَتَّقِی اِتِّقَاءً" سے واحد مذکر ماضی معلوم ہے۔ اصل میں "اِوْتَقَیَ" تھا۔ واؤ کو تا سے بدل کرتا میں ادغام کیا اور آخر میں ی متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی بناء پری کو الف سے بدل دیا ہے۔ مادہ: و، ق، ی۔ لفیف مفروق ہے۔ معنی: اس نے پرہیز گاری کی۔

تجزی: "جَزٰی یَجْزِیْ جَزَاءً" (ض) سے واحد مؤنث غائب مضارع مجہول ہے۔ مادہ: ج، ز، ی۔ معنی: اسے بدلہ دیا جائے گا۔

ابتغاء: باب افتعال "اِبْتَغٰی یَبْتَغِیْ" سے مصدر ہے۔ مادہ: ب، غ، ی۔ معنی: تلاش کرنا۔

یرضٰی: "رَضِیَ یَرْضٰی رِضًا" (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: ر، ض، و۔ معنی: وہ خوش ہوگا۔

سُوْرَةُ الضُّحٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ۙ﴿١﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿٢﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ﴿٣﴾ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ
الْاُوْلٰى ۭ﴿٤﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۭ﴿٥﴾ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۠﴿٦﴾ وَوَجَدَكَ
ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۠﴿٧﴾ وَوَجَدَكَ عَاۗىِٕلًا فَاَغْنٰى ۭ﴿٨﴾ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۭ﴿٩﴾ وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ
فَلَا تَنْهَرْ ۭ﴿١٠﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿١١﴾

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت میں اللہ تعالیٰ نے "أتقی" کا تذکرہ فرمایا اور اس سورت میں سید الاتقیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی بیش بہا نعمتوں کا تذکرہ فرمایا۔ اسی طرح سابقہ سورت کے اختتام پر ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ فرما کر متقین کو بہترین جزا کا وعدہ دیا اور اس سورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی یہی وعدہ فرمایا ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ (المنیر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہیں۔ نزول وحی کے انقطاع سے جو پریشانی آپکو لاحق ہوئی تھی اس سورت میں اسکو دور کیا گیا ہے۔

ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے روز روشن اور سکون شب کی قسم سے آپ کو تسلی دی ہے کہ آپ کا رب آپ سے ہرگز ناراض نہیں ہوا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کا مستقبل ماضی سے بہتر ہی ہوگا اور آپ کا رب آپ کو اس قدر عطیات سے نوازے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا کہ جب آپ کے رب نے آپ کو یتیمی میں لاوارث نہیں چھوڑا اور تنگدستی کے بعد آپ کو خوشحالی عطاء کردی، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اب تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہے؟

آخر میں ان احسانات کے شکرانے کے طور آپ کو یتیم اور سائل سے حسن سلوک کی تعلیم دی گئی اور پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (المنیر، تفہیم)

سوال: سورۃ الضحیٰ کا شان نزول ذکر کریں۔

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم چند دن بیمار پڑ گئے اور قیام اللیل نہ کر سکے، ایک عورت نے کہا تمہارا شیطان تم سے نالاں ہو گیا ہے تب یہ سورت نازل ہوئی۔ (متفق علیہ)

اقوال صحابہ اور بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی جس سے آپ غمگین ہوئے چنانچہ آپ کی تسلی اور کفار کی جوابدہی کے لئے یہ سورت نازل ہوئی۔

سوال: ﴿وَالضُّحٰی﴾ سے کیا مراد ہے؟ نیز کیا ﴿وَالضُّحٰی﴾ سے آپ کا چہرہ اور ﴿وَالَّیْلِ﴾ سے آپ کی زلفیں مراد لی جاسکتی ہیں؟

جواب: "وَالضُّحٰی" سے مراد چاشت کا وقت، سورج کی گرمی اور روشنی ہے بعض مفسرین اس سے دن کا ابتدائی حصہ مراد لیتے ہیں۔ "وَالضُّحٰی" سے آپ کا چہرہ اور "وَالَّیْلِ" سے آپ کی زلفیں مراد لینا جیسا کہ بعض واعظین کا وطیرہ ہے درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اسلاف سے ایسا معنی مراد لینا منقول نہیں۔ اور اس لئے بھی کہ آپ کا چہرہ اور زلفیں ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں، ضحی اور لیل کی طرح ان کے لئے مخصوص وقت نہیں ہے۔

سوال: ﴿الضُّحٰی﴾ کا صیغہ اور معنی بتلائیں۔

جواب: ضُحٰی: "ضَحَا یَضْحُو ضَحْوًا" (ن) سے اسم ہے۔ "ضُحٰی" کا معنی "سورج کی روشنی، چاشت کا وقت، دن کا چڑھاؤ اور ظاہر وواضح ہونا" ہے۔ مادہ: ض، ح، و۔

سوال: ﴿وَالَّیْلِ إِذَا سَجٰی﴾ "سَجٰی" صیغہ اور مفہوم ذکر کریں۔

جواب: سَجٰی: "سَجَا یَسْجُو سَجْوًا" (ن) سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: س، ج، و۔ ناقص واوی ہے۔ "سَجٰی" بمعنی "سَکَنَ" ہے یعنی جب رات پرسکون ہو جائے۔

سوال: "الضحٰی" اور "سَجٰی" ناقص واوی ہیں اسلئے انکو "دَعَا" کی طرح "ضُحَا" اور "سَجَا" لکھنا چاہئے تھا لیکن انکو ناقص یائی رَمٰی کی طرح "سَجٰی" اور "ضُحٰی" لکھا گیا اسکی وجہ ذکر کریں۔

جواب: اصل میں قرآن کریم کی کتابت (رسم خط) بھی توقیفی ہے۔ جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن کریم کا رسم الخط رائج ہوا آج تک اسی طرح جاری ہے۔

سوال: ﴿وَالضُّحٰی﴾ اور ﴿وَالَّیْلِ إِذَا سَجٰی﴾ کا جواب قسم ذکر کریں۔

جواب: ان قسموں کا جواب قسم ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ ہے۔

سوال: ﴿وَالضُّحٰى ○ وَالَّيْلِ إِذَا سَجٰى﴾ دونوں قسموں کو کس بات پر بطور استشہاد لایا گیا ہے؟

جواب: اصل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! جس طرح دن اور رات دائمی نہیں رہتے، بلکہ اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے یا جب رات ہوتی ہے تو یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اب دن نہیں آئیگا بلکہ رات تو اگلے دن کیلئے نئی تازگی اور فرحت بخش ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کبھی آپ پر وحی کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے تو یہ ہرگز مطلب نہیں ہوتا کہ اب کبھی وحی نہیں آئیگی یا اب وحی کا سلسلہ منقطع ہی رہے گا۔ بلکہ مقصد آپ کو آرام دینا ہے تاکہ آئندہ کے کام کیلئے تیار ہو جائیں نیز ہر اگلا دن آپکی خوش بختی میں اضافے کا سبب ہوگا۔

سوال: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ اور ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾ دونوں جواب قسم ہیں لیکن ﴿مَا وَدَّعَكَ﴾ پر لام کیوں داخل نہیں ہوا؟

جواب: جواب قسم پر لام اس وقت داخل ہوتا ہے جب جملہ مثبت ہو چونکہ "مَا وَدَّعَكَ..." جملہ مثبت نہیں اسلئے اس پر لام نہیں آیا۔

سوال: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ "وَدَّعَ" اور "قَلٰى" کی لغوی وضاحت کریں نیز صیغے بتائیں۔

جواب: وَدَّعَ: باب تفعیل "وَدَّعَ يُوَدِّعُ تَوْدِيْعًا" سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ مادہ: و، د، ع۔ مثال واوی۔
قلٰی: "قَلٰى يَقْلِي قِلًى" (ض) سے واحد مذکر غائب ماضی معروف ہے۔ ناقص یائی۔ مادہ: ق، ل، ی۔
"وَدَّعَ" کا معنی ہے: الوداع کہنا، چھوڑ دینا۔ جبکہ "قَلٰى فلانًا" کا معنی ہے: کسی سے متنفر ہو کر ترک تعلق کرنا، کسی کو ناپسند کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔ (قاموس)

سوال: قَلٰى، اٰوٰى، هَدٰى اور أغْنٰى کا مفعول بہ حذف کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: فواصل آیات کا لحاظ کرتے ہوئے مفعول بہ حذف کیا گیا ہے نیز سیاق کلام سے واضح تھا کہ مفعول بہ "ك" ضمیر ہے۔ یعنی قَلَاكَ، اٰوٰكَ، هَدَاكَ، اور أغْنٰكَ۔

سوال: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾ میں "اخرة" اور "أولٰى" سے کیا مراد ہے؟

جواب: ان کے دو معانی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں:

(۱) "اخرة" سے مراد روز آخرت اور "أولٰى" سے مراد دنیا ہے یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ نے بطور انعام جو کچھ آپ

کیلئے آخرت میں تیار کر رکھا ہے وہ دنیا کے مال و اسباب سے بہت بہتر ہے۔

(۲) "آخرۃ" سے مراد آپکی زندگی کے آخری ماہ، سال اور "أولیٰ" سے مراد پہلی زندگی۔ یعنی اے نبی ﷺ ابھی اگر آپ مشکلات، مصائب اور تنگیوں میں ہیں تو غم نہ کیجئے کیونکہ اس کے بعد والی زندگی آپکے لئے بہت خیر و برکت والی ہوگی، آپکو فتوحات، غلبہ، اقتدار اور مال و اسباب سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

سوال: "خیر" اور "آوٰی" کیا صیغے ہیں؟

جواب: خیرٌ: "خَارَ یَخِیْرُ خَیْرًا وَخِیَارَۃً" (ض) سے واحد مذکر اسم تفضیل (أخیر) ہے، اجوف یائی۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اسکا ہمزہ حذف کر دیا گیا۔ مادہ: خ، ی، ر۔ معنی: سب سے بہتر۔

آوی: باب افعال "آوٰی یُؤْوِی اِیْوَاءً" سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: أ، و، ی۔ مہموز الفاء اور لفیف مقرون ہے۔ معنی: اس نے جگہ فراہم کی۔

سوال: ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی﴾ کی جامع وضاحت کریں۔

جواب: اس آیت کی تفسیر کا آخرۃ اور أولی سے گہرا تعلق ہے یعنی اگر آخرۃ اور أولی سے قیامت اور دنیا کی زندگی مراد ہو تو اس آیت کا مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپکو روز قیامت اس قدر انعام عطاء کرے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے، اگر آخرۃ اور أولی سے نبی ﷺ کی ابتدائی اور آخری زندگی مراد ہو تو اس آیت سے مراد ہوگا کہ اے نبی ﷺ جس اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیمی کے باوجود معاشرے میں باعزت مقام عطاء کیا، مقام یاس پر آپکی روحانی راہنمائی کی اور تنگدستی کے باوجود آپکو بے نیاز کر دیا وہ اللہ آپ کو بعد والی زندگی میں بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا، بلکہ اسکی تائید و نصرت آپکے ساتھ ہے اور اسکی عطاء سے آپ راضی ہو جائیں گے۔

سوال: ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی﴾ "وَلَسَوْفَ" میں لام کس معنی میں ہے؟ "فَتَرْضٰی" میں فاء کونسی ہے؟

جواب: "وَلَسَوْفَ" میں لام تاکید کیلئے ہے۔ "فَتَرْضٰی" میں فاء عاطفہ تعقیب کیلئے ہے۔

سوال: ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی﴾ "یُعْطِیْكَ" کا مفعول ثانی ذکر کریں۔

جواب: "یُعْطِیْكَ" کا مفعول ثانی آخرت کی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں اور دنیاوی انعامات بھی۔

سوال: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی﴾ "ضَآلًّا" کیا صیغہ ہے؟

جواب: ضَآلًّا: "ضَلَّ یَضِلُّ ضَلًّا وَضَلَالًا وَضَلَالَةً" (ض) مضاعف ثلاثی سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔

مادہ: ض، ل، ل۔

سوال: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ کا صحیح مفہوم واضح کریں۔

جواب: مفسرین نے اس کے کئی معانی بیان کئے ہیں اور واقعتاً اس لفظ میں کئی مفاہیم کا احتمال موجود ہے، لیکن یہ مفہوم درست معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جاہلی معاشرے میں راہ گم گشتہ کی طرح حیران و پریشان اور حق کے متلاشی تھے نیز اس وقت آپکو شریعت کے اُحکام کا بھی علم نہ تھا۔ جس طرح رب تعالیٰ خود فرماتے ہیں ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ (ترجمہ: تونہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے؟) (الشوریٰ: ۵۲)

ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپکو وحی کے ذریعے حق کا راستہ دکھایا اور شریعت کے اصول وضوابط سکھائے، یہی ''هَدٰى'' کا واضح مفہوم معلوم ہوتا ہے۔

سوال: ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ ''عَآئِلًا'' صیغہ بتائیں نیز لغوی وضاحت کریں۔

جواب: عَآئِلًا: ''عَالَ يَعِيْلُ عَيْلًا وَ عَيْلَةً'' (ض) اجوف یائی سے واحد مذکر اسم فاعل ہے۔ ''عَالَ يَعِيْلُ'' کا معنی تنگ دست ہونا ہے۔ مادہ: ع، ی، ل۔ اور عَالَ يَعُوْلُ عَوْلًا کا معنی ہوتا ہے ''بچوں کی پرورش کرنا، کفالت کرنا، ترازو کے دونوں پلڑوں کا برابر نہ ہونا۔ (قاموس)

سوال: ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ سے کونسی تنگدستی اور غنیٰ مراد ہے؟

جواب: اس جگہ ''عَآئِلًا'' اور ''أَغْنىٰ'' کے دو معانی ہو سکتے ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم مالی طور پر تنگدست تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ کے مال کے ساتھ آپکو غنی کر دیا۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم روحانی طور پر ذرا تنگی محسوس کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت سے مالا مال کر دیا اور دلی طور پر غنی کر دیا کیونکہ ''الْغِنىٰ غِنىٰ النَّفْسِ'' ترجمہ: غنیٰ تو درحقیقت نفس کا غنی ہونا ہے۔ (بخاری: ۶۴۴۶)

سوال: ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپکو غنی کر دیا حالانکہ اکثر اوقات آپ کے گھر کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا ایسی صورت میں ''فَاَغْنٰى'' کا کیا معنی ہوگا؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وراثت میں کوئی مال نہ پایا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپکو غنی کیا۔ ابتدا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی، پھر بکریاں بھی چرائیں، پھر مالدار خاتون سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح بھی ہوگیا، پھر ابوبکر نے اپنا مال بھی پیش کیا، غزوات کے سلسلہ میں آپکو غنیمت، خمس سے حصے بھی ملے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپکو ہر طرح سے غنی کیا۔ (روح، تفہیم)

لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے غنی القلب سے بھی وافر حصہ عطا کیا تھا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو دنیا کے مال سے محبت نہ تھی اور آپ ﷺ چلتی ہوا سے بھی تیز صدقہ کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بسا اوقات آپ ﷺ کے گھر میں کھانے کیلئے کوئی چیز نہ ہوا کرتی تھی۔

سوال: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ ان آیات میں "أما" کس معنی میں ہے؟ نیز یہاں "اليتيم" اور "السائل" مفعول مقدم کیوں ہیں؟

جواب: "أما" اس آیت میں تفصیلیہ بھی ہے اور شرط کے معنی بھی ادا کر رہا ہے۔ (اعراب، التحریر) "اليتيم" اور "السائل" کو تفخیم شان کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ میں "لا تقهر" اور "لا تنهر" کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر اپنے احسانات کے تذکرے کے بعد یہ الفاظ ارشاد فرمائے اسلئے یہ بہت ذو معنی الفاظ ہیں ان سے مراد ہے کہ اے نبی ﷺ آپ نے بھی یتیمی اور تنگدستی کا دور دیکھا ہے اور بنظر عمیق اسکا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ معاشرے میں یتیم اور تنگدست کیساتھ کیسا ہتک آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے؟ اسلئے اگر کوئی یتیم ہو تو اسے مجبور اور مغلوب نہ کرنا اس پر سختی نہ کرنا اور اگر کوئی تنگدست سائل آجائے تو اسے ڈانٹنا اور نہ ہی جھڑکنا ہے تاکہ ان کے جذبات اور عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے۔ نیز واضح رہے کہ اس آیت کے عموم کا تقاضا ہے کہ کسی بھی سائل کو نہ ڈانٹا جائے اگرچہ وہ نماز کے بعد مسجد ہی میں سوال کرنے والا ہو۔

سوال: کیا ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ میں "نعمة ربك" سے صرف ایک نعمت مراد ہے؟

جواب: "نعمة ربك" میں "نعمة" جنس کیلئے مستعمل ہے یعنی ہر طرح کی نعمت مراد ہے۔

سوال: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ میں "حدث" کا مفہوم واضح کریں نیز بتائیں کیا اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جا سکتا ہے؟

جواب: "حدّث" سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا چرچا کیجئے اور آگے بیان کیجئے۔ گویا اسکی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو آگے بیان کرنا مثلاً اگر اللہ تعالیٰ نے آپکو قرآن اور نبوت کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے تو اسے عام لوگوں تک بھی پہنچایئے، اگر اللہ تعالیٰ نے آپکو یتیمی میں عزت بخشی، حق کی طرف راہنمائی فرمائی اور آپکو غنی کر دیا تو آپ بھی لوگوں کیساتھ ایسا ہی سلوک کیجئے۔ گویا اس صورت میں "حدّث" کا معنی نعمتوں کے تقاضے کو پورا کرنا ہے اور ان

سب نعمتوں کے اظہار اور ان کے تقاضے پورے کرنے کا ایک معنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے انعامات کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ ایسا کرنا بھی جائز ہے اور ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں اس کے بے شمار شواہد بھی موجود ہیں اگرچہ تحدیث نعمت کیلئے ایسا کرنا جائز ہے لیکن ساتھ شرط ہے کہ ریا کاری اور شہرت مقصود ہو اور نہ ہی تکبر، فخر وغرور کا خدشہ ہو۔ اسکی ایک اور صورت بھی ہے کہ اللہ کے انعامات کو اسلئے بیان کیا جائے کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں اور نیکی کی طرف رغبت کریں۔

سُوْرَةُ أَلَمْ نَشْرَحْ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ② الَّذِيْٓ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑤ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥ فَإِذَا فَرَغْتَ
فَانْصَبْ ⑦ وَإِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ⑧

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: یہ دونوں سورتیں آپس میں توام ہیں۔ دونوں کا اصل مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ دونوں سورتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تذکرہ ہے نیز دونوں سورتوں کا خلاصہ ﴿إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ میں مضمر ہے۔

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور آپ کی دلجوئی کیلئے اپنے انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی تین عظیم نعمتوں کا ذکر فرمایا:
پہلی: شرح صدر کی نعمت، دوسری: بھاری بوجھ سے نجات، تیسری: رفع ذکر کی نعمت۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ مشکلات کا یہ دور لمبا نہیں ہے بلکہ بہت مختصر ہے اور فراخی کا دور آنے والا ہے۔ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشاغل سے فارغ ہوں تو عبادت کی مشقت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لو لگائیں۔ (تفہیم، المنیر)

سوال: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ کی تشریح کرتے ہوئے بتائیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شرح صدر سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ کو سمجھنے کے لئے پچھلی سورت کی آیت کو سامنے رکھیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی سے کچھ عرصہ پہلے عرب کی اخلاقی اور مذہبی حالت دیکھ کر سخت پریشان رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت تک روشنی کی کوئی واضح کرن نہ تھی، وحی کے ذریعے اس کو دور کیا گیا اور اس کو ہی ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ اور ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شرح صدر کے یہاں دو معانی ہو سکتے ہیں:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے دین ابراہیمی کے چند مبہم نشانات سے واسطہ پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دین ابراہیم کا نمائندہ بنا کر شرح صدر سے نوازا اور صحیح دین ابرہیمی کی تعلیمات سے روشناس کیا اور بتلایا کہ یہی حق سچ کا رستہ ہے۔

(۲) علم وحی اور نبوت کا ملنا ایک عظیم منصب ہے اور اس کے تقاضے بھی انتہائی اولی العزمی اور صبر وثبات کے طالب ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذکورہ بالا صفات عطاء کر کے شرح صدر سے نوازا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منصب نبوت کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کر سکیں۔

سوال: ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ کیا اس آیت سے شق صدر کا واقعہ مراد لیا جا سکتا ہے؟

بعض جید علماء کرام اس آیت کو شق صدر پر بطور دلیل ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورت کی تفسیر شق صدر والی روایت سے کی ہے۔ اور متاخرین میں سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بسیط بحث کرنے کے بعد یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس سے مراد شق صدر ہے۔

لیکن ہماری رائے میں اگرچہ شق صدر کا واقعہ صحیح سند سے منقول ہے لیکن اس آیت سے واقعہ شق صدر مراد لینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآنی نظائر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دلی اطمینان ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی کی دعا کی تھی: ﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ﴾ (ترجمہ: اس نے کہا اے میرے رب! میرے لئے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لئے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی کچھ گرہ کھول دے۔ کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔) (طٰہٰ: ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸)

اور ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۚ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (ترجمہ: تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔) (الانعام: ۱۲۵) میں بھی یہی مراد ہے۔

تالیف قرآن کے موقعہ پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورأیت فی ذلک الذی رای عمر"۔ (بخاری: ۴۶۷۹)

تو عمر رضی اللہ عنہ مجھے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو

عمر دیکھتے تھے۔

ان عبارات میں جو فہم وبصیرت، عقل ودانائی، رشد وہدایت اور صوابدید ی مراد ہے وہی اس آیت سے مراد ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں: حمل الشرح فی الآیة علی شق الصدر ضعیف عند المحققین۔

محققین کے ہاں اس آیت میں شرح صدر کو شق صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے۔ (روح)

اور یہی موقف مولانا مودودی نے تفہیم میں اختیار کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ ''وِزْرَكَ'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: باب ''وَزَرَ يَزِرُ وِزْرًا وَزِرَةً'' (ض) مثال واوی سے ''وِزْرٌ'' مصدر ہے۔ مادہ: و، ز، ر۔ جمع: أوزار۔

سوال: ﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ وہ کونسا بوجھ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو نجات عطاء فرمائی؟

جواب: درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کے معاشرے کی برائیوں سے بہت زیادہ پریشان اور دل گرفتہ تھے۔ ایک طرف بدترین شرک تھا جسکو ایک سلیم الفطرت آدمی کسی صورت قبول نہیں کرسکتا تھا۔ دوسری طرف اخلاقی برائیاں مثلاً برہنہ طواف، شراب وزنا، قتل وغارت اور ظلم وتشدد کا عام ہونا۔ اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ (الکھف: ٦) اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نبوت عطاء کر کے آپکی ذہنی پریشانیاں دور فرمائیں۔

سوال: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کا ذکر تقریباً ہر عبادت میں اپنے ساتھ لازم کردیا مثلاً کلمہ توحید، اذان وغیرہ۔

ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آپکی شہرت خود کفار کے ہاتھوں کروائی کہ وہ لوگوں کو نبی علیہ السلام سے دور رکھنے کیلئے ڈراتے، اس طرح لوگ متجسس ہوکر مزید آپکے قریب آتے اور آپکی شہرت پھیلتی ہی چلی گئی۔

سوال: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ اور ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ میں ''لَكَ'' ضمیر لانے میں کیا حکمت ہوسکتی ہے؟ حالانکہ معنی اس کے بغیر بھی مکمل تھا۔

جواب: ''لَكَ'' ضمیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور شرف کو مزید بڑھانے اور واضح کرنے کیلئے ہے اصل عبارت یوں ہوگی

"ألم نشرح لأجلك صدرك، ورفعنا لأجلك ذكرك"۔ واللہ اعلم۔

سوال: کیا "ألم" کا مفہوم ﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ﴾ اور ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ کی آیات میں بھی موجود ہے؟

جواب: سیاق کلام اسی بات کا متقاضی ہے کہ یہ مفہوم مابعد دو جملوں میں بھی موجود ہو۔ ان کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "اور کیا ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ نہیں اتارا؟، اور کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر بلند نہیں کیا؟" واللہ اعلم (التحریر)

سوال: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ میں "مع" کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: چونکہ "معَ" بمعنی مصاحبت ہوتا ہے اسلئے اس کا معنی یہ ہوگا کہ تنگی کے بالکل ساتھ ہی آسانی بھی آنے والی ہے۔ آسانی تنگی سے بہت دور نہیں ہے۔ (کشاف)

سوال: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ مبتدا تو معرفہ ہوتا ہے لیکن آیت مبارکہ میں مبتدا "يُسْرًا" نکرہ کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: جب مبتدا مؤخر ہو تو اسے نکرہ لانا بھی جائز ہے۔

سوال: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ "ألعُسر" کے مقابلہ میں "يُسرا" کو نکرہ لانے کی حکمت واضح کریں۔

جواب: "ألعُسر" کے مقابلہ میں "يُسرا" کو تفخیم کیلئے نکرہ لایا گیا ہے یعنی تنگی کے بعد آسانی بہت بڑی ہوگی۔ (کشاف)

سوال: ﴿إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ کو مکرر لانے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

جواب: عربوں کی عادت ہے کہ جب کوئی اسم معرفہ ہو اور اسے دوبارہ معرفہ ہی ذکر کیا جائے تو دونوں کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر نکرہ کے بعد نکرہ مکرر آئے تو ان کا مفہوم باہم مختلف ہوتا ہے اسلئے ان آیات مبارکہ میں "العسر" سے مراد تو ایک تنگی ہے لیکن "يُسْرًا" سے مراد دو آسانیاں ہیں، ایک آسانی تو اسی دنیا میں ہوگی اور دوسری روز قیامت ہوگی۔ (کشاف، اعراب)

اسی لئے شاعر نے کہا ہے:

اذا اشتدت بك البلوى	ففكر في الم نشرح
فعسر بين يسرين	اذا فكرته فافرح

سوال: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ﴾ "فَانْصَبْ" صیغہ بتائیں اور اسکی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: باب "نَصِبَ يَنْصَبُ نَصَبًا" (ع) سے واحد مذکر امر حاضر معلوم ہے۔ اسکا لغوی معنی تھک جانا اور محنت و مشقت کرنا ہے۔ مادہ: ن، ص، ب۔

سوال: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ میں ''فَرَغْتَ'' اور ''فَانْصَبْ'' کا مفعول ذکر کریں۔

جواب: مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے لیکن زیادہ واضح یہ محسوس ہوتا ہے ''فإذا فرغت من الدعوة والتبليغ فانصب فی عبادة الله'' یعنی جب آپ دعوت وتبلیغ سے فارغ ہو جائیں تو اللہ کی عبادت میں محنت مشقت کریں۔

سوال: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ○ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بالواسطہ ہمیں تعلیم دے رہے ہیں کہ جب کوئی دوسری مشغولیت نہ رہے تو اپنا فارغ وقت اپنے رب کی عبادت وریاضت میں صرف کرو اور ہر طرف سے توجہ ختم کر کے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اللہ سے لو لگاؤ۔

سوال: ﴿وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ میں ''وَإِلَىٰ رَبِّكَ'' کو مقدم کیوں کیا گیا؟

جواب: بعض کے نزدیک صرف قافیہ کی رعایت رکھی گئی ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جار مجرور کو فعل سے مقدم کرنے سے کلام میں تخصیص آجاتی ہے۔ ''وَإِلَىٰ رَبِّكَ'' کو ''فارغب'' سے مقدم کرنے سے اس میں تخصیص پیدا ہوئی کہ ''اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کیجئے'' یا ''صرف اپنے رب کی طرف پس رغبت کیجئے''۔ اگر اس کو فعل سے مؤخر ہی رکھا جاتا تو معنی یوں ہوتا: ''اپنے رب کی طرف پس رغبت کیجئے''۔ (التحریر)

سُوْرَةُ التِّيْنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝٧ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝٨

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت میں اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی افضل ترین شخصیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ فرمایا جبکہ اس سورت میں نوع انسانی کی خلقت کا تذکرہ فرما کر اس کے عروج وزوال کے اسباب کو بیان کیا کہ ایمان اور عمل صالح ہی اس عروج کا باعث اور اس فضلیت کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور ان سے دوری زوال کا سبب ہیں۔ (المنیر ، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع جزاوسزا کا اثبات ہے۔

ابتدا میں انبیاء کرام کے مقامات ظہور کو اس بات پر بطور شہادت ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو بہترین ساخت، اعلیٰ فطرت اور نہایت برتر صلاحیتوں پر پیدا کیا ہے کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے۔ اس کے بعد نوع انسانی کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا، ایک وہ جو فطرت سلیمہ کو مسخ کر کے اخلاقی پستیوں اور برائی کی طرف مائل ہو کر ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتے ہیں۔

دوسرا وہ گروہ جو ایمان وعمل صالح کا راستہ اختیار کر کے اس گراوٹ سے بچ جاتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے سرفراز ہوتا ہے۔ آخر میں ان دو گروہوں کے وجود سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب ان دونوں گروہوں کے اعمال میں یکسانیت نہیں تو بروز قیامت گناہ گار کو سزا اور نیک کو جزا نہ ملنا کہاں کا عدل ہے؟

حالانکہ انسانی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے پھر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ جو احکم الحاکمین ہے وہ انصاف نہ کرے؟ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ﴾ کی تفسیر میں دو مشہور قول ہیں۔

(۱) اس سے مراد حقیقی اور اصل معنی ہی ہیں یعنی انجیر اور زیتون۔ ان پھلوں کے کثرت منافع کی وجہ سے ان کو خلقت انسانی پر بطور شہادت ذکر کیا ہے۔

(۲) اس سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں یہ پھل بکثرت پائے جاتے ہیں کیونکہ عرب عموماً پھلوں کے علاقوں کو ان کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی طرح آیات کا لاحقہ نظم بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اگلی آیات میں بھی مقامات ہی کا ذکر ہے یعنی طور سینا اور بلد امین۔ نیز انسانی خلقت پر پھلوں کی نسبت مقامات انبیاء کو بطور شہادت پیش کرنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم) (تفہیم، التحریر، روح، تدبر)

سوال: ﴿وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ﴾ میں "سِیْنِیْنَ" کی اعرابی حالت اور لغوی معنی کی وضاحت کریں۔

جواب: "سِیْنِیْنَ" "طور" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے۔

جہاں تک اس کی لغوی وضاحت کا تعلق ہے۔ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ان سب میں جو مشترک بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔ کسی نے اس کا معنی خوبصورت اور اچھا کیا ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ جس پہاڑ پر پھل دار درخت ہوں اس کو قبطی زبان میں "سِیْنِیْنَ" یا "سینا" کہتے ہیں۔ اور اس کا اعراب جمع مذکر سالم کی مثل ہے۔ حالانکہ یہ جمع نہیں ہے جس طرح "صفین" اور "یبرین" ہیں۔ اور بعض لوگوں نے اس کو غیر منصرف قرار دیا جو کہ غیر درست معلوم ہوتا ہے۔

سوال: ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ﴾ میں "اَمین" کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: یہ بات واضح ہے کہ ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ﴾ سے مراد مکہ ہے۔ اور یہ امن کا گہوارہ ہے ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (ترجمہ: اور جو کوئی اس میں داخل ہوا امن والا ہو گیا) (آل عمران: ۹۷) جس وقت سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم سے اپنی بیوی اور بیٹے کو یہاں چھوڑا تب یہ علاقہ غیر آباد تھا۔ ان کی دعا کی بدولت غیر آباد علاقہ آباد ہو گیا اور امن کے ساتھ ساتھ رزق بھی وافر ہو گیا۔

سوال: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ میں ''اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ'' کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: انسان کو ایسا اعلیٰ درجے کا متوازن جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ اسکے علاوہ فہم وفراست، تفکر وتدبر اور عقل وشعور جیسی عظیم صلاحیتیں عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کے نصیب میں کہاں اور اس کو ظاہری شکل وصورت اور ڈیل ڈول اس قدر اعلیٰ عطا کی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (ترجمہ: اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لئے عظیم نشانیاں ہیں اور تمھارے نفسوں میں بھی، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟) (الذاریات: ۲۱) تا کہ انسان اپنے باطن کو ضیاء دیکر شیطان اور اس کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہ کر أسفل سفلین کی مذموم حالت سے محفوظ ومامون رہ سکے۔

سوال: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ ''تَقْوِيْمٍ'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: باب تفعیل ''قَوَّمَ يُقَوِّمُ'' سے مصدر قیاسی ہے، مادہ: ق، و، م۔

سوال: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ﴾ کی ترکیب اور معنی کریں۔

جواب: ''ثم'' حرف عطف ہے۔ ''رددنا'' فعل بافعل، ''ہ'' ضمیر مفعول بہ، ''أسفل سفلین'' مضاف مضاف الیہ ملکر ''رددنا'' کا مفعول فیہ ثانی ہے۔ (التحریر) ''پھر ہم نے اس کو نیچوں میں سے سب سے نیچا کر دیا''۔

سوال: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ﴾ میں ''اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ'' کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: بعض علماء نے اس سے مراد بڑھاپہ لیا ہے۔ جو کہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا اصل معنی انسانی اخلاقی پستی ہے۔ جو انسان احسن تقویم کا لحاظ نہیں کرتا وہ اخلاقی گراوٹ میں اس قدر نیچ ہو جاتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ دوسروں کے خون سے ہولی کھیلتا ہے۔ بھائیوں کے سامنے بہنوں کے ننگے ڈانس، ماؤں کو اپنے ہی اکلوتوں کا خون پینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس درندگی سے جنگل کے خون خوار درندے بھی شرم سار ہوتے ہیں۔ دوسروں کی املاک کو ناحق طریقے سے استعمال کو اپنا حق گردانتا ہے۔ زنا، شراب، سود خوری، رشوت، جھوٹ، غیبت، حسد، کینہ، بغض اس کی غذا کا کام کرتے ہیں۔ اور یہی احسن تقویم والا انسان بعض اوقات خود ہی اپنے دل کے سکون اور چین، شیریں پھل اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ ہر زمانے کا عام مشاہدہ ہے۔ دنیا تو دنیا ان لوگوں کے ہاتھوں دین بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ انہوں نے سمیع وبصیر ذات کو چھوڑ کر خود تراشیدہ مورتیوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ (العیاذ باللہ)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ میں استثناء کی کونسی قسم ہے؟

جواب: اگر ''إلا'' بطور استثناء ہو تب یہ منقطع ہے۔ بعض علماء نے اس کو ''لکن'' کے معنی میں لیا ہے، تب بعد والا جملہ اس کا اسم اور خبر ہوگی۔

سوال: ﴿إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ ''غَيْرُ'' قرآن میں کن معانی کے لیے استعمال ہوا ہے؟ اور یہاں کس معنی میں ہے؟

جواب: ''غَيْرُ'' قرآن میں چار معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے:

۱۔ حرف نفی کے لیے: ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ (ترجمہ: اور وہ جھگڑے میں بات واضح کرنے والی نہیں ہے) (زخرف: ۱۸)

۲۔ إلا کے معنی میں: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ﴾ (فاطر: ۳) (ترجمہ: کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے؟)

۳۔ اصل چیز باقی رکھتے ہوئے صرف ظاہری شکل وصورت کی نفی کے لیے: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (ترجمہ: جب بھی ان کی کھالیں گل سڑ جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں) (النساء: ۵۶)

۴۔ کسی شئی کی مکمل نفی کر کے دوسری شئی کو اس کی جگہ قائم کرنا: ﴿اَغَيْرَ اللهِ اَبْغِيْ رَبًّا﴾ (الانعام: ۱۶۴) (ترجمہ: کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں؟)۔ (انوار)

اس آیت مبارکہ میں ''غَيْرُ'' صرف نفی کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے یعنی ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہوگا۔

سوال: ﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ ''مَمْنُوْنٍ'' کی صرفی اور لغوی وضاحت کریں۔

جواب: ''مَمْنُوْنٍ'' باب ''مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا'' (ن) سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔ یہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں یہ ''کم ہونے اور ختم ہونے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مادہ: م، ن، ن۔

سوال: ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ﴾ میں ''بَعْدُ'' کیوں مرفوع ہے؟

جواب: ''بعد'' کا مضاف الیہ متکلم کی نیت میں ہے اور محذوف ہے اس لئے مبنی برضمہ ہے۔ أي بعد ذکر هذا الدلائل۔

سوال: ﴿فما یکذبك﴾ میں خطاب کس کو ہے؟

جواب: اس بارے میں دو آراء ہیں: بعض علماء کے ہاں اس آیت میں خطاب نبی ﷺ کو ہے اور بعض کے نزدیک یہاں خطاب انسان کو ہے۔ یہاں پہلے ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ'' میں صیغہ غیب سے بیان کیا ہے اب اس آیت میں ''فما یکذبك'' سے مخاطب کیا ہے تاکہ جھٹلانے والے کو سختی سے جھنجھوڑا جائے اور اس کی سرزنش کی جائے۔ (التحریر، تفہیم)

سوال: ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: ''پس اس کے بعد کون سی چیز تجھے جزا وسزا کو جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے''۔ ''پس (اے نبی ﷺ) اس کے بعد کون جزا وسزا کے معاملے میں تم کو جھٹلاتا ہے۔''

سوال: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ میں لفظ ''اللّٰهُ'' اور ''اَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ'' کا اعراب اور وجہ اعراب ذکر کریں۔

جواب: لفظ ''اللّٰهُ'' ''لَيْسَ'' کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع اور ''اَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ'' ''لَيْسَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب اور لفظاً مجرور ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ میں ''أحكم'' اور ﴿فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ میں ''اَحْسَنِ'' غیر منصرف ہونے باوجود ان پر کسرہ کیوں آیا ہے؟

جواب: جب غیر منصرف مضاف ہو یا اس پر الف لام داخل ہو تب اس پر حالت جر میں کسرہ آ سکتا ہے۔

سوال: کیا اس سورت کے آخر میں نبی ﷺ سے کوئی دعا پڑھنا صحیح روایت سے ثابت ہے؟

جواب: سنن ترمذی اور سنن أبی داؤد کی ایک روایت میں ''بلی وأنا علی ذلك من الشهدين'' کے الفاظ ملتے ہیں لیکن علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات کو ضعیف کہا ہے۔ (ضعیف سنن ترمذی: ۵۸۵ ۳، ضعیف سنن أبی داؤد: ۸۸۷)

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ⑥ اَنْ
رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ⑦ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ⑧ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ⑨ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ⑩
اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ⑪ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ⑫ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ⑬ اَلَمْ
يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ⑭ كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ⑮ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ
خَاطِئَةٍ ⑯ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ⑰ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ⑲ السجدة

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت میں ایمان اور عمل صالح سے فرار ہونے والوں کا تذکرہ ہے۔ اس سورہ میں قریش مکہ کو تنبیہ کی گئی کہ یہ بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اللہ کا جو بندہ ان کیلئے ایمان وعمل صالح کی راہ کھولتا ہے یہ اس کے جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور نماز کی حالت میں بھی گستاخانہ رویہ سے باز نہیں آتے۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کے ابتدا میں قراءت اور انسان کی تخلیق کا ذکر ہے۔ پھر انسان کی سرکشی اور اس کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز سے روکنے والے ابوجہل کی رسوائی اور اس کو سخت انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ (المنیر)

سوال: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ "اقرأ" کا مفعول یعنی "مقروٴ" کیا ہے؟

جواب: "اقرأ" کا مفعول محذوف ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ لفظ قرآن محذوف ہے کہ قرآن پڑھیے۔ حالانکہ اس وقت قران نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہاں "مايوحى إليك" جملہ محذوف درست معلوم ہوتا ہے۔ بعض علماء کے ہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کر کے پڑھنے کے لئے کہا تھا ورنہ اگر سن کر دہرانا مقصود ہوتا تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ "ما أنا بقاري"۔ (التحریر، انوار تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ﴾ ''اقرأ'' میں ''قراۃ علی الناس'' مراد ہے یا خود پڑھنا؟ وضاحت کریں۔

جواب: بعض علماء نے ''اقرأ'' کو ''اقرأ علی الناس، اتل علی الناس'' کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ معنی غیر درست معلوم ہوتا ہے۔ اور جن آیات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے بلاشک ان میں ''قراۃ علی الناس'' کے معنی لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہاں اگر صحیح البخاری کی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے پیش نگاہ ہو۔ تب یہ معنی محض تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث میں آپ فرماتے ہیں: ''ما أنا بقاری'' ''میں پڑھنا نہیں جانتا''۔ اس وقت آپکو کوئی صحیفہ سپرد کیا گیا تھا اور نہ ہی اس سے پہلے کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔ پھر یہ معنی مراد لینا کیسے درست ہے؟

دوسری بات لوگوں کو انذار اور دعوت کا سلسلہ جن آیات سے شروع ہوا وہ سورۃ المدثر کی آیات ہیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۝ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ﴾ (ترجمہ: اے کمبل میں لپٹنے والے! اٹھ کھڑا ہو پس ڈرا) (المدثر: ۱، ۲)۔ لہذا یہاں پڑھنا ہی مراد لیا جائے گا۔ جو اکثر مفسرین کا موقف ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ﴾ میں ''إنسان'' واحد ہے۔ ''علق'' جمع استعمال ہوا ہے۔ وجہ بیان کریں۔

جواب: صاحب کشاف نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہر فرد ایک نطفہ سے پیدا ہوا ﴿مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ﴾ (ترجمہ: ایک قطرے سے پھر کچھ جمے ہوئے خون سے) (الحج: ۵) لیکن یہاں لفظ ''إنسان'' بطور جنس استعمال ہوا جیسے ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ﴾ (ترجمہ: بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے) (العصر: ۲) اس لئے ''علق'' جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یہ عَلَقَةٌ کی جمع ہے۔ (القاموس)

سوال: ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ﴾ قرآن مجید میں انسانی تخلیق کے مراحل ذکر کرنے کی کیا حکمت ملحوظ ہوتی ہے؟

جواب: اس سے عموماً تین حقیقتوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جس پروردگار کی قدرت وحکمت کا یہ سماں ہے کہ وہ ایک پھٹکی سے ایک عقل وشعور رکھنے والا، سمیع وبصیر انسان پیدا کر سکتا ہے۔ تو اس کے لیے دوبارہ زندہ کرنا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے؟

(۲) دوسری یہ کہ انسانی تخلیق میں جو حکمتیں اور راز مخفی ہیں وہ اس پر دال ہے کہ یہ ہستی بے غایت، بے مقصد نہیں ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ انسان کو اپنی پیدائش کی ابتدا کی طرف نظر جمانی چاہیے کہ وہ کس قدر حقیر عنصر سے پیدا ہوا اور اس کا غرور اور تکبر اس کے سامنے کیا معنی رکھتے ہیں۔ (تدبر، ملخصاً)

سوال: ﴿اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُۙ﴾ صیغہ کا لحاظ کرتے ہوئے ترجمہ کریں۔

جواب: ’’پڑھ اور تیرا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہی ہے‘‘۔

سوال: ﴿كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ﴾ میں ’’كَلَّآ‘‘ کس کلام کی تردید کے لیے ہے؟

جواب: ’’كَلَّآ‘‘ سے مقصود قریش کے افتراء کی تردید ہے جو آنحضرت ﷺ کی دعوت کے رد میں پیش کرتے تھے فرمایا کہ یہ سخن سازیاں محض حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت تو اللہ سے بے نیازی اور دنیا سے محبت ہے لیکن ظاہر یہ کررہے ہیں کہ ان کے کچھ شبہات ہیں اور نبی اکرم ﷺ ان کے جوابات نہیں دے پا رہے۔

سوال: ﴿كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ﴾ میں ’’الإنسان‘‘ سے کون مراد ہے؟ اور ’’لَيَطْغَىٰٓ‘‘ کیا صیغہ ہے؟

جواب: یہاں کوئی خاص انسان مراد نہیں ہے بلکہ انسانوں کی عمومی فطرت یہی ہے اور خاص کر کفار کی۔

لَيَطْغَىٰٓ: ’’طَغٰی یَطْغٰی طغیان‘‘ سے واحد مذکر غائب فعل مضارع ہے۔ مادہ: ط، غ، ی۔

سوال: ﴿كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ﴾ کا سلیس ترجمہ اور مفہوم بیان کریں۔

جواب: ترجمہ: ہرگز نہیں! بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔

مفہوم: یعنی یہ دیکھ کر کہ مال، دولت، عزت وجاہ اور جو کچھ بھی دنیا میں وہ چاہتا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے، شکر گزار ہونے کی بجائے وہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور حد بندگی سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿أَن رَّءَاهُ اسْتَغْنَىٰٓ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: اس جملے سے پہلے لام جر محذوف ہے۔ ’’أن‘‘ حرف موصول اپنے مابعد صلہ سے مل کر مصدر کی تاویل میں ہوا اور لام جر کا مجرور ہوا۔ أي ’’لرؤية نفسه مستغنيا‘‘۔ (اعراب)

سوال: ﴿أَن رَّءَاهُ اسْتَغْنَىٰٓ﴾ ’’راٰه‘‘ کیا صیغہ ہے؟ نیز ’’راٰه‘‘ میں فاعل اور مفعول کی ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: راٰ: ’’رَاٰی یَرٰی رَاْیًا وَرُؤْیَةً‘‘ سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ر، ء، ی۔ اصل میں ’’رأی‘‘ تھا۔ اس میں مد ہمزہ اور الف ساکن کی وجہ سے ہے۔ جب ’’أن‘‘ کے بعد ضمیر غائب آجائے تب ان کو مدغم کر دیا جاتا ہے۔ اور ’’راٰه‘‘ میں فاعل اور مفعول کی ضمیر کا مرجع سابقہ آیت میں ’’الإنسان‘‘ ہے۔

سوال: ﴿أَن رَّءَاهُ اسْتَغْنَىٰٓ﴾ کیا ’’راٰه‘‘ کی طرح فاعل اور مفعول کی ضمیروں کا ایک مرجع کی طرف لوٹنا درست ہے؟

جواب: فاعل اور مفعول کی دو ضمائر جن کا مرجع ایک ہی ہو ان کا کسی ایک جملہ میں اکٹھا ہونا ممنوع ہے۔ صرف ظَنَّ وأخواتها (رأى، حسب وغیرہ) ان افعال کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے ساتھ فاعل اور مفعول کی دو متحد المرجع ضمیریں

بھی آ جاتی ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے: ﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ﴾ (الاسراء: ۶۲) اسی طرح کہا جاتا ہے " رأيتُني. (میں نے اپنے آپ کو دیکھا) حسبتُني. (میرا اپنے بارے میں گمان ہے) متى تراك خارجًا. (تونے کس وقت اپنے آپ کو خارج ہوتے دیکھا) متى تظنك خارجًا (تونے کب اپنے آپ کو نکلتے ہوئے گمان کیا)"۔ (التحریر)

سوال: ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز "اسْتَغْنٰى" صیغہ اور مفہوم ذکر کریں۔

جواب: ترجمہ: جب اس نے دیکھا اپنے آپ کو (کہ وہ مال ودولت کی وجہ سے) بے پرواہ ہو چکا ہے۔

اسْتَغْنٰى: باب استفعال "اِسْتَغْنٰى يَسْتَغْنِي اِسْتِغْنَاءً" سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: غ، ن، ی۔

مفہوم: "اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى" میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفسیات کی بہت بڑی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان کی سرکشی، طغیانی اور بغاوت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی اور بے پرواہ سمجھتا ہے۔ جب یہ داعیہ انسانی نفس میں پروان چڑھتا ہے کہ اس کے پاس مال ودولت، خادم وفوج سبھی کچھ ہے، اس کو اب کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے، تب انسان مالک حقیقی کی نعمتوں کے اقرار وشکر کی بجائے ناشکری اور طغیانی پر اتر آتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ میں "رجعی" کیا صیغہ ہے؟ "اِلٰى رَبِّكَ" میں خطاب کس کو ہے؟

جواب: "رجعی" "بشری" کے وزن پر "رجع يرجعُ رَجْعًا" (ض) سے مصدر ہے۔ مادہ: ر، ج، ع۔

"اِلٰى رَبِّكَ" میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ اس بدبخت کا لوٹنا تو ہماری طرف ہے پریشان نہ ہوں۔ یا انسان کو مخاطب ہے کہ انسان جتنا بھی سرکشی میں حدیں پھلانگ لے آخرکار تیرا رجوع اپنے رب کی طرف ہے۔ ہر صورت میں تہدید اور تحذیر کا پہلو ملحوظ ہے۔ (کشاف، روح)

سوال: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى﴾ قرآن مجید میں "أرءيت" کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے؟

جواب: جب کسی نہایت نامناسب حرکت پر لوگوں کی توجہ دلانی ہو یا اس پر نکیر ہو جس طرح ہم اردو میں کہتے ہیں: "بھلا تم نے اس کو دیکھا، کیا تم نے اس کا حال دیکھا، ذرا اس کو تو دیکھو"۔ (تدبر)

سوال: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى﴾ "الَّذِىْ يَنْهٰى" سے کون مراد ہے؟

جواب: ہمارے اکثر مفسرین نے اس سے ابوجہل کو مراد لیا ہے۔ ابوجہل کو مراد لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن یہاں ہر وہ شخص مراد ہے جو نمازی کو نماز سے روکتا ہے۔ چاہے اس وقت کے لوگ ہوں یا آج کے لوگ۔ (روح)

سوال: ﴿عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی﴾ ''عَبۡدًا'' سے کون مراد ہے؟ اور اس کو نکرہ کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: ''عَبۡدًا'' سے اولین مراد تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کیونکہ ابو جہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی روکنے کی کوشش کی تھی۔ ''عَبۡدًا'' کو نکرہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں کلام میں اصل مقصود مُصَلِّی کی خصوصیت بیان کرنا نہیں بلکہ فعل نماز سے روکنے کی شناعت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ (واللہ اعلم) (التحریر)

سوال: ﴿عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی﴾ میں ''اِذَا'' کس سے ظرف ہے؟

جواب: ''اِذَا'' یہاں ظرف زمان کے لیے ہے اور ''ینھی'' سے ظرف واقع ہو رہا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی ...... اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ میں ''رای'' کے دو مفعولوں کی وضاحت کریں۔

جواب: جب ''رای'' ''علِم'' کے معنی میں ہو اس وقت یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ (المحرر)

سوال: ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی ...... اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ ان آیات میں ''اِنۡ'' شرطیہ ہے یا مخففہ من المثقلہ؟

جواب: ان آیات میں شرطیہ ہی ہے۔ مخففہ من المثقلہ نہیں ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی﴾ کا مفہوم بیان کریں نیز بتائیں کہ ''ھدی'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھی اس شخص کی حرکت جو اللہ کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہ راست پر ہو، یا لوگوں کو اللہ سے ڈرنے اور برے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو، اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اس سے منہ موڑتا ہو، تو اس کی یہ حرکت کیسی ہے؟۔ (تفہیم)

ھدی: ''هَدٰی یَهۡدِیۡ'' (ض) سے مصدر ہے۔ مادہ: ھ، د، ی۔

سوال: ﴿اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی﴾ ''اَوۡ'' یہاں تخییر کے لئے ہے یا واؤ کے معنی میں؟

جواب: ''اَوۡ'' یہاں حرف عطف ہے جس کا عطف ''کان علی الھدی'' پر ہو رہا ہے۔ لیکن معنی کے لحاظ سے یہ واؤ کے معنی میں ہی معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی﴾ ''تقوی'' صیغہ اور معنی ذکر کریں۔

جواب: تقوی: ''وَقٰی یَقِیۡ وَقۡیًا وَوِقَایَةً'' (ض) سے اسم ہے۔ معنی: ڈر، خوف، ہیبت، احتراز، اخلاص، پرہیزگاری۔

مادہ: و،ق،ی۔

سوال: ﴿أَرَءَيْتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ...... أَرَءَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾ ان شروط کا جواب شرط کیا ہیں؟ اور بتلائیں کہ جواب شرط کیوں حذف کیا جاتا ہے؟

جواب: اس آیت کا جواب شرط محذوف ہے تقدیری عبارت یوں ہوگی: "إن كان على الهدى أينهاه أيضًا" (التحریر) بسا اوقات جواب شرط اس لیے حذف کیا جاتا ہے کہ اس کی سنگینی احاطہ بیان سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں بھی جواب شرط اسی وجہ سے محذوف ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿أَرَءَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾ کا جواب شرط کیا ہے؟

جواب: جن علماء نحاۃ کے نزدیک جملہ انشائیہ بغیر فاء کے جواب شرط بن سکتا ہے، انہوں نے تو ﴿ألم يعلم بأن الله يرىٰ﴾ کو جواب شرط بنایا ہے۔ اور جن کے نزدیک فاء کا داخل ہونا ضروری ہے، انہوں نے اس کا جواب شرط (فالله عالم به) محذوف نکالا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ "يَنتَهِ" کیا صیغہ ہے؟

جواب: باب افتعال "إِنْتَهَى يَنْتَهِي إِنْتِهَاءً" سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: ن، ہ، ی۔ اصل میں "ينتهي" تھا۔ حالت جزم میں ہونے کی وجہ سے حرف علت "ی" ساقط ہوگئی۔

سوال: ﴿كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ "يَنتَهِ" "إن" کی وجہ سے مجزوم ہے یا "لم" کی وجہ سے؟

جواب: يَنتَهِ: "لم" کی وجہ سے مجزوم ہے اور جملہ "لم ينته" "إن" کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔

سوال: ﴿كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ "ناصية" کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے بتلائیں کہ یہاں "ناصية" کو ذکر کرنے کی کیا حکمت ہے؟

جواب: ناصية: پیشانی اور اس پر بکھرے ہوئے بالوں پر بولا جاتا ہے۔

ناصية سے پکڑ کر گھسیٹنے میں حکمت ایک تو صاحب تدبر نے بیان کی ہے کہ چہرہ اور پیشانی انسان کی سب سے اشرف جگہ ہے اور اس پر سب سے اشرف نشان سجدے کا نشان ہے۔ اگر کوئی بدبخت اور قسمت کا ہارا ہوا خود اس پیشانی کو سجدے کے نور سے منور نہیں کرتا بلکہ اس کی شقاوت اس حد درجہ کو چھو رہی ہے کہ جو اپنے رب کے حضور اس پیشانی کو رکھتا ہے اسے بھی روکتا ہے۔ یہ نابکار اسی کا حقدار ہے کہ اسے پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹا جائے اور ذلیل کیا جائے۔ (تدبر، ملخصًا)

قرآن نے مجرموں کے بارے میں کہا: ﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ﴾ (ترجمہ: مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے پھر پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑا جائے گا) (الرحمن: ۴۱)

سوال: ﴿كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ "لنسفعًا" کیا صیغہ ہے؟ اور اس کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "لنسفعًا" میں لام تاکید کا ہے اور "نسفعا" اصل میں "نَسْفَعَن" تھا۔ "سَفَعَ يَسْفَعُ سَفْعًا" سے جمع متکلم مضارع بانون تاکید خفیفہ ہے۔ الف اس نون خفیفہ کے عوض ہے۔ "سفع" کے معنی ہیں: "کسی آدمی کو ذلیل اور حقیر جانتے ہوئے گھسیٹنا"۔ "تقول العرب سفعت بيدي ناصية الفرس والرجل، إذا جذبتها مذللا له"۔ مادہ: س، ف، ع۔

سوال: ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾ ﴿بِالنَّاصِيَةِ﴾ سے بدل ہے۔ کیا معرفہ سے نکرہ کو بدل بنایا جا سکتا ہے؟

جواب: ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾ ﴿بِالنَّاصِيَةِ﴾ سے بدل ہیں۔ اگرچہ ان دونوں میں معرفہ اور نکرہ ہونے میں باہمی فرق ہے۔ لیکن جب نکرہ موصوفہ ہو اس وقت اس کو معرفہ کا بدل بنانا جائز ہوتا ہے۔ (کشاف)

سوال: ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ﴾ "نَادِيَهُ" کی لغوی وضاحت کریں۔ اور "نَادِيَهُ" کے آخر میں "ہ" کیا ہے؟

جواب: "نادی" کے ساتھ "ہ" ضمیر ہے۔ اس لیے مفعول ہونے کی وجہ سے "نَادِيَهُ" ہو گیا۔ اصل میں "نادی" تھا۔ "نادی" عربی لغت میں "مجلس، نشست گاہ، چوپال، جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں" کو کہا جاتا ہے۔ یہاں "أهل نادي" مجلس کے لوگ، ممبران اسمبلی مراد ہیں۔ (کشاف)

سوال: ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ "سَنَدْعُ" اصل میں "سَنَدْعُو" تھا بتائیں کہ واؤ کیوں حذف ہوئی ہے؟

جواب: یہ "فليدع ناديه" کا جواب امر ہے۔ لیکن یہ ہماری عام نحو کی کتب کی اصطلاح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر امر کے بعد ایک شرط محذوف ہوتی ہے۔ اور بعد والا جملہ اس کا جواب شرط ہوتا ہے۔ "فليدع ناديه .إن يدع ناديه سندع الزبانية"۔ یہ امر کا قاعدہ ہر جگہ پر لاگو ہوتا ہے۔

سوال: ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ "الزَّبَانِيَةَ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: پولیس کے سپاہی۔ یہ "زبنی" کی جمع ہے، جو کہ "زبن" مصدر سے ماخوذ ہے جس کے معنی دفع کرنے، ہٹانے کے ہیں۔

سوال: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب﴾ کا مفہوم واضح کریں۔

جواب: آپ جس قدر زیادہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونگے اتنا ہی زیادہ آپ اللہ کا قرب حاصل کریں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں اللہ کو پانے کے لیے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بزرگ سیڑھی ہیں۔ اس آیت سے ان کے اس زعم باطل کی پرزور تردید ہو رہی ہے۔ اللہ کو پانے کے لیے سیڑیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی پیشانی کو سجدے میں رکھ کر آہ وزاری کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ کیا صیغے ہیں؟

جواب: اسْجُدْ: سَجَدَ يَسْجُدُ سُجُوْدًا (ن) سے واحد مذکر امر حاضر معلوم ہے۔ مادہ: س، ج، د۔

اقْتَرِبْ: باب افتعال ''اِقْتَرَبَ يَقْتَرِبُ اِقْتِرَابًا'' سے واحد مذکر امر حاضر معلوم ہے۔ مادہ: ق، ر، ب۔

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ② لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ③ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ④ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ⑤

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: قرآن مجید نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر جو عظیم احسان فرمایا اور تعلیم بالقلم کا اہتمام کر کے اس کی حفاظت اور خلق کی ہدایت کا جو سامان کیا، اس کا ذکر سابقہ سورۃ میں بالاجمال ہوا ہے۔ اب اس سورت کا موضوع ہی نزول قرآن ہے، اس میں خاص اس مبارک رات کی نشان دہی فرمائی گئی ہے جس میں اس کا نزول ہوا ہے اور ساتھ ہی اس رات کی وہ اہمیت و عظمت بیان ہوئی ہے جو دوسری راتوں کے بالمقابل اس کو حاصل ہے۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ پھر اس لیلۃ القدر کی فضیلت کو بیان کیا ہے کہ یہ ہزار ماہ سے افضل ہے اور اس میں فرشتے اور جبریل اپنے رب کے اذن سے احکام لے کر نازل ہوتے ہیں اور وہ رات شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے۔ (المنیر، تفہیم)

سوال: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ''اَنْزَلْنٰهُ'' میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: یہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے قرآن کا ذکر نہیں ہوا لیکن وجدان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''إنا أنزلنه'' کی ''ہ'' ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس طرح کی ضمائر قرآن میں کئی مقامات پر ہیں۔ (اعراب)

سوال: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ''لیلۃ القدر'' کی وجہ تسمیہ ذکر کریں۔

جواب: اس کو قدر والی رات اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں تقدیر امور کے متعلق فیصلے ہوتے ہیں یا تقسیم امور کے

بارے میں۔ اسی رات کے بارے میں سورۃ دخان میں بیان ہوا ہے: ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ○ فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍ ○ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ﴾ (ترجمہ: بے شک ہم نے اسے ایک بہت برکت والی رات میں اتارا، بے شک ہم ہی ڈرانے والے تھے۔ اس میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہماری طرف سے حکم کی وجہ سے، بے شک ہم ہی بھیجنے والے ہیں) (الدخان: ۳، ۴، ۵)۔ بعض علماء کے ہاں لیلۃ القدر بمعنی لیلۃ الشرف ہے۔

سوال: ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ کیا مکمل قرآن مجید اسی رات میں نازل ہوا ہے؟

جواب: یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ بوقت ضرورت اور حکمت الٰہی کے پیش نظر ۲۳ سالوں میں مکمل ہوا ہے۔ پھر اس آیت کا کیا معنی ہوا کہ ہم نے قرآن حکیم اس رات میں نازل کیا ہے؟۔ یہ تعبیر اس وجہ سے درست ہوسکتی ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کا آغاز اسی مبارک رات سے ہوا یا یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ رب العزت نے لوح محفوظ سے بیت العزۃ پر نازل فرمایا۔ دونوں توجیہات کو بیک وقت مراد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ دونوں کی تائید سلف کے اقوال سے ہوتی ہے۔

سوال: ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ "لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ" سے کون سی رات مراد ہے؟

جواب: کسی ایک رات کو متعین کرنا کہ فلاں رات لیلۃ القدر ہے بہت مشکل ہے۔ وہ دن اور وہ راتیں جنکی فضیلت قرآن وحدیث میں وارد ہے ان کو اپنے فہم سے یا ضعیف اور موضوع روایات سے متعین کرنا بھی سراسر غلطی ہے۔ بعض سلف سے اسکی تعیین میں اقوال ملتے ہیں، لیکن صحیح احادیث سے جو بات مفہوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں کوئی ایک رات ہے۔ (بخاری: ۲۰۱۷)

سوال: ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ کیا "لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ" ایک ہی رات ہے یا ہر سال مختلف راتوں میں آتی ہے؟

جواب: پچھلے سوال کے جواب میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔

سوال: پاکستان میں جس وقت "لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ" ہوتی ہے اس وقت امریکہ میں دن ہوتا ہے اسکی وضاحت کریں۔

جواب: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں وقت ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہوتا، بعض وہ ممالک ہیں جو پاکستان سے ۱۲ گھنٹے آگے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ۱۲ گھنٹے پیچھے ہیں۔ یعنی اگر یہاں ۱۲ گھنٹے پہلے صبح کی اذان ہوچکی ہے تو وہاں اتنی دیر بعد ہی فجر کی اذان ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ نظام ہے جس کا انکار ممکن نہیں، لہذا ہر ملک اپنے وقت کا پابند ہے اور اس میں اسی کے ٹائم کے لحاظ سے عبادات ہوں گیا اور اسی کے اعتبار سے لیلۃ القدر ہوگی، اگر دوسرے ملک میں دن ہے تو اس سے کوئی

فرق نہیں پڑے گا۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ "اَلْفِ شَهْرٍ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: ہزار مہینوں سے مراد ۸۳ سال نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ طویل عمر کی محنت ایک طرف اور صرف ایک رات کی محنت ایک طرف۔ دونوں کا مقابلہ وموازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ عرب لوگوں کو جب کثرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا تب وہ ہزار کا لفظ بولتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (ترجمہ: ان کا ہر ایک چاہتا ہے کاش! اسے ہزار سال عمر دی جائے) حالانکہ اس سے پہلے ہے: ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ (ترجمہ: اور بلا شبہ یقیناً آپ انہیں سب لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے پر حریص پائیں گے)۔ ویسے بھی عربوں کے ہاں گنتی کے لئے ہزار سے اوپر کوئی مستقل لفظ نہیں ہے جیسے ہمارے ہاں لاکھ وغیرہ ہے۔

سوال: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ "تَنَزَّلُ" کیا صیغہ ہے؟ اور "اَلْمَلٰٓئِكَةُ" کی واحد ذکر کریں۔

جواب: تَنَزَّلُ: باب تفعل "تَنَزَّلَ يَتَنَزَّلُ تَنَزُّلًا" سے واحد مؤنث غائب، مضارع معلوم ہے۔ اصل میں "تتنزل" تھا۔ ایک تاء تخفیفاً حذف کردی گئی۔ مادہ: ن، ز، ل۔

اَلْمَلٰٓئِكَةُ: "مَلَكٌ" کی جمع ہے۔

سوال: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ "الروح" سے کون مراد ہے؟

جواب: یہاں روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہی ہیں اور بعض مقامات پر روح سے مراد انسانی روح ہے۔

سوال: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ﴾ "مِنْ كُلِّ اَمْرٍ" کس کے متعلق ہے؟ اور معنی واضح کریں۔

جواب: "مِنْ كُلِّ اَمْرٍ" "تنزل الملائكة" کے متعلق ہے۔ اور اس کے معنی "ہر قسم کے امور" ہیں جو اس کے متعلقہ فرشتوں کو سونپے جاتے ہیں۔

سوال: ﴿سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ "سَلٰمٌ" مرفوع کیوں ہے؟ اور "هِيَ" کا مرجع بھی بتائیں۔

جواب: "هِيَ" مبتدا مؤخر ہے اور "سلٰم" خبر مقدم ہے۔ (اعراب)

صاحب تدبر کے ہاں دوسری ترکیب راجح ہے۔ وہ فرماتے ہیں "سلٰم" میرے نزدیک مبتدا محذوف کی خبر ہے پورا جملہ

"ھی سلم" ہے۔ پوری توجہ خبر پر مرکوز کردینے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ (تدبر)

"ھی" کا مرجع "لیلۃ القدر" ہے۔ یعنی وہ رات فجر طلوع ہونے تک برابر سلامتی والی ہے۔

سوال: ﴿سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ "سلم" کا مفہوم واضح کریں۔

لفظ "سلم" میں یوں تو ہر قسم کے آفات سے محفوظ ہونے کی ضمانت ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ سلامتی شیاطین سے سلامتی ہے کہ شیاطین اس رات کی تقسیم امور میں مداخلت نہ کر سکیں۔ ان کی تمام راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے یہ شیاطین آسمانی کرفیو میں ہوتے ہیں۔ یہ کرفیو طلوع فجر تک نافذ ہوتا ہے اور شیاطین اس رات کے اہم اسرار معلوم کر سکتے اور نہ ہی شب مبارک کی برکتوں میں کوئی خلل پیدا کر سکتے ہیں۔

سوال: ﴿سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ "مَطْلَع" کیا صیغہ ہے؟ اور "حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ" کس کے متعلق ہے؟

جواب: مَطْلَع: "طَلَعَ يَطْلُعُ طُلُوْعًا" (ن) سے مصدر میمی ہے۔ اہل حجاز کے ہاں اگر مَطْلَعْ ہو تو مصدر میمی ہوگا اور اگر مَطْلِعْ ہو تو ظرف ہوگا جیسا کہ فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ﴾ (الکہف: ۹۰)، جبکہ بنوتمیم کے ہاں دونوں صورتوں میں مصدر میمی ہی ہے۔ مادہ ط، ل، ع۔ (البحر المحیط)

حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ: "سلم" کے متعلق بھی ہو سکتا ہے یا "ھی" مبتدا کی محذوف خبر کے متعلق بھی "ھی کائنة حتی مطلع الفجر"۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ
الْبَيِّنَةُ ۝١ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝٢ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣ وَمَا تَفَرَّقَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝٤ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا
اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ
الْقَيِّمَةِ ۝٥ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ
خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝٨

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: سورۃ القدر میں قرآن پاک کے نزول کا بیان ہے اور اس سورت میں قرآن کے نزول کی ایک علت بیان ہوئی ہے۔ یعنی یہ اہل کتاب اور مشرکین اس وقت تک بری حرکات سے رکنے والے نہ تھے جب تک کوئی رسول ان کو وہ قرآن نہ سنائے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا۔ واللہ اعلم۔ (روح)

سوال: اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے وضاحت کریں۔

جواب: سورۃ البینۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے شدید اختلاف ہے۔ مفسرین کے دونوں طرح کے اقوال موجود ہیں البتہ مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ جب آپ ﷺ پر یہ سورت نازل ہوئی تو جبریل علیہ السلام نے آپکو فرمایا کہ آپکا رب آپکو حکم دیتا ہے کہ یہ سورت آپ ﷺ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کو پڑھائیں .... الخ۔ (مسند احمد: ۱۶۰۰۰، صحیح لغیرہ) اور حضرت اُبی رضی اللہ عنہ اہل مدینہ میں سے ہیں۔ نیز اس سورت میں اہل کتاب کی بعض غلط فہمیوں کا بھی تذکرہ ہے، اور اہل کتاب سے واسطہ مدینہ منورہ میں پڑا تھا۔ لہذا یہ بھی ایک قرینہ ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔ (التحریر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون بیان کریں۔

جواب: سب سے پہلے اس ضرورت کا بیان ہے جسکی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ اس کے بعد مشرکین کی ایک مذموم روش کا بیان ہے جس پر وہ پہلے سے عمل پیرا تھے اور مستقبل میں بھی اسی کی امید ہے۔ اس کے بعد صحیح اور کامل دین کی تعلیمات بتائی ہیں کہ ہمیشہ سے دین کی بنیادی تعلیمات یہی رہی ہیں۔ پھر کفار، اہل کتاب اور مشرکین کی سزا اور اہل ایمان کی اچھی جزا کا بیان ہے۔ (تفہیم، التحریر، المنیر)

سوال: ﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ﴾ میں "لَمْ یَکُنْ" فعل ناقص کے طور پر استعمال ہوا ہے یا فعل تام کے طور پر؟ نیز قرآن کے بعض مقامات پر "لَمْ یَکُنْ" آیا ہے اور بعض جگہ نون کے حذف کے ساتھ "لَمْ یَكُ" (مریم: ٦٧) آیا ہے۔ وضاحت کریں۔

جواب: آیت مبارکہ میں "لَمْ یَکُنْ" فعل ناقص کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ "الذین کفروا" اس کا اسم اور "منفکین" اسکی خبر ہے۔

اگر اس مجزوم فعل کے بعد ساکن یا ضمیر منصوب ہو تو اس وقت "لَمْ یَکُنْ" استعمال ہوتا ہے، بصورت دیگر "لَمْ یَكُ" ہی استعمال ہوتا ہے۔

سوال: ﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ﴾ میں "مِن" کس معنی میں ہے؟

جواب: اس آیت مبارکہ میں "مِن" بیانیہ ہے۔ اگرچہ بعض نے اسے تبعیضیہ قرار دیا ہے۔ گویا معنی یوں ہوگا: "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو کافر ہیں وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں یہاں تک کہ ان کے پاس واضح دلیل آجائے"۔

سوال: ﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ﴾ اہل کتاب کا شرک قرآن وسنت سے ثابت ہے لیکن قرآن میں ان کے لئے مشرک کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ مشرکین سے الگ ذکر کیا گیا اسکی وجہ ذکر کریں۔

جواب: قرآن مجید میں اہل کتاب کے شرک کا ذکر کئی مقامات پر ہے مثلاً نصاریٰ کا قول: ﴿لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ﴾ (ترجمہ: بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا: بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے) (المائدۃ: ١٧) اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (ترجمہ: بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے) (المائدۃ: ٧٣) اسی طرح یہود کا قول ﴿عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (ترجمہ: عزیر اللہ کے بیٹے ہیں) (التوبۃ: ٣٠)۔ ان سب کے باوجود قرآن پاک میں ان کیلئے "مشرك" کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ ان کا ذکر "یہود ونصاریٰ"، "أهل کتاب" یا "الذین أوتوا الکتاب" کے الفاظ سے کیا گیا

ہے کیونکہ ان کا اصل دین توحید ہی تھا جبکہ مشرکین اصل دین توحید کو نہ مانتے تھے اسی فرق کی بنا پر اہل کتاب کا ذبیحہ اور انکی عورتوں سے نکاح حلال اور مشرکین سے حرام ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفہیم)

سوال: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ﴾ میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں کے لئے لفظ ''کفر'' استعمال کیا گیا ہے کیا دونوں کے کفر کی نوعیت بھی ایک ہی تھی؟

جواب: دونوں کے کفر کی نوعیت ایک نہ تھی بلکہ اس مقام پر کفر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے جن میں دراصل کافرانہ رویے کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ مثلاً بعض اس معنی میں کافر تھے کہ سرے سے اللہ کی ذات کے منکر تھے، بعض اللہ کو تسلیم کرتے تھے لیکن اسے معبود واحد نہ سمجھتے تھے بلکہ اللہ کی ذات، اسکی صفات یا اس کے افعال واختیارات میں کسی اور کو شریک ٹھہرا کر اسکی بھی عبادت کرتے تھے، بعض اللہ کی وحدانیت تو تسلیم کرتے تھے لیکن اس کے باوجود کسی نوعیت کے شرک کے مرتکب تھے بعض اللہ کو مانتے تھے لیکن اس کے انبیاء کے منکر تھے، بعض لوگ کچھ انبیاء کو مانتے تھے اور کچھ کے منکر تھے اور بعض لوگ آخرت کی جزاء وسزا کے منکر تھے۔ الغرض مختلف اقسام کے کفر میں مشرکین اور اہل کتاب مبتلا تھے جنکی نوعیت الگ الگ تھی۔ (تفہیم)

سوال: ''منفکین'' صیغہ اور معنی بتائیں۔

جواب: ''منفکین'' باب انفعال ''اِنْفَكَّ يَنْفَكُّ اِنْفِكَاكًا'' سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ ''اِنْفَكَّ الشيء'' کا معنی ہے: جدا ہونا، الگ ہونا۔ ''منفکین'' کا مفہومی معنی باز آنا، رکنا ہے۔ مادہ: ف، ک، ک۔

سوال: ﴿حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ ''اَلْبَيِّنَةُ'' صیغہ، صرفی تحلیل اور لغوی معنی ذکر کریں۔

جواب: اَلْبَيِّنَةُ: ''بَانَ يَبِيْنُ بَيْنًا'' (ض) سے ''بَيِّنٌ'' صفت مشبہ کی مؤنث ہے۔ اسکا معنی شہادت، حجت اور واضح دلیل ہے۔ اصل میں ''بَيْيِنَةٌ'' تھا دو حروف ایک جنس کے جمع ہوئے اور پہلا ساکن ہے تو ان کو مدغم کر دیا اس طرح ''بَيِّنَة'' ہو گیا۔ مادہ: ب، ی، ن۔

سوال: ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ مرفوع کیوں ہے؟

جواب: ''رَسُوْلٌ'' لفظ ''البيّنة'' سے بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

سوال: ﴿حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ○ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ لفظ ''اَلْبَيِّنَةُ'' معرّف باللام ہے جبکہ لفظ ''رسول'' نکرہ ہے۔ کیا ایسی صورت میں ''رسول'' کو ''البيّنة'' سے بدل بنانا جائز ہے؟

جواب: بدل اور مبدل منہ میں معرفہ اور نکرہ ہونے میں مطابقت ضروری نہیں۔ اس لئے ''رسول'' کو ''البیّنة'' سے بدل بنانا جائز ہے۔ (ویسے بھی رَسُوْلٌ موصوف واقع ہو رہا ہے اس لئے اس کو بدل بنانا جائز ہے۔) (معجم النحو)

سوال: ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾ ''صُحُفًا'' کی واحد بتائیں نیز ''مطهّرة'' کیا صیغہ ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''صحفًا'' کی واحد ''صَحِيفَةٌ'' ہے۔ ''مُطَهَّرَةٌ'' باب تفعیل ''طَهَّرَ يُطَهِّرُ تَطْهِيْرًا'' سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ مادہ: ط، ھ، ر۔ ''صحفًا مُطَهَّرَة'' سے مراد ایسے پاکیزہ صحیفے ہیں جن میں باطل کی آمیزش کا خطرہ نہ ہو۔

سوال: پہلی دو آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کافر لوگ اس وقت تک کفر سے باز آنے والے نہ تھے جب تک ان میں کوئی رسول نہ مبعوث ہو جائے، حالانکہ رسول آنے کے بعد بھی کتنے ہی لوگ کفر پر قائم رہے ایسی صورت میں پہلی دو آیات کا کیا مفہوم ہوگا؟

جواب: پہلی آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد سب اہل کتاب اور مشرکین اپنے کفر سے باز آجائیں گے بلکہ یہاں تو اس بات کی طرف رہنمائی کرنا مقصود ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کسی نبی کی رہنمائی کے بغیر اپنی ضلالت اور گمراہی سے نہیں نکل سکتے، کسی نبی کے ذریعے ہی انکا کفر سے رکنا ممکن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پیغمبر کی تعلیمات ملاحظہ کرنے کے بعد بھی اپنے کفر پر قائم رہیں، رسول دراصل ایک اعلان اور دلیل ہوتا ہے کہ اب جو ایمان نہیں لائے گا وہ عذاب سے دوچار ہوگا، پیغمبر کو مبعوث فرما کر کفار پر حجت قائم کرنا مقصود ہے۔ ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ (ترجمہ: ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب اور کمال حکمت والا ہے) (النساء: ۱۶۵) اسی طرح ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (ترجمہ: اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ ہم کوئی پیغمبر بھیج دیں) (الاسراء: ۱۵) اور ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (ترجمہ: اے اہل کتاب! بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آیا جو تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے والا اور نہ ہی ڈرانے والا آیا، تحقیق تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آچکا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے) (المائدہ: ۱۹)

سوال: ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ ''قَيِّمَةٌ'' کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں ''كُتُبٌ قَيِّمَة'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: "قام الأمر" سے مراد ہے اعتدال پر آنا، متوازن ہونا اور درست ہونا۔ "قَيِّمَةٌ" سے مراد ہے مضبوط، معتدل اور سیدھی۔ "كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" سے مراد ہوگا مضبوط، قطعی اور درست احکام، چونکہ "کتاب" بمعنی "احکام" بھی مستعمل ہے اسلئے اسکا ترجمہ "بالکل واضح اور سیدھے سیدھے لکھے ہوئے احکام" ہے۔

سوال: ﴿فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" "صُحُفًا" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ﴾ کا سابقہ آیات سے کیا تعلق ہے؟

جواب: سابقہ آیات کے سیاق میں ایک پیشین گوئی بھی ہے کہ اب بھی یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ پیغمبر کی بعثت کے بعد یہ راہ حق اختیار کر لیں گے بلکہ سابقہ روایات کے پیش نظر اب بھی انکی واضح ہدایت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

سوال: ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ اس آیت مبارکہ میں استثناء لانے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: اس آیت مبارکہ میں استثناء کا مقصد اہل کتاب کی بری عادات کا تذکرہ اور ان پر تشنیع ہے۔ ان لوگوں کا ماضی میں بھی یہ رویہ تھا کہ واضح دلائل و براہین آنے کے بعد ان میں تحریف و تعلیل کے مرتکب ہوئے اور پیغمبرانہ تعلیمات سے انحراف کرتے ہوئے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

سوال: کیا ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ کا اطلاق امت محمدیہ پر بھی ہوتا ہے؟

جواب: اس آیت کا اطلاق تو اہل کتاب پر ہوتا ہے لیکن آج امت محمدیہ کا رویہ بھی ایسا ہی ہے یہ بھی واضح دلائل آنے کے بعد تفرقہ بازی کا شکار ہوئے ہیں۔

سوال: قرآن پاک میں اہل کتاب کے لئے بعض جگہ ﴿آتيناهم الكتب﴾ اور بعض جگہ ﴿أوتوا الكتب﴾ کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کو مختلف لانے کی حکمت ذکر کریں۔

جواب: اہل کتاب کے لئے قرآن پاک میں "آتيناهم الكتب" کا صیغہ عموماً اس جگہ استعمال کیا گیا ہے جہاں انکی مدح کا محل ہوتا ہے اور "أوتوا الكتب" کا صیغہ وہاں استعمال کیا گیا ہے جہاں انکی مذمت مقصود ہوتی ہے۔ ویسے بھی باذوق اہل نظر جانتے ہیں کہ معروف کے مقابلے میں مجہول کا صیغہ کسی بھی شخص یا جماعت کی بے وقعتی ظاہر کرنے کے لیے عام مستعمل ہے۔ دونوں صیغوں کی امثلہ ملاحظہ کرنے کے لئے "المعجم المفهرس لألفاظ القرآن" کی طرف رجوع

فرمائیں۔(تدبر:البقرہ:۱۲۱)

سوال: ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ میں استثناء کی کونسی قسم ہے؟

جواب: اس آیت مبارکہ میں استثنا مفرغ حصر کے لئے ہے یعنی وما أمروا لشيء من الأشياء إلا ليعبدوا الله۔ ترجمہ: ''انکو فقط اللہ کی عبادت کی خاطر یہ حکم دیا گیا تھا''۔(روح،اعراب)

سوال: ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ ''مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ'' کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: اسکا مطلب تمام آلائشوں، کفروشرک اور بدعات سے پاک ہوکراور یکسو ہوکر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔

سوال: ﴿حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''حنفآء'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''حنفآء'' ''حَنِيْف'' کی جمع ہے۔''حَنِيْف'' باب ''حَنَفَ يَحْنِفُ حَنْفًا'' (ض) سے صفت مشبہ ہے۔ ''حنف عن شيء'' یعنی ایک طرف کو ہٹا ہوا۔''حنیف'' کا معنیٰ ''غلط راہ سے ہٹ کر سیدھی راہ پر آنے والا، ہر مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل ہونے والا، یکسو'' وغیرہ ہے۔

سوال: ﴿وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ میں ''ذٰلك'' کا مرجع بتائیں نیز اس جملے کی ترکیب کریں۔

جواب: ''ذٰلِكَ'' کا مرجع آیت میں مذکور ''لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ...... '' ہے۔یعنی ''اخلاص اور یکسوئی سے اللہ کی عبادت، اقامت نماز اور زکوۃ کی ادائیگی'' ہی دین قیم ہے۔

﴿وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ میں ''ذٰلك'' مبتدا، ''دین'' مضاف، ''القیمة'' سے پہلے ''الملة'' یا ''الأمة'' محذوف ہوگا ''الملة القيمة'' موصوف صفت مل کر ''دین'' کے مضاف الیہ ہونگے، مضاف اور مضاف الیہ مل کر مبتدا کی خبر ہوں گے۔

سوال: ﴿وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ القيمة کی لغوی وضاحت کریں نیز بتائیں کہ دین القیمۃ کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟

جواب: القيمة: ''قَامَ يَقُوْمُ قَوْمًا وَقِيَامًا وَقَوْمَةً'' (ن) سے وصف کا صیغہ ہے یا تو یہ ''قیم'' کی مؤنث ہے یا پھر اس کے آخر میں تاء مبالغہ کے لیے ہے جیسے ''علامة'' میں ہے۔اس کا معنیٰ ''المستقيمة'' اور ''شديد الاستقامة'' ہے یعنی بہت سیدھا اور کج روی سے پاک دین۔مادہ: ق، و، م۔

دین القیمۃ کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو اس آیت کی ابتدا میں مذکور ہیں، یعنی صرف اللہ ہی کی عبادت کی جائے، اخلاص کے ساتھ کی جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوۃ ادا کی جائے۔(تفہیم،تدبر)

سوال: ﴿أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ ''البرية'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: البریة: ''بَرَأَ یَبْرَءُ بَرْءًا'' (ف) سے ہے جسکا معنی ہے پیدا کرنا، اور ''البریة'' اصل میں ''بریئة'' تھا۔ ہمزہ کو یا سے بدل کر ادغام کیا تو ''بریة'' ہوا جیسا کہ ''نبیٌّ'' ہے (لیکن شَیِّیٌ اس قاعدہ سے مستثنی ہے)۔ ''بریة'' کا معنی مخلوق ہے اور یہ بشر کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔ (التحریر، القاموس)

سوال: ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ اہل کتاب اور مشرکین کو بدترین مخلوق کیوں کہا گیا حالانکہ نمرود، فرعون یا کئی اور بڑے بڑے سرداران سے بھی بڑے مشرک اور سرکش تھے اسکی وضاحت کریں۔

جواب: اگر چہ یہ بات سچ ہے کہ نمرود، فرعون اور کئی دوسرے جبابرہ اہل کتاب اور مشرکین مکہ سے بھی زیادہ سرکش تھے لیکن ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ میں انکے ساتھ مقابلہ مقصود نہیں، یہاں تو صرف اہل کتاب اور مشرکین کے شر اور برائی میں مبالغہ کے لیے انکو ''شَرُّ الْبَرِيَّةِ'' کہا گیا ہے جیسا کہ اگلی آیات میں ایمان اور عمل صلح کے حاملین کو ''خیر البریة'' کہا گیا حالانکہ انبیاء کرام ان سے افضل ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں بھی صرف مبالغہ اور انکی تعریف مقصود ہے۔ کیونکہ اسم تفضیل میں بسا اوقات تفضیل والا معنی نہیں ہوتا بلکہ مطلق وصف کے طور پر اس کو ذکر کر دیا جاتا ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان کو دور نبوت کے اعتبار سے ''شَرُّ الْبَرِيَّةِ'' کہا گیا ہے، کہ وہ اس دور کے سب سے بدترین لوگ تھے۔ واللہ اعلم (روح، فتح القدیر)

سوال: ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ میں ''هم'' ضمیر کا اصطلاحی نام کیا ہے؟ نیز بتائیں اسے مبتدا اور خبر کے درمیان کیوں لایا جاتا ہے؟

جواب: ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ میں ''هم'' ضمیر فصل ہے یہ کلام میں دو وجوہ سے لائی جاتی ہے:

(۱) لفظی فائدہ کے لیے (۲) معنوی فائدہ کے لئے۔

لفظی فائدہ: اس کے لانے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مبتدا کے بعد خبر ہے، صفت نہیں۔ مثلاً: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ میں اگر ضمیر فصل نہ ہوتی تو شبہ رہتا کہ ''المفلحون'' ''أولئك'' کی صفت ہے۔

معنوی طور پر اس کے دو فوائد ہیں:

(۱) مبتدا کی تاکید کیلئے۔

(۲) یہ بتانے کے لیے کہ خبر صرف مبتدا کے ساتھ خاص ہے کسی اور کیساتھ نہیں۔ مثلاً ﴿كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ (ترجمہ: تو ہی ان پر نگران تھا) (المائدۃ: ۱۱۷)۔ (معجم النحو والصرف: ضمیر الفعل)

سوال: ضمیر فصل کا محل اعراب کیا ہوتا ہے؟

جواب: بصریوں کے ہاں تو اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا۔لیکن اکثر نحاۃ کے ہاں اسکے اعراب کی مختلف صورتیں ہیں:
مثلاً (۱) فقط ضمیر فصل ہے جسکا کوئی محل اعراب نہیں۔

(۲) توکید کیلئے مثلاً ﴿كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ﴾(ترجمہ: تو ہی ان پر نگران تھا)(المائدۃ: ۱۱۷)﴿اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ﴾(ترجمہ: اگر ہم ہی غالب ہوئے)(الاعراف: ۱۱۳)

(۳) ضمیر فصل مبتدا کیلئے مثلاً ﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ﴾(ترجمہ: اور بلاشبہ یقیناً ہم صف باندھنے والے ہیں)(الصافات: ۱۶۵)
یہاں "نحن" ضمیر مبتدا اور مابعد خبر ہے۔اسکو یہاں توکید کیلئے نہیں مان سکتے کیونکہ اس پر لام توکید پہلے ہی داخل ہے۔

(۴) ضمیر فصل میں فصل، توکید اور مبتدا تینوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔مثلاً ﴿اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾(ترجمہ: بے شک تو ہی چھپی باتوں کو خوب جاننے والا ہے)(المائدۃ: ۱۰۹)(معجم النحو: ۳۰۸)

سوال: اہل کتاب اور مشرکین کے کفر اور نافرمانیوں میں بہت فرق ہے لیکن دونوں کی سزا ﴿فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ایک ہی کیوں بیان کی گئی ہے؟

جواب: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ اس آیت کے مطابق اہل کتاب اور مشرکین کا ٹھکانہ تو یکساں معلوم ہوتا ہے لیکن انکی سزا کے یکساں ہونے پر دلالت نہیں ہوتی۔ چونکہ جہنم کے کئی درکات (دوزخ کی منزلیں) ہیں اور ہر منزل کا عذاب بھی مختلف ہے اسی طرح مختلف قسم کے لوگوں کے لیے جہنم کا عذاب بھی مختلف اور الگ ہوگا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا﴾(ترجمہ: بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا)(النساء: ۱۴۵) اسی طرح نبی ﷺ نے مختلف گناہوں کے مرتکبین کیلئے مختلف عذاب کی وعید سنائی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اہل کتاب اور مشرکین ٹھکانے کے اعتبار سے یکساں ہیں لیکن عذاب کے اعتبار سے یکساں ہونا لازم نہیں آتا۔(روح)

سوال: مندرجہ ذیل کی وجہ اعراب بتائیں۔

الكتب، مُخلصين، الدين، حنفآء، خٰلدين، الصّٰلحٰت، أبدا۔

جواب: الكتب: "أوتوا" فعل کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔
مخلصين: "ليعبدوا" میں فاعل کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔
الدين: چونکہ اسم فاعل فعل والا عمل کرتا ہے اس لئے "الدين" "مخلصين" کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

حنفآء: "لیعبدوا" کی فاعل کی ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

خلدین: صاحب انوار البیان نے اسکو 'جزاء هم' کی 'هم' ضمیر سے حال بنایا ہے جبکہ صاحب اعراب القرآن کے نزدیک یہ ایک محذوف فعل (دخلوا) کی ضمیر سے حال بنے گا۔ اس کو 'جزاء هم' کی 'هم' ضمیر سے حال بنانا درست نہیں۔ کیونکہ اس سے مصدر اور اس کے معمول میں اجنبی کے ساتھ فاصلہ لازم آئے گا۔ (اعراب)

الصلحت: "عملوا" کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ جمع مؤنث سالم کی نصبی حالت کسرہ کیساتھ آتی ہے۔

أبدًا: "خلدین" سے ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: مندرجہ ذیل کا محل اعراب بتائیں۔

أُوتوا الکتب، ماجاء تهم البينة، من أهل الکتب، فی نار جهنم، أُولئك هم خير البرية، تجری من تحتها الأنهر، رضی الله عنهم، خشی ربه۔

جواب: أوتوا الکتب: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اسم موصول 'الذین' کا صلہ ہے۔

ما جآء تهم البينة: یہ محل جر میں ہے کیونکہ لفظ "بعد" کا مضاف الیہ ہے۔

من أهل الکتب: ایک محذوف "کائنین" کے متعلق ہو کر "کفروا" کی "هم" ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

فی نار جهنم: یہ ایک محذوف "یدخلون" یا "کائنون" کے متعلق ہو کر ان کی خبر ہے۔ اس لئے محل رفع میں ہے۔

أولئك هم خير البرية: "إن" کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

تجری من تحتها الأنهر: "جنت عدنٍ" سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

رضی الله عنهم: اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ جملہ استئنافیہ دعائیہ ہے۔

خشی ربه: اسم موصول "من" کا صلہ ہے اسلئے اسکا کوئی محل اعراب نہیں۔

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں۔

رسول، یتلو، أوتوا، یقیموا، قیمة، شر، البرية، رضی، رضوا۔

جواب: رسولٌ: "أَرْسَلَ يُرْسِلُ إِرْسَالًا" سے صیغہ صفت بمعنی اسم مفعول مُرْسَلٌ ہے۔ مادہ: ر، س، ل۔ معنی: پیامبر۔

یتلوا: "تَلَا يَتْلُوا تُلُوًّا وَتِلَاوَةً" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ت، ل، و۔ ناقص واوی۔ معنی:

نقش پا کی پیروی کرنا، تلاوت کرنا۔

أوتوا: باب افعال ''اٰتٰی یُؤْتِیْ اِیْتَاءً'' سے جمع مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔ مادہ: اُ،ت،ی۔ مہموز الفا اور ناقص یائی ہے۔ معنی: وہ دیئے گئے۔

یقیموا: باب افعال ''أَقَامَ یُقِیْمُ إِقَامَةً'' سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ق،و،م۔ معنی: وہ قائم کرتے ہیں۔

قیمة: ''قَامَ یَقُوْمُ قَوْمًا وَقِیَامًا'' (ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے اصل میں ''قیومة'' تھا۔ ''واؤ'' اور ''ی'' ایک کلمہ میں جمع ہوئے ان میں سے پہلا ساکن ہے تو واؤ کو یا سے بدلا اور پھر یا کا یا میں ادغام کر دیا۔ مادہ: ق،و،م۔ معنی: مضبوط ملت۔

البریة: ''بَرَأَ یَبْرَءُ بَرْءًا'' (ف) سے اسم بمعنی مفعول ہے، اسکو ''بریئة'' اور ''بریة'' دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مادہ: ب،ر،ء۔ معنی: مخلوق۔

رضی: ''رَضِیَ یَرْضٰی رِضًا'' (ع) سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ اصل میں ''رَضِوَ'' تھا۔ جب لفظ کے لام کلمہ میں واؤ ماقبل مکسور ہو تو واؤ کو یا سے بدل دیتے ہیں۔ مادہ: ر،ض،و۔ معنی: وہ راضی ہوا۔

رضوا: ''رَضِیَ یَرْضٰی'' (ع) سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ر،ض،و۔ اصل میں ''رَضِوُوْا'' تھا۔ جب واؤ بعد کسرہ ہو اور اسکے بعد بھی واؤ ہو تو واؤ کی حرکت ماقبل کو دے کر واؤ کو گرا دیتے ہیں۔ معنی: وہ راضی ہو گئے۔

سوال: ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ کا مفہوم تو سمجھ آتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسکی تسلی دے دی۔ لیکن ﴿وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کا کیا مطلب حالانکہ اللہ تعالیٰ تو بندوں کی رضا کا محتاج نہیں؟

جواب: اس آیت مبارکہ میں یہ بتلانا مقصود نہیں کہ کس کو کس کی رضا کی طلب یا محتاجگی ہے بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی اچھی بندگی کی وجہ سے ان سے راضی ہو جائیں گے اور بندے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور مزید اس وجہ سے اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انکے گمان سے بڑھ کر عطا کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا بھی انکو حاصل ہوگئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ: ﴿وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ اور اسکے کلمہ حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آیا، انہوں نے اسے جھیلا ہی نہیں، بلکہ کمال محبت ایمانی کی وجہ سے اس میں خوش حال وخوشنود ہیں اور یہی وہ مقام ہے جو ان کے درجہ کو تمام مدارج ایمان وعمل میں ممتاز کر دیتا ہے۔ (ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد: سورۃ التوبۃ، آیت نمبر: ۱۰۰)

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ② وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا
لَهَا ③ يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ⑤ يَوْمَىِٕذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ
اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سورۃ البینۃ میں جزا وسزا کا ذکر کیا تو اس سورت میں جزا وسزا کا وقت یعنی قیامت اور اس دن کے احوال و واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ (روح، المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع روز قیامت کے احوال وواقعات ہیں۔

ابتدائی آیات میں قیامت کے وقوع کا منظر اور انسان کی بدحالی کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد آج کی بظاہر بے جان زمین کا اپنے حالات وواقعات بیان کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ لوگ گروہوں اور ٹولیوں کی شکل میں میدان محشر کی طرف جائیں گے۔ اور آخر میں اعمال کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ اعمال اس قدر باریک بینی سے پیش کئے جائیں گے کہ اگر کسی نے ذرہ بھر نیکی یا گناہ کیا ہوگا تو وہ بھی اس کی جزا وسزا دیکھ لے گا۔ (تفہیم، المنیر)

سوال: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ میں "إذا" ظرفیہ کس کے متعلق ہے؟

جواب: "إذا" ظرفیہ شرط کے معنی ادا کرتا ہے۔ جب یہ ہوگا تب وہ ہوگا۔ اس لئے "إذا" کو "تُحَدِّثُ" یا "یَصْدُرُ النَّاسُ" کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ (اعراب)

ایک اور ترکیب جس کی طرف صاحب تدبر نے اشارہ کیا ہے کہ جب "إذا" شروع کلام میں آتا ہے تب اس سے یاددہانی اور تذکیر مقصود ہوتی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: "اذکروا إذا زلزلت الأرض زلزالها"۔

سوال: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ﴾ میں "زلزلت" کیا صیغہ ہے؟ اور مؤنث کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: زلزلت: باب فِعلال "زَلْزَلَ يُزَلْزِلُ" سے واحد مؤنث غائب ماضی مجہول ہے۔ "زلزال" "فعلال" کے وزن پر رباعی مجرد کا وزن ہے۔

چونکہ فاعل "الأرض" مؤنث سماعی ہے اس لیے صیغہ مؤنث استعمال کیا گیا ہے۔ اور اسی لئے بعد میں "ھا" ضمیر مؤنث استعمال کی گئی ہے۔

سوال: ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ کہا "زلزالا" کیوں نہیں کہا؟

جواب: عام طور پر جب فعل کی تاکید مقصود ہوتی ہے تب اس کے ساتھ اس کا مفعول مطلق ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے "أکرمت زید کرامة" میں نے زید کا خوب اکرام کیا۔ لیکن جب مفعول مطلق کے ساتھ ضمیر بھی ذکر کر دی جائے تب یہ مزید تاکید اور زور بیان پر دلالت کرتی ہے۔ مثلاً "أکرمت زیدا کرامته" میں نے زید کے اکرام کا حق ادا کر دیا اور ایسے ہی زمین کو اس طرح ہلایا جائے گا جس طرح اس کو ہلانے کا حق ہے اور جیسا کہ اس کا حجم، وزن، اور جسم تقاضا کرتا ہے۔ (کشاف، المحرر)

سوال: ﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ میں "أثقال" سے کیا مراد ہے؟

جواب: "ثقل" کے معنی بوجھ اور وزن کے ہیں۔ اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو زمین میں مدفون ہیں، چاہے وہ انسان ہوں یا خزانے یا کوئی اور چیز۔ "ثِقْل" قاف کے سکون کے ساتھ ہے۔ اگر "ثقَل" حرکت کے ساتھ ہو تب یہ "متاع" کے معنی میں ہے۔ ثِقْل جمعہ أثقال جیسے حِمْل جمعہ أحمال۔

سوال: ﴿وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا﴾ میں "مالھا" کی ترکیب کریں، محل اعراب بتائیں۔

جواب: "ما" اسم استفہام مبتدا، "کان" خبر محذوف، "لھا" "کان" کے متعلق۔ جملہ استفہامیہ "قال" کا مقولہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

سوال: ﴿وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا﴾ ترجمہ کریں اور مفہوم بیان کریں۔

جواب: ترجمہ: انسان کہے گا اسے کیا ہو گیا ہے؟ یا انسان کہے گا اسے کیا ہے؟

مفہوم: اس ہولناک صورتحال کا انسان پر جو اثر پڑے گا یہ اس کی تعبیر ہے، کہ وہ بدحواس ہو کر پکار اٹھے گا کہ ارے! یہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح تکنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور اپنے اندر کی ہر چیز باہر نکالے جا رہی ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ میں "یوم" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "یوم" ظرف زمان "إذا" سے بدل ہے۔ "إذا" "اذکروا" کی وجہ سے منصوب ہے۔ لہذا یہ بھی منصوب ہے۔ اسکو "تحدث" کا ظرف بھی بنایا جاسکتا ہے۔ (اعراب، روح)

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ کی وضاحت کریں۔

جواب: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا: "جانتے ہو کہ وہ حالات کیا ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا: "اللہ ورسولہ أعلم" فرمایا: "وہ حالات یہ ہیں کہ ہر بندے اور بندی کی نسبت اس کے عمل کی گواہی ہوگی۔ جو اس نے زمین پہ کیا ہوگا۔ وہ کہے گی اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہی وہ حالات ہیں جو زمین بیان کرے گی"۔ (ترمذی: ۲۴۲۹، ضعیف الاسناد)

زمین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے حالات کس طرح اور کیونکر بیان کرے گی؟ ممکن ہے کہ پہلے وقت کے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو۔ لیکن آج کے دور میں سائنس نے سب کچھ آسان کر دیا ہے۔ آواز کو محفوظ کرنا اور اس کو صدیوں بعد سننا۔ ویڈیو کے ذریعے ریکارڈ بنانا اور جدید سائنسی آلات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ آئندہ ترقی یافتہ دور میں سائنس دان ایسے آلات بنا ڈالیں گے کہ اس سے فضا سے آوازیں واپس لی جاسکیں گی۔ اس ماحول میں کئے گئے کام کو دوبارہ دیکھا جاسکے گا۔

یہ اللہ رب العزت نے انسان کی کٹ حجتی کے لیے سارا سامان کیا ہے کہ انسان جب انکار کرے گا اور اپنی جان بخشی پر اس قدر بوکھلا جائے گا کہ اللہ کے بنائے ہوئے ریکارڈ کو جھٹلائے گا کہ یہ میرا ریکارڈ نہیں ہے۔ پھر اللہ رب العزت زمین کی گواہی کو پیش کریں گے۔ پھر انسان دیکھے گا کہ یہ میں ہوں، فلاں جگہ، فلاں وقت، فلاں کے ساتھ یہ کارگزاری سر انجام دی۔ اپنی آواز کو ہوبہو سنے گا تو دم بخود ہو جائے گا اور اپنی جھوٹی دلیری پر کوئی معذرت پیش نہ کر سکے گا۔

سوال: ﴿بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ میں "أَوْحَىٰ" کس معنی میں ہے اور اس کا صلہ لام کیوں استعمال ہوا ہے؟

جواب: أَوْحَىٰ کے یہاں دو معانی کئے گئے ہیں: حکم دیا اور اشارہ کیا۔ دونوں معانی ہی درست ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔

قرآن کے اکثر مقامات پر أَوْحَىٰ کا صلہ إلى استعمال ہوا ہے صرف اس مقام پر اس کا صلہ لام استعمال ہوا ہے، بعض علماء کے ہاں یہ لام کے ساتھ بھی مستعمل ہے، جب کہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اصلاً یہ إلى کے ساتھ استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں فواصل کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمزہ کو حذف کر دیا۔ جس طرح آخر آیت سے کوئی حرف حذف کیا جاتا ہے، مثلاً ﴿وَالَّيْلِ إِذَا

يَسْرِ﴾ (الفجر:۴)

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ میں "یصدر" اور "أشتاتا" کی لغوی وضاحت کریں اور صیغہ بتلائیں۔

جواب: یصدر: "صَدَرَ يَصْدُرُ صَدْرًا وَصُدُورًا" (ن) سے واحد مذکر غائب، مضارع معروف ہے۔ مادہ: ص، د، ر۔ معنی: "کسی جگہ سے واپس ہونا، لوٹنا"۔

"أشتاتا" کی واحد "شتٌّ" ہے۔ بعض لوگ اس کو "شتیت" کی جمع گردانتے ہیں۔ لیکن اس کی جمع "شتّی" ہے۔ "شتّ" کا معنی ہے: متفرق ومنتشر، الگ الگ۔

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ میں "یومئذ" اور "أشتاتا" منصوب کیوں ہے؟

جواب: یومئذ: "یصدر" کا ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا پہلے "یومئذ" کی تاکید ہے۔

أشتاتا: "الناس" سے حال ہے۔

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ لوگوں کا گروہوں میں لوٹنے کا کیا مفہوم ہے؟

جواب: اس آیت کو باقی آیات کی روشنی سمجھا جائے تو یہ مفہوم آشکارا ہوتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے نکل کر میدان محشر کی طرف واپس لوٹیں گے اس وقت لوگ فوج درفوج گروہوں کی شکل میں ہوں گے۔ اور جب اللہ کے حضور پیشی ہوگی تب تن تنہا انسان کو پیش ہونا پڑے گا۔

سوال: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ﴾ "لِيُرَوْا" کیا صیغہ ہے؟ اس کی تعلیل کرتے ہوئے حروف اصلیہ کی وضاحت کریں۔

جواب: لِيُرَوْا: باب افعال "اَرٰى يُرِيْ اِرَاءَةً" سے جمع مذکر غائب مضارع مجہول ہے۔ مادہ: ر، ء، ی ہے۔ اور یہ حالت نصب میں ہے اور اس کا نون اعرابی لام تعلیل کے بعد "أن" کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ساقط ہو گیا۔ اصل میں "يُرْءَيُوْنَ" تھا لام تعلیل کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا، ی متحرک ماقبل مفتوح تو ی کو الف سے بدلا، دو ساکن (الف اور واؤ) جمع ہوئے پہلا گرا دیا، پھر ہمزہ سے ماقبل صحیح حرف ساکن ہے اسلئے ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دے کر الف سے بدلا پھر دو ساکن (الف اور واؤ) جمع ہوئے تو پہلا گر گیا اسطرح "يُرَوْ" ہو گیا۔ اس صیغہ میں حرف اصلی صرف "ر" ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ "مِثْقَال" کیا صیغہ ہے؟ اور منصوب کیوں ہے؟

جواب: مثقال: "ثَقَلَ يَثْقُلُ ثِقْلًا" (ن) سے مِفْعَالٌ کے وزن پر اسم آلہ ہے۔ یعنی ثقل (بوجھ، وزن) جاننے کا

آلہ۔ مادہ: ث،ق،ل۔ یہ "یَعْمَلْ" فعل کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ "ذرۃ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "ذرۃ" کسی بھی عنصر کے سب سے چھوٹے حصے، نا قابل تقسیم جز اور (روشن دان میں اڑنے والے) خاک کے ذرے کو کہا جاتا ہے۔ اسکی جمع "ذَرَّاتٌ" آتی ہے۔ مادہ ذ، ر، ر ہے۔ (قاموس)

اسی طرح "ذَرَّةٌ" چھوٹی چیونٹی کو بھی کہا جاتا ہے۔ اسکی جمع "ذَرٌّ" آتی ہے۔ شیخ عثیمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں چیونٹی ہی مراد ہے کیونکہ یہ قلت کو بیان کرنے میں ضرب المثل ہے اور یہاں اور کوئی ذرہ مراد لینا درست نہیں کیونکہ یہ اس وقت متعارف نہ تھا۔ حالانکہ صاحب لسان نے "ذرّۃ" کے دونوں معانی لکھے ہیں۔ (واللہ اعلم)

سوال: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ "خیرا" کا وجہ اعراب بتائیں؟

جواب: خیرا: "مثقال ذرۃ" سے تمیز یا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ "یرہ" کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: یرہ: "فمن یعمل" شرط کا جواب شرط ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔

سوال: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ کیا اعمال کا کوئی وجود اور وزن ہے کہ انسان روز قیامت ان کا مشاہدہ کرے گا؟

جواب: بعض علماء نے "یرہ" سے مراد اعمال کا دیکھنا نہیں بلکہ جزاء اعمال کا دیکھنا مراد لیا ہے۔ لیکن یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ ہر شخص نیک اور برے اعمال کو اپنے دفاتر میں دیکھ لے گا۔ ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (ترجمہ: اور انہوں نے جو بھی عمل کیے وہ اپنے سامنے حاضر پائیں گے، (الکہف: ۴۹) اللہ تعالیٰ اس چیز پر قادر ہے کہ وہ انسان کو اعمال دکھا دے چاہے وہ دفاتر میں دکھا دے یا اعمال کو وجود دے کر دکھائے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرۃ: ۱۴۷)۔

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾
فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ
لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ
بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۠﴿۱۱﴾

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت کا اختتام اعمال کی جزا پر ہوا تھا تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے بیان کے بعد انسان کی ناشکری، اسکا دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا اور آخرت کیلئے حساب کی تیاری نہ کرنے پر اسکو سرزنش کی ہے۔

اسی طرح سابقہ سورت میں ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ کہا اور اس سورت میں بیان کیا کہ ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ (المنیر، روح)

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع انسان کی ناشکری اور اسکی آخرت سے بے فکری کو بیان کرنا ہے۔

ابتدا میں گھوڑوں کی قسموں کو انسان کی ناشکری پر بطور شہادت پیش کیا ہے اور اس احسان فراموش انسان کی زر پرستی کو بیان کیا ہے۔ آخر میں اس کی تنبیہ کیلئے احوال آخرت کو بیان کیا ہے کہ اس وقت سینوں میں چھپی ہوئی باتیں بھی جانچ پرکھ کیلئے ظاہر کردی جائیں گے کیونکہ رب العالمین تو سبھی چیزوں کو بخوبی جانتا ہے۔ (المنیر)

سوال: ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ میں "عٰدِیٰت" اور "ضَبْحًا" صیغے بتائیں نیز انکی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: عٰدِیٰت: "عَدَا يَعْدُو عَدْوًا" (ن) سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے۔ "عَدَا" کا معنی ہے دوڑنا اور "عٰدِیٰت" سے دوڑنے والے گھوڑوں کی ٹولیاں مراد ہیں۔ مادہ: ع، د، و۔

ضَبْحا: "ضَبَحَ يَضْبَحُ ضَبْحًا" (ف) سے مصدر ہے۔ "ضَبَحَ الْخَيْلُ" سے مراد ہے "گھوڑوں کا دوڑتے وقت سانس

کے ساتھ آواز نکالنا''۔ ترجمہ یوں ہوگا ''ان گھوڑوں کی قسم جو پیٹ سے آواز نکالتے ہوئے دوڑتے والے ہیں''۔ مادہ: ض،ب،ح۔

سوال: ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ گھوڑوں کے لئے مؤنث لفظ ''عٰدِيٰت'' کیوں استعمال کیا گیا؟

جواب: چونکہ ''الْعٰدِيٰتِ'' سے مراد ''الخیل'' ہے اور ''الخیل'' مؤنث اور جمع دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اسلئے ''الْعٰدِيٰتِ'' کو جمع مؤنث لائے۔

سوال: ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا.....﴾ سے مراد گھوڑے کیوں ہیں؟ ان صفات سے گھوڑوں کے علاوہ کوئی دوسرا جانور بھی مراد لیا جا سکتا ہے؟

جواب: ''وَالْعٰدِيٰت'' سے مراد گھوڑے ''ضبحا'' کی قید کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ لغت میں ''ضبح'' کا لفظ گھوڑے، کتے اور لومڑ کیلئے ہی مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن اگلی آیات میں چار صفات سے گھوڑوں کی تخصیص ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد صرف گھوڑے ہی ہو سکتے ہیں لومڑ اور کتے نہیں۔ (التحریر، تدبر، تفہیم، کشاف، رازی، لسان)

سوال: ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ سے کن کے گھوڑے مراد ہیں غازیوں کے، ڈاکوؤں کے یا کوئی اور؟

جواب: ان سے کوئی خاص گھوڑے مراد لینا درست نہیں یہاں صرف تیز رفتار گھوڑوں کا بیان ہے اس سے مراد کوئی بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اصل مقصود تو انسان کی ناشکری کو بیان کرنا ہے کہ وہ گھوڑے جو انسان کی طرح عقل وشعور تو نہیں رکھتے لیکن پھر بھی وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری میں کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہیں کرتے۔ ہر حالت میں مالک کے تابع فرمان رہتے ہیں۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا﴾ ''الموریٰت'' اور ''قَدْحا'' کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے صیغے بھی بتائیں۔

جواب: الموریٰت: باب افعال ''أَوْرٰی يُوْرِي إِيْرَاءً وَإِرَاءَةً'' سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: و،ر،ی۔

''الموریٰت'' کا معنی چنگاریاں نکالنے والے گھوڑے۔

قدحا: ''آگ نکالنے کے لئے کسی چیز کو دوسری چیز سے رگڑنے، ضرب لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ گھوڑے اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کی سُموں کی ٹھوکر سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں۔ (تدبر، التحریر)

قدحا: ''قَدَحَ يَقْدَحُ'' (ف) سے مصدر ہے۔ مادہ: ق،د،ح۔

سوال: ﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا﴾ "مُغیرٰت" صیغہ بتائیں اور لغوی وضاحت کریں نیز بتائیں "مغیرٰت" کے ساتھ "صُبحا" کی قید کیوں ہے؟

جواب: مغیرات: باب افعال "أغارَ یُغِیْرُ إغارَۃً" سے جمع مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: غ، و، ر۔ "أغارَ علیهم" کا معنی ہے: "حملہ کرنا، دھاوا بولنا اور یورش کرنا"۔

"مغیرات" کے ساتھ "صُبحا" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ عربوں کے ہاں حملے کیلئے سب سے موزوں وقت صبح کا وقت تھا۔ حتی کہ "صَبَّحَ" کا لفظ حملہ اور غارت گری کیلئے معروف ہوگیا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: "کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَیْنَاہُ وَعَلَا صَوْتُہُ وَاشْتَدَّ غَضَبُہُ حَتّٰی کَأَنَّہُ مُنْذِرُ جَیْشٍ یَقُولُ صَبَّحَکُمْ وَمَسَّاکُمْ" (مسلم: ۲۰۴۲، بَابُ تَخْفِیفِ الصَّلَاۃِ وَالْخُطْبَۃِ) نبی ﷺ کی سیرت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے صبح کے وقت ہی جاتے تھے، اگر اذان کی آواز نہ آتی تو ان پر حملہ کرتے تھے۔

سوال: ﴿فَأَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا﴾ میں "أثرن" کا عطف کس فعل پر ہے؟

جواب: "أثرن" کا عطف اس فعل پر ہو رہا ہے جسکی جگہ اسم فاعل (العٰدیٰت) لایا گیا ہے۔ کیونکہ معنی اس طرح ہے: "والعٰدِیٰت أی واللاتی عَدَوْنَ فأورَیْنَ فأغَرْنَ فأثَرْنَ فوسَطْنَ"۔ (کشاف)

سوال: ﴿فَأَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا﴾ "أثَرْنَ" اور "نقعا" صیغے بتاتے ہوئے انکی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: أثَرْنَ: باب افعال "أَثَارَ یُثِیْرُ إِثَارَۃً" سے جمع مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ث، و، ر۔ معنی: ابھارنا، پھیلانا۔ نَقْعا: اوپر اٹھنے والا گرد وغبار۔ یہ "نَقَعَ یَنْقَعُ" (ف) سے مصدر ہے۔ (لسان، کشاف)

سوال: ﴿فَأَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا﴾ "أثَرْنَ" کا فاعل ذکر کرتے ہوئے "بہ" کا مرجع بتائیں۔

جواب: "أثَرْنَ" کا فاعل "العٰدیٰت، الموریت اور المغیرات" کی طرف لوٹنے والی "هُنَّ" ضمیر ہے۔

"بہ" میں اگر باءظرفیہ ہو تو "ہ" ضمیر کا مرجع "صُبْحًا" ہوگا۔ یا پھر "ہ" ضمیر سے مراد گھوڑوں کا دوڑنا، چنگاریاں نکالنا اور حملہ کرنا ہوگا۔ یعنی ان چیزوں کا معنی مرجع ہوگا، یعنی وہ گھوڑے اپنے ان افعال سے گرد وغبار اڑاتے ہیں۔

سوال: ﴿فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا﴾ "وَسَطْنَ" اور "جَمْعًا" صیغے بتائیں نیز انکی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: وَسَطْن: "وَسَطَ یَسِطُ وَسْطًا" (ض) سے جمع مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ "وسط الشيء" سے مراد ہے: کسی چیز کے درمیان میں ہونا۔ مادہ: و، س، ط۔

جَمۡعٌ: "جَمَعَ یَجۡمَعُ" (ف) سے اسم ہے۔ اسکا معنی جماعت اور گروہ وغیرہ ہے۔

ترجمہ: پھر وہ اس کے ساتھ لشکر میں گھس جاتے ہیں۔

سوال: ﴿فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا﴾ میں "بِهٖ" کا مرجع کیا ہے؟

جواب: "ہ" ضمیر کا مرجع "نَقۡعا" ہے۔ یعنی "فوسطن ملتبسات بنقع جمعا"۔ پھر وہ اس غبار میں لپٹے ہوئے لشکروں میں گھس جاتے ہیں۔ (کشاف)

سوال: مذکورہ بالا پانچ قسموں کا جواب قسم کیا ہے؟

جواب: ان کا جواب قسم جملہ ﴿إِنَّ الۡإِنسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ﴾ وما بعدہ ہے۔

سوال: مذکورہ بالا پانچ قسمیں کس چیز پر بطور استشہاد لائی گئی ہیں؟

جواب: مذکورہ بالا قسمیں اس بات پر بطور شاہد لائی گئی ہیں کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا اور ناسپاس ہے۔ اسکی دلیل مذکورہ بالا پانچ قسمیں ہیں۔ یعنی کہ گھوڑا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرح سے انسان کا غلام بنایا ہے اور یہ گھوڑا اپنی غلامی کا صحیح حق ادا کرتا ہے۔ کہ جس طرف مالک چاہے اور جب چاہے جاتا ہے اور ہر طرح کے خطرات میں جاتا ہے۔ زخمی بھی ہوتا ہے لیکن مالک کا فرمانبردار رہتا ہے۔ جبکہ انسان بھی ایک مالک کا غلام ہے لیکن یہ غلام اپنے آقا کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس کی طرف سے سب کچھ ملنے کے باوجود اسکی ناشکری ہی کرتا ہے۔ خود انسانی نفس اس بات پر گواہ ہے کہ وہ رب کا ناشکر گزار ہے اس کی نعمتوں کے مقابلے میں شکر ایسا ادا نہیں کرتا کہ کم از کم اسکی نعمتوں کی قدردانی کا داعیہ ہی پیدا ہو فقط انسان کو مال و دولت کی ہوس ہے کہ وہ بڑھ جائے حالانکہ حاصل ہونے والے مال و دولت میں اس کے آقا کا بھی حق ہے۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: "ضبحا، قدحا، صبحا، نقعا اور جمعا" منصوب کیوں ہیں؟

جواب: "ضَبۡحًا" یا تو "العٰدیٰت" کی "ھن" ضمیر سے حال ہے یا "عدوًا" محذوف مفعول مطلق کی صفت بن رہا ہے۔

"قَدۡحًا" یا تو "المورِیٰت" سے حال واقع ہو رہا ہے یا "تقدح" فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔

"ضَبۡحًا" اور "قَدۡحًا" کو ان سے قبل افعال سے مفعول مطلق من غیر لفظ بھی بنایا جا سکتا ہے۔

"صُبۡحًا" مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

"نَقۡعًا" اور "جَمۡعًا" مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ (التحریر، اعراب)

سوال: ﴿إِنَّ الۡإِنسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ﴾ میں "الۡإِنسَانَ" سے کون مراد ہے؟

جواب: "الْاِنْسَانَ" سے مراد عمومی انسانی رویہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے رب کی ناشکری ہی کرتا ہے۔ تمام انسان مراد نہیں۔ گویا یہ اکثر انسانوں کی فطرت اور سرشت کا بیان ہے۔

سوال: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ﴾ "لَكَنُوْدٌ" کی لغوی وضاحت کریں اور صیغہ بتائیں۔

جواب: "لَكَنُوْدٌ" پر لام مزحلقہ تاکید کیلئے ہے۔

"كَنَدَ الشيئ" کا معنی ہے کسی چیز کو کاٹنا، اور "كَنَدَ النعمة" سے مراد نعمت کی ناشکری کرنا ہے، لغت عرب میں "الکنود" مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے: ناشکرا، نافرمان، بخیل۔ (قاموس، التحریر، کشاف)

کنود: "كَنَدَ يَكْنُدُ كَنْدًا" (ن) سے فَعُوْلٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے اور یہ مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مادہ: ک، ن، د۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ کے مطابق بتائیں کہ انسان اپنی ناشکری پر کیسے گواہ ہے؟

جواب: حقیقت میں ہر انسان اپنی ذات کے بارے سب سے بڑھ کر جاننے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ناشکری پر کوئی خارجی دلیل قائم کرنے کی بجائے اسکی ذات کو ہی گواہ قرار دیا کہ وہ خود شاہد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مقابلے میں تقریباً ناشکر گزاری کا اقرار بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ﴾ (ترجمہ: اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے) (الانعام: ۱۳۰) (التحریر، تفہیم)

سوال: کیا ﴿وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ سے مراد اللہ رب العزت بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب: بعض سلف سے یہ بھی منقول ہے کہ "إنه" کی ضمیر کا مرجع لفظ "ربه" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کی ناسپاسی پر گواہ ہیں۔ لیکن سیاق کلام اس بات کو راجح قرار دیتا ہے کہ اس سے مراد انسان ہو کیونکہ سابق اور لاحق آیت میں بھی "إنه" کی ضمیر سے مراد انسان ہے۔ اور سارا کلام انسان کے بارے میں ہے۔ نیز اگر اس ضمیر کا مرجع لفظ رب ہو تو اس سے متصل آیت ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ میں "إنه" کی ضمیر کا مرجع بھی لفظ "رب" ہوگا کیونکہ اقرب یہی ہے۔ لیکن یہ معنی درست نہیں ہوگا۔ نظم اور حسن کلام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس سے مراد "الإنسان" ہو۔ واللہ اعلم (روح، تحریر)

سوال: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ میں "الْخَيْرِ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہاں "الْخَيْرِ" سے مراد "المال" ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا﴾ (ترجمہ: اگر اس نے کوئی مال چھوڑا ہو) (البقرۃ: ۱۸۰) أي مالاً۔ اور ﴿وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا﴾ (اور جب اسے مال ملتا ہے تو بہت روکنے والا

ہوتا ہے)(المعارج:۲۱)أی مسه المال۔(رازی،روح)

سوال: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ میں "لَشَدِيْدٌ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: شَدِيْدٌ: "شَدَّ يَشُدُّ شَدًّا" سے صفت مشبہ ہے۔"شَدَّ الشيئُ" سے مراد سخت ہونا،مضبوط ہونا،طاقتور ہونا،اور بھاری ہونا ہے۔اور "شدیدٌ" کا معنی،سخت،مضبوط،طاقتور،اور بخیل بھی ہوسکتا ہے۔بے شک انسان مال کی محبت میں بہت قوی،بہت سخت یا بہت بخیل ہے۔(کشاف)

اگر "شدید" سے مراد سخت اور قوی ہوتو "لحب الخیر" کا لام بمعنی "فی" ہوگا اور اگر "شدید" سے مراد بخیل ہوتو "لحب الخیر" کالام تعلیل کیلئے ہوگا۔یعنی وہ مال کی محبت کی وجہ سے بہت بخیل ہے۔(روح)

سوال: ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ "يَعْلَمُ" کے دومفعول ذکر کریں نیز بتائیں کہ یہاں "إذا" ظرفیہ ہے یا شرطیہ؟

جواب: "یعلم" کے دونوں مفعولوں کوکلام میں وعیداور سختی پیدا کرنے کیلئے حذف کردیا گیا ہے تاکہ سامع زیادہ متوجہ ہو۔ تقدیری عبارت یوں ہوسکتی ہے کہ"ألا یعلم العذاب جزاء له علی ما فی کنوده.........."

"إذا" یہاں ظرفیہ ہے۔(التحریر)

سوال: ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ "بُعْثِرَ" صیغہ بتائیں اوراسکی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: بُعْثِرَ: رباعی مجرد"بَعْثَرَ يُبَعْثِرُ بَعْثَرَةً" سے "دَحْرَجَ" کے وزن پرواحد مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔"بُعْثِرَ الشيئُ" سے مراد باہر نکال پھینکنا،چھپی ہوئی چیز کو برآمد کرنا،منتشر کرنا،پھیلانا اور جانچ کیلئے بکھیرنا ہے۔آیت کامعنی ہوگا: "جو کچھ قبروں میں ہے اسے جانچ پرکھ کیلئے باہر نکالا جائے گا"۔

سوال: ﴿اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ "ما فی القبور" کامحل اعراب بتائیں۔

جواب: ما فی القبور: "بُعْثِرَ" کانائب الفاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ "حُصِّلَ" کالغوی معنی ذکر کریں۔

جواب: حُصِّلَ: باب تفعیل"حَصَّلَ يُحَصِّلُ تَحْصِيْلًا" سے واحد مذکر غائب ماضی مجہول ہے۔جس کامعنی"الگ الگ کرنااور جمع کرنا" ہے۔مادہ:ح،ص،ل۔(قاموس)

سوال: ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ کی وضاحت کریں۔

جواب: یعنی اس دن صرف ظاہری افعال کے مطابق ہی فیصلہ نہیں کیا جائے بلکہ ظاہری افعال کے پیچھے جو نیتیں، ارادے اور محرّکات شامل تھے ان کو ظاہر کر کے ان کی بھی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی غلط کام کرے لیکن وہ اسکو جائز ثابت کرنے کیلئے کوئی اچھا محرک تلاش کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر اور دوسروں کو جواب دے سکے۔ خاص طور پر بعض مذہبی اور سیاسی لوگ تو اس کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ اپنے باطن کو مخلوق کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کیلئے اس طرح کا لبادہ ضرور ایجاد کر لیتے ہیں۔

اس آیت میں اس قسم کے شاطروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اس دن ان کے اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا سارا ریکارڈ بھی ان کے رب کے سامنے ہوگا۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ﴾ میں "لَخَبِيْرٌ" کی مختصر وضاحت کریں۔

جواب: یعنی ان کا رب ان کے ظاہر اور باطن سب کو خوب جاننے والا ہے اور ان سب سے باخبر ہے۔ یہ آیت بھی ماقبل کی تاکید ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تو اب بھی ہے لیکن اس دن جب وہ سب کے سامنے ظاہر و باطن کو کھول کر رکھ دے گا۔ اس دن سب جان لیں گے کہ وہ ان سب چیزوں سے کتنا آگاہ ہے۔ (تدبر)

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ
كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ
مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ۠﴿۱۱﴾

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت کے آخر میں قیامت کے احوال کو مختصرا بیان کیا "أفلا یعلم إذا بعثر ......"
تو اس سورت میں قیامت کے خوفناک منظر کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا موضوع قیامت کے احوال وواقعات کا بیان ہے۔

ابتدا میں قیامت کا خوفناک منظر اور اسکی شدت کو بیان کیا، پھر اس دن لوگوں کی کیفیت کو بیان کیا کہ اس دن لوگ گھبراہٹ کی وجہ سے اس طرح بھاگ رہے ہوں گے جیسے برسات کے موسم میں روشنی پر پروانے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کی تمام امیدوں اور پناہ گاہوں کو ذہن سے محو کرنے کیلئے فرمایا کہ اس دن تو پہاڑ بھی روئی کی طرح ہوں گے۔ لیکن اس دن جن لوگوں کے نیک اعمال کا وزن بھاری ہوگا وہ تو عیش وعشرت کی زندگی میں ہوں گے اور جس کے نیک اعمال کا وزن برے اعمال کے مقابلے میں ہلکا ہوا وہ دوزخ کی کھائی میں بھڑکتی آگ میں پھینکے جائیں گے۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿اَلْقَارِعَةُ﴾ کیوں مرفوع ہے؟ نیز اس کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے اس کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر بعد والا جملہ ﴿مَا الْقَارِعَةُ﴾ ہے۔ "قرع" کا اصل معنی ہوتا ہے کہ 'ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ زور سے مارنا کہ اس سے آواز آئے'' "قرع الباب" دروازہ کھٹکھٹانا۔ "اَلْقَارِعَةُ" کا اطلاق اس آواز پر

بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے سامعین میں خوف وہراس پھیل جائے۔

اس لغوی معنی کی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔تقول العرب: "قرعتهم القارعة" فلاں قبیلے پر بڑی آفت نازل ہوئی اور کلام اللہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا۔﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ﴾(الرعد:۳۱)(ترجمہ:اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہمیشہ اس حال میں رہیں گے کہ انہیں اس کی وجہ سے جو انہوں نے کیا،کوئی نہ کوئی سخت مصیبت پہنچتی رہے گی)"اَلْقَارِعَةُ" قیامت کا نام ہے جس طرح "الحاقة" ہے۔(التحریر)

صاحب تدبر فرماتے ہیں یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ایک الارم کی نوعیت کا ہے۔تاکہ تمام کان رکھنے والے اس مبتدا کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سوال:﴿مَا الْقَارِعَةُ﴾ کی ترکیب کریں اور محل اعراب ذکر کریں۔

جواب:مَا مبتدا،الْقَارِعَةُ خبر۔مَا الْقَارِعَةُ:"اَلْقَارِعَةُ"مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال:﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ﴾ کی ترکیب کریں۔

جواب:واؤ اعتراضیہ، مَا مبتدا،اَدْرٰی فعل ھُوَ ضمیر فاعل،كَ مفعول اول، مَا مبتدا،الْقَارِعَةُ خبر،مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ ہوکر اَدْرٰی فعل کا مفعول ثانی،فعل اپنے فاعل اور دونوں مفعولوں سے ملکر جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر مَا کی خبر،مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

سوال:﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ﴾"یوم"منصوب کیوں ہے؟

جواب:"یوم"فعل محذوف "تاتی،تقرع یا اذکر"کی وجہ سے منصوب ہے۔یعنی"تَاتِي الْقَارِعَةُ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ..."(اعراب)

سوال:﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ﴾"كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ"کی لغوی وضاحت اور مفہوم بیان کریں۔

جواب:الفراش:"فراشة"کی اسم جمع ہے۔(اعراب)

اس کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے:

۱:ایک توٹڈی کے چھوٹے بچوں پر جب وہ انڈوں سے نکلتے ہیں اور خوف کی وجہ سے ایک دوسرے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ القمر میں ہے۔﴿يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ﴾(ترجمہ:وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی

ہوئی ٹڈیاں ہوں)(القمر:۷)

۲: آگ میں جلنے والے پروانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔(التحریر، روح)

مذکورہ آیت میں دونوں معانی ہی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اصل مقصود لوگوں کی گھبراہٹ اور بے کسی (نفسی نفسی) کی حالت کو بیان کرنا ہے۔(روح)

المبثوث: ''بَثَّ يَبُثُّ بَثًّا''(ن) سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔جس کا معنی ''پھیلنا اور بکھیرنا'' ہوتا ہے۔ یہاں ''بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے'' معنی ہوگا۔(قاموس)

مفہوم: اس آیت مبارکہ میں قیامت کے روز لوگوں کی کیفیت کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ لوگ اس دن کی ہولنا کیوں اور خوف کی شدت کی وجہ سے اس طرح بھاگ رہے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پروانے ہوتے ہیں ۔ اسی ہولنا کی کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا کہ ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ○ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ○ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ﴾ (ترجمہ: جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔)(عبس:۳۴۔۳۶)

سوال: ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ میں ''تکون'' فعل ناقص کی خبر کی نشاندہی کریں۔

جواب: ''تکون'' کا اسم ''الجبال'' ہے اور ''کائنۃ'' اس کی خبر محذوف ہے، اور ''كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ'' ''کائنۃ'' کے متعلق ہے۔

سوال: ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ ''عهن'' کا لغوی معنی ذکر کریں۔

جواب: ''الصوف المصبوغ ألوانا'' مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی اون ۔جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: ''إنها فتلت قلائد هدى رسول الله ﷺ من عهن'' (ترجمہ: بے شک انہوں نے نبی علیہ السلام کی ہدی کے لیے رنگی ہوئی اون سے ہار بٹے۔)(لسان)

صاحب تدبر فرماتے ہیں: ''عهن'' اس اون کو کہتے ہیں جو دھنک کر اور رنگ کر کاتنے کے لیے تیار ہو چکی ہو۔ اس طرح کی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں اس کی تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔تشبیہ میں اصل مقصود اون کے بکھرنے اور اڑنے کی کیفیت کو نمایاں کرنا ہے، نہ کہ اس کے رنگ کو۔

سوال: ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ ''منفوش'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: ''نَفَش'' کا معنی ''المتاع المتفرق'' ہے۔ اس لفظ میں رات کے وقت بکھرنے اور منتشر ہونے کا مفہوم پایا

جاتا ہے۔ "نفشت الإبل والغنم أي انتشرت ليلا فرعت" یعنی رات کے وقت منتشر ہوئیں اور چرنے لگیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ﴾ (ترجمہ: جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں) (الانبیاء: ۷۸)

یہ "نَفَشَ يَنْفُشُ نَفْشًا" (ن) سے اسم مفعول ہے۔ مادہ: ن، ف، ش۔

سوال: ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ﴾ "موازین" کیا صیغہ ہے؟

جواب: یہ "وَزَنَ يَزِنُ وَزْنًا وَ زِنَةً" (ض) سے "موزون" کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور "میزان" کی بھی، دونوں معنی درست ہیں۔ اگر اس کو "موزون" کی جمع قرار دیا جائے تو وہ اعمال مراد ہونگے جو اللہ کی بارگاہ میں کچھ وزن رکھتے ہوں گے۔ اگر اس کو "میزان" ہی قرار دیا جائے تو ترازو کے پلڑے مراد ہوں گے۔

سوال: ﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ کس محل میں ہے؟ نیز بتائیں کہ ﴿عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ محل رفع میں ہے اس لئے کہ یہ "من" مبتدا کی خبر ہے۔

"عيشة راضيه" کے درج ذیل مفہوم ہوسکتے ہیں:

۱۔ "عيشة راضية" سے مراد "عيشة مرضية" ہو یعنی نیک لوگ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے اور وہ اس زندگی سے راضی ہوں گے۔

۲۔ "عيشة راضية" سے مراد ہے کہ وہ لوگ ایسی زندگی میں ہوں گے جو زندگی بھی ان نیک لوگوں سے راضی اور خوش وخرم ہوگی۔ یعنی تقدیری کلام یوں ہوگی "فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ"۔ أي أنها راضية أهلها فهي ملازمة لهم راضية بهم" اس صورت میں "راضية" اسم فاعل اور لازم کے معنی میں ہی ہوگا۔ (روح)

سوال: ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ... وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ﴾ "موازین" کے بھاری اور ہلکا ہونے کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: "موازین" "میزان" کی جمع ہے۔ (میزان اصل میں مِوْزَان تھا کسرہ کی مناسبت سے واؤ کو یا سے بدلا)

"موازین" کے بھاری ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی نیکیوں کے ترازو بھاری ہوئے اور ان کے ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس کی نیکیوں کے ترازو ہلکے ہوئے اور برائیوں کے بھاری ہوئے۔

اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ اعمال کا وزن کریں اور اس روز ترازو قائم کریں۔

صاحب روح المعانی نے ذکر کیا ہے کہ جو علماء قیامت کے روز ترازو کے منکر تھے وہ کہتے تھے کہ اعمال چونکہ ظاہری طور پر

کوئی وزن نہیں رکھتے اس لئے ان کا وزن ممکن نہیں ہے اور وہ موازین کو موزون کے معنی میں لیتے ہیں کہ موزون سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا اللہ کے ہاں وزن ہے اور ان کے بھاری ہونے کا مطلب ہے کہ ان کا زائد مقدار میں اور برائیوں سے بڑھ کر ہونا۔ (روح)

سوال: ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ کیا قیامت کے روز ایک ہی ترازو ہوگا یا زائد؟

جواب:۔ اس بارے میں علماء کی دونوں آراء موجود ہیں:

ا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ میزان ایک نہیں بلکہ زائد ہوں گے۔ ہر امت اور ہر فرد کیلئے الگ الگ ہوگا کیونکہ قرآن مجید میں بھی جمع ہی استعمال ہوا ہے۔ ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (ترجمہ: اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے) (الانبیاء: ۴۷)

۲۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ترازو ایک ہی ہوگا۔ قرآن مجید میں جمع کا صیغہ امتوں، افراد اور اعمال کے لحاظ سے بولا گیا ہے۔ علامہ آلوسی اور شیخ عثیمین نے اسی کو راجح کہا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب (الثمین، روح)

سوال: ﴿فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ رَاضِيَة کیا صیغہ ہے؟

جواب: رَاضِيَة: رَضِيَ يَرْضٰى رِضًا وَرِضْوَانًا (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ر، ض، و۔

سوال: ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾ "أم" کی لغوی وضاحت کریں اور بتائیں کہ یہ یہاں کس مفہوم میں وارد ہوا ہے؟

جواب: "أم" کے کئی معانی ہیں: ماں کے معنی بھی ہے اور اس چیز کیلئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی کو پناہ فراہم کرتی ہے۔ زمین کو "أم الناس" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ لوگوں کو رہنے کی جگہ فراہم کرتی ہے اور جس کے ساتھ گہرا واسطہ ہو اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جس طرح عتبہ بن ابی سفیان نے جنگ کے بارے میں کہا تھا: "فَنَحْنُ بَنُوْهَا وَهِيَ أُمُّنَا" (ترجمہ: جنگ ہماری ماں اور ہم اس کے جائے ہیں۔) اس آیت میں ان لوگوں کی ایسی حقارت وتذلیل کا بیان ہے جو الفاظ کا روپ نہیں لے سکتی۔ (العیاذ باللہ)

سوال: ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾ "هاوية" کیا صیغہ ہے؟ اور اس کا معنی ذکر کریں۔

جواب: یہ "هَوٰى يَهْوِىْ هَوًى" (ض) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ھ، و، ی۔ اس کے معنی ہیں: "سقط من فوق إلى أسفل" بلند جگہ سے نشیب کی طرف گرنا۔ جس طرح قرآن مجید میں ہے: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى﴾ (ترجمہ: اور الٹ جانے والی بستی کو گرا دیا) (النجم: ۵۳)، ﴿تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ (ترجمہ: اسے ہوا کسی دور جگہ میں گرا دیتی ہے) (الحج: ۳۱)۔ اور شمائل نبوی ﷺ میں ہے: "كأنما يهوي من صبب" (ترجمہ: آپ ایسے چلتے تھے جیسے بلند جگہ سے اتر

رہے ہوں)۔(لسان)

جہنم کو "ھاویہ" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اہل جہنم کو اس میں اونچائی سے پھینکا جائے گا۔(العیاذ باللہ)

سوال: ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾ قرآن مجید میں جہنم کو مختلف ناموں سے کیوں پکارا گیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لحاظ سے جہنم میں مختلف قسم کے عذاب تیار کئے ہیں۔ جہنم کے عذابوں کی مختلف نوعیت اور لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے جہنم کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ﴾ میں "مَا هِيَهْ" کا محل اعراب اور صیغہ بتلائیں۔

جواب: مَا هِيَهْ: "أدری" کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

مَا هِيَهْ: اصل میں "ما" "ھی" ہے کہ وہ کیا ہے۔ اور "ھی" کے آخر میں قافیے کو برقرار رکھنے کے لئے ہائے سکتہ ہے۔

جس طرح سورۃ الحاقۃ میں ہے: ﴿فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ كِتٰبِيَهْ، حِسَابِيَهْ، مَالِيَهْ اور سُلْطٰنِيَهْ کے آخر میں ہائے سکتہ کی مثالیں ہیں جو ردہم کو برقرار رکھنے کے لیے وارد ہوئی ہیں۔

سوال: ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ "حَامِيَة" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: حَامِيَة: "حَمِيَ يَحْمٰى حَمًى" (ع) سے واحد مؤنث اسم فاعل ہے۔ مادہ: ح، م، ی۔

حَمِيَ کا معنی ہے "سخت گرم ہونا"۔ اگرچہ "نَارٌ" میں بھی گرمی کا مفہوم موجود تھا لیکن اسکی مزید شدت کو بیان کرنے کیلئے "نَارٌ" کی صفت "حامية" لائی گئی ہے۔(روح)

سوال: ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔ نیز بتائیں "حامية" کو مؤنث کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: "نَارٌ حَامِيَةٌ" "ھی" ضمیر مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔(اعراب)

چونکہ "نَارٌ" مؤنث سماعی ہے اس لئے اسکی صفت "حَامِيَةٌ" کو بھی مؤنث لایا گیا ہے۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾

سوال: اس سورت کا زمانہ نزول اور شان نزول بیان کریں۔

جواب: بعض علماء نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے۔اور جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اس قدر قوی نہیں ہیں کہ صرف ان کو پیش نگاہ رکھا جائے اور اس سورت کو مدنی قرار دیا جائے۔کیونکہ سورت کا مضمون اور انداز بیان اس بات پر دال ہے کہ یہ مکی ہے۔اور شان نزول کے بارے میں کوئی مستند روایت تتبع بسیار کے بعد نہیں ملی۔

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سورۃ القارعۃ میں روز قیامت کے بعض احوال بیان کیے گئے اور خوش بختوں اور بد بختوں کی جزا بیان کی گئی ہے۔ اس سورت میں جہنم میں دخول کی علت بیان کی گئی ہے کہ دین کو چھوڑ کر دنیا کے مال واسباب میں حد درجہ کی رغبت ہی انسان کو اللہ اور آخرت سے غافل کرتی ہے۔اسی طرح اس سورت میں ان لوگوں کو جہنم کی یقینی موجودگی اور دنیا میں کئے گئے اعمال کی آخرت میں جواب طلبی کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔(المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال ودولت اور دنیاوی فائدے،لذتیں اور جاہ واقتدار حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور انہی چیزوں کے حصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں،اور اس ایک فکر نے ان کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انہیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔اس کے برے انجام پر متنبہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکری کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمہاری

آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جوابدہی کرنی ہوگی۔ (تفہیم)

سوال: ﴿أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ میں کس چیز میں کثرت اور کس چیز سے غفلت مراد ہے اور "کم" کے مخاطب کون لوگ ہیں؟

جواب: قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر ان چیزوں کا ذکر موجود ہے جن کی کثرت میں انسان گرفتار ہوتا ہے اور جن چیزوں سے غافل ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾ (ترجمہ: وہ مرد جنہیں اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے اور نہ کوئی خرید و فروخت) (النور: ۳۷)

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَآ أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں) (المنافقون: ۹)

﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ﴾ (ترجمہ: شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے) (المائدۃ: ۹۱)

اس آیت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ کس چیز کی کثرت نے تمہیں غفلت میں ڈال دیا ہے لیکن مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت مال و زر کی فراوانی، دنیاوی مال و متاع اور عیش و عشرت میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے رہنا اور اس قدر کوشش کرنا کہ انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے، اسی کا تذکرہ کیا ہے۔

"کُمْ" ضمیر میں اگرچہ کفار قریش، ابولہب یا ابوجہل یا دوسرے کافر بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کا مخاطب ہر فرد اور ہر وہ معاشرہ مراد ہے جس کو اس وبا نے اپنی قوت و طاقت کے ساتھ لپیٹ میں لے لیا ہو اور وہ اپنے اہم ترین فرائض منصبی سے غافل ہوں۔ (تفہیم)

سوال: ﴿أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ "ألهى" کے لغوی معنی ذکر کریں۔

جواب: باب افعال أَلْهٰى يُلْهِي إِلْهَاءً سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ معنی: غافل کرنا۔ مادہ: ل، ھ، و۔

سوال: ﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ "زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: "زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" سے قبل "أن" محذوف ہے۔ "أن" کی وجہ سے فعل بتاویل مصدر ہو کر "حَتّٰى" کا مجرور ہے۔ جار مجرور دونوں "ألهى" فعل کے متعلق ہوئے۔ (اعراب)

سوال: ﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ "زرتم" صیغہ حل کریں۔

جواب: زُرْتُمْ: "زَارَ يَزُوْرُ زَوْرًا وَ زِيَارَةً" (ن) سے جمع مذکر حاضر ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ز،و،ر۔ اصل میں "زَوَرْتُمْ" تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح الف سے بدلا "زارتم" ہوگیا اجتماع ساکنین کی وجہ سے الف گر گیا "زَرْتُمْ" ہوگیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہاں واؤ حذف ہوئی ہے "ز" کو ضمہ دیا "زُرْتُمْ" ہوگیا۔

سوال: ﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ "المقابر" کی لغوی وضاحت کریں۔ نیز اس آیت کا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: "مقبرة" کی جمع "مقابر" ہے۔ انسان کے مدفن کو کہتے ہیں۔ "قَبَرَ يَقْبُرُ" سے ظرف مکان ہے۔ مادہ: ق،ب،ر۔ (لسان) مفہوم: یعنی تم اپنی ساری عمر اسی کوشش میں کھپا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ (تفہیم)

سوال: ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ "تَعْلَمُوْنَ" کا مفعول کیا ہے؟

جواب: "سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" کا مفعول "سوء عاقبة التكاثر" ہے۔

سوال: ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ "سَوْفَ" مستقبل بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ عنقریب کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: "سَوْفَ" کا استعمال جہاں مستقبل بعید کے لیے ہوتا ہے وہاں پر تحقیق کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہر انسان کو مرنا ہے اور اس کی موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ اس لئے بھی عنقریب، جلد ہی، کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

سوال: ﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ ان آیات میں تکرار کیوں ہے؟

جواب: بعض علماء کے ہاں یہ محض تاکید اور مضمون کی پختگی کے لئے ہے جبکہ بعض دوسرے علماء کے ہاں یہ صرف تاکید کے لئے نہیں ہے بلکہ پہلا علم نزول موت کے وقت حاصل ہوگا اور دوسرا علم قبر میں حاصل ہوگا۔ (التفسیر القیم)

سوال: ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ میں "لو" شرطیہ ہے اس کا جواب شرط ذکر کریں۔

جواب: تقدیر عبارت یوں ہوگی: "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ مَا اشْتَغَلْتُمْ بِالتَّفَاخُرِ أَوْلَرَجَعْتُمْ عَنِ الْكُفْرِ" (اعراب)

سوال: ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ﴾ "لترون" کی صرفی تحلیل کریں۔

جواب: لترون: "رَاٰی يَرٰی رَاْيًا وَرُؤْيَةً" سے جمع مذکر حاضر، مضارع مؤکد بانون ثقیلہ ہے۔ مادہ: ر،أ،ی ہے۔ لترون

میں اصلی حرف صرف "ر" باقی ہے۔

تعلیل: لترون اصل میں "لَتَرْأَيُوْنَ" تھا۔ یا متحرک ماقبل مفتوح، یا کو الف سے بدلا "لترأاون" ہوا، پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے الف کو گرادیا "لَتَرْأَوْنَ" رہ گیا، پھر ہمزہ متحرک کی حرکت ماقبل حرف صحیح ساکن کو دے کر ہمزہ کو ثقل اور التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کردیا "لَتَرَوْنَ" ہوگیا۔ پھر نون تاکید ثقیلہ اور نون جمع کی وجہ سے تین نون (لترون+نّ) اکٹھے ہوئے تو نون جمع کو حذف کردیا (لترونّ) اور واؤ کو ملانے کیلئے ضمہ دیا تو "لَتَرَوُنَّ" ہوگیا۔ (اعراب)

سوال: ﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ﴾ جملہ مستانفہ ہے یا یہ ﴿لو تعلمون علم اليقين﴾ کا جواب شرط ہے؟ نیز دونوں صورتوں میں معنی پر کیا اثر ہوگا؟

جواب: بعض علماء نے اسکو "لو تعلمون علم اليقين" کا جواب بنایا ہے یعنی اس صورت میں معنی ہوگا۔ "لو تعلمون الجزاء علم اليقين الآن لترون الجحيم يعني تكون الجحيم دائما في نظركم لا تغيب عنكم"

یعنی اگر تم کو اب جزا کا یقینی علم ہوتا تو جہنم ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے رہتی کبھی غائب ہی نہ ہوتی۔

جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ "لو تعلمون علم اليقين" کی جزا محذوف مانی جائے (ما اشتغلتم بالتكاثر أو لرجعتم عن الكفر) اور "لترون الجحيم" کو جملہ مستانفہ بنایا جائے۔

یہ مؤقف راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ "لو" بذات خود (محقق الوقوع) ایک چیز کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا جواب "ممتنع الوقوع" (جس کا ہونا ناممکن ہو) ہوتا ہے۔ لہٰذا "لو تعلمون" کا جواب "لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ" کو بنانا درست نہیں۔ (روح، التحریر، اعراب)

سوال: ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ... ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ علم اليقين اور عين اليقين میں باہمی فرق کی وضاحت کریں۔

جواب: عام طور پر ہمارے ہاں یقین کی تین اقسام بیان کی جاتی ہیں: (۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ کو ایک ثقہ شخص خبر دیتا ہے کہ کعبۃ اللہ ہے۔ آپ کے لیے یہ علم الیقین ہوگا۔ اور اگر آپ کعبۃ اللہ کی زیارت سے مشرف ہوجاتے ہیں یہ آپ کے لیے عین الیقین کا درجہ ہوگا۔ اور اگر آپ کعبۃ اللہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ تو یہ حق الیقین کا مرتبہ ہوگا۔

سوال: ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ انسان سے نعمتوں کے بارے کیا جواب طلبی ہوگی؟

جواب: انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی دو اقسام ہیں:

۱۔ براہ راست عطاء کردہ نعمتیں: یعنی وہ نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسکی محنت کے بغیر ہی اپنے فضل سے عطا کیں۔ جسم، ناک، کان وغیرہ۔ ان کے بارے میں یہ حساب دینا ہوگا کہ ان نعمتوں کو کس طرح اور کس کی راہ میں استعمال کیا۔

۲۔ کسبی نعمتیں: اللہ تعالیٰ کی انسان پر بعض ایسی نعمتیں ہیں جو اصلاً تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہیں لیکن انسان کو اسکی محنت و کاوش سے حاصل ہوتی ہیں مثلاً مال ودولت وغیرہ۔

ان نعمتوں کے بارے جواب طلبی ہوگی کہ ان کو کن ذرائع سے حاصل کیا اور انکو کہاں خرچ کیا؟

مجموعی طور پر ان تمام نعمتوں کے بارے میں جواب دینا ہوگا کہ کیا اس نے ان کو اللہ کی نعمتیں سمجھا تھا یا کہ اپنی اور کسی اور کی عطا کردہ؟ اور ان پر دل، زبان اور عمل سے اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اسکی اطاعت میں انکو لگایا تھا یا نافرمانی میں استعمال کیا تھا؟ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ کیا یہ جواب طلبی صرف کافروں سے ہوگی؟

جواب: قرآن کریم کا سیاق اگرچہ اسی پر دلالت کررہا ہے کہ یہ جواب طلبی کافروں سے ہوگی لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ جواب طلبی مومنوں سے بھی ہوگی۔ جس کی تائید بہت سی احادیث سے ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نعمتوں کو تناول کرنے کے بعد اس آیت کی تلاوت کی تھی۔ لیکن مومنوں اور کافروں کی جواب طلبی میں باہم فرق ہوگا، کافروں سے پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں کن کی ہیں، اللہ کی یا شرکاء کی، مومنوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے انکی قدر کی ہے یا نہیں۔ (تفصیل کیلئے: التحریر، روح، تفہیم، التفسیر القیم)

سوال: ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ "النَّعِيْمِ" سے کون سی نعمتیں مراد ہیں اور کیا یہ جواب طلبی جہنم کے داخلے کے بعد ہوگی؟

جواب: اس سورۃ میں تکاثر کے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے۔ یہاں خاص طور پر نعمتوں کی جواب طلبی کے بارے میں متنبہ کیا جا رہا ہے اور النَّعِيْمِ سے ہر نعمت مراد ہے۔ ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (ترجمہ: بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال ہوگا) (الاسراء: ۳۶) امن، صحت، فراغت، زبان دانی، علم، مال یہ سب نعمتیں ہیں۔ ﴿وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (ترجمہ: اگر تم اللہ کی نعمت کو شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے، یقیناً انسان بہت ظالم اور بہت ناشکرا ہے) (ابراہیم: ۳٤) اور قیامت کے دن سب سے اول نعمتوں کے بارے

میں جواب طلبی ہوگی۔ جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت ہے: ''إِنَّ أَوَّلَ مَا يُسْأَلُ يَعْنِي يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الْعَبْدُ مِنَ النَّعِيمِ أَنْ يُقَالَ لَهُ أَلَمْ نَصِحَّ لَكَ جِسْمَكَ وَنُرْوِكَ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ''۔ یعنی قیامت کے روز سب سے پہلے انسان کی نعمتوں کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہارے جسم کو تندرستی نہیں بخشی اور کیا ہم نے تجھے میٹھے پانی سے سیراب نہیں کرتے رہے؟۔ (الترمذی: ۳۳۵۸، صحیح)

سوال: التکاثر۔ لتسئلن صیغے بتائیں۔

جواب: التکاثر: باب تفاعل ''تَكَاثَرَ يَتَكَاثَرُ'' سے مصدر ہے۔ مادہ: ک، ث، ر۔

لتسئلن: ''سَأَلَ يَسْأَلُ سُؤَالًا'' (ف) سے جمع مذکر حاضر، مضارع مجہول بانون تاکید ثقیلہ ہے۔ مادہ: س، أ، ل۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣

سوال: سورۃ العصر کا ماقبل سورت سے علاقہ بیان کریں۔

جواب: سورۃ التکاثر میں ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو ساری عمر اسی دنیا کے مال ومتاع جمع کرنے میں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں اور انہوں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے زندگی کے حقیقی مقصد کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟ وہ کون سی چیزیں ہیں جو دائمی فلاح کی ضامن ہیں اور وہ کون سی چیزیں ہیں جن کو اپنا کر انسان خسارے سے بچ سکتا ہے۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون بیان کریں۔

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مختصر الفاظ میں انسانوں کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب بیان کئے ہیں۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت کے ایک عجیب مظہر ''زمانہ'' کی شہادت کو پیش کر کے کہا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ صرف درج ذیل صفات کے حامل لوگ ہی اس خسارے سے محفوظ ہیں:

١۔ ایمان ٢۔ عمل صالح ٣۔ ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے والے ٤۔ اور آپس میں صبر کی تلقین کرنے والے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ یہاں ایک اہم حقیقت عجیب انداز میں پیش کی گئی ہے، بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان صفات کے حامل لوگ خسارے سے بچ گئے، حالانکہ صرف خسارے سے نہیں بچے بلکہ نفع میں چلے گئے ہیں، اسکی تائید قرآن کی دوسری آیات سے ہوتی ہے۔ (المنیر)

سوال: سورۃ العصر کی اہمیت کے بیان میں صحابہ کرام کا عمل اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کریں۔

جواب: امام طبرانی نے اپنی سند سے عبید اللہ بن حفص سے بیان کیا ہے۔ صحابہ کرام میں سے جب بھی کوئی دو شخص باہم

ملاقات کرتے اس وقت جدا نہ ہوتے جب تک باہم ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتے، سورت سنانے کے بعد ایک دوسرے کو سلام کہتے۔ (المعجم الاوسط: ۵۱۲۴)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ سورۃ العصر پر تدبر کی نگاہ ڈالیں تو یہی سورت ان کے لئے کافی ہے۔ (ابن کثیر)

سوال: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟

جواب: یہ "أقسم" محذوف فعل کے متعلق ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ سے کون سا وقت مراد ہے؟ اور وقت کی قسم کس چیز پر بطور استشہاد اٹھائی گئی ہے؟

جواب: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ سے مراد ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ ﴿الْعَصْرِ﴾ کی قسم اس بات پر بطور استشہاد لائی گئی ہے کہ انسانی تاریخ اور عصر حاضر کی اقوام کی صورتحال اس بات پر شاہد ہے کہ جو بھی اقوام سورت عصر میں بیان کردہ چار صفات سے خالی رہی ہیں وہ ہمیشہ خسارے سے دوچار ہوئی ہیں۔ مثلاً قوم نوح، قوم عاد و ثمود اور بنی اسرائیل وغیرہ کا انجام دیکھئے یا عصر حاضر کی سرکش اقوام کا اور ماضی قریب کی ظالم حکومتوں کا احوال ملاحظہ کریں۔ آپ کو ہر جگہ یہی قانون قدرت نمایاں نظر آئے گا۔ (تفہیم، البیان)

سوال: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ﴾ "لَفِي" میں لام کون سا ہے؟

جواب: "لَفِي" میں لام لامِ مزحلقہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اصلاً یہ لام مبتدا پر داخل ہوتا ہے لیکن جب مبتدا پر إِنَّ داخل ہوتا ہے تب اس کو گھسیٹ کر خبر پر لے جاتے ہیں۔ یہ لام تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

سوال: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ﴾ "الْإِنْسَانَ" میں الف لام کس معنی میں ہے؟

جواب: یہ الف لام استغراقی ہے۔ یعنی جنس انسان کے کل افراد اس میں داخل ہو گئے۔ ترجمہ یہ ہوگا: "بلاشک تمام انسان یقیناً خسارے میں ہیں"۔

سوال: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ﴾ "الْإِنْسَانَ" سے کون مراد ہے اور "خُسْرٍ" سے کونسا خسارہ مراد ہے؟

جواب: لفظ "الْإِنْسَانَ" سے کوئی خاص انسان یا فرد مراد نہیں بلکہ پوری نوع انسانی مراد ہے۔ اس مفہوم کی شہادت بعد والی آیت مہیا کر رہی ہے۔ اگر "الْإِنْسَانَ" سے مراد فرد واحد ہوتا تو "إلا الذين امنوا" فرما کر استثناء نہ کیا جاتا۔ لفظ "الذین" بتا رہا ہے کہ "الْإِنْسَانَ" اسم جنس ہے اور یہ پوری نوع انسانی کو شامل ہے۔

لفظ "خُسْرٍ" جب قرآن پاک میں "فلاح" کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے تو "خُسْرٍ" سے مراد دنیا اور آخرت

دونوں میں ملنے والا خسارہ اور نقصان ہوتا ہے۔تو سورۃ العصر میں ''خسر'' سے مراد یہ ہوگا کہ ''تمام انسان دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن کے اندر یہ چار صفات پائی جاتی ہیں۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ ''خُسْرٍ'' میں تنوین کس مقصد کے لیے ہے؟

جواب: یہ تنوین تعظیم ہے یعنی انسان بہت بڑے خسارے میں ہیں۔ (انوار)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ میں کون سا استثناء ہے؟

جواب: یہ استثناء متصل ہے۔ظاہر بات ہے کہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ انسان ہی ہیں۔اگر ''الْاِنْسَانَ'' سے مراد کافر لئے جائیں تب یہ استثناء منقطع ہوگا۔ (انوار)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ایمان کا مفہوم بتائیں نیز کن کن چیزوں پر کن شرائط کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے؟

جواب: ایمان کا شرعی مفہوم یہ ہے: اقرار باللسان، تصدیق بالجنان، عمل بالارکان۔ ''زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ایمان ہے۔

مندرجہ ذیل چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے:

''اللہ تعالیٰ، انبیاء ورسل، فرشتے، انبیاء پر نازل کردہ کتابیں، یوم آخرت اور تقدیر۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے وجود کو مانا جائے بلکہ اس کے یکتا ہونے کا یقین ہو، اس کی الوہیت، عبادت اور اس کی صفات عالیہ میں کسی کو شریک نہ سمجھا جائے اور ہر وقت اسی کو الٰہ حقیقی سمجھ کر پکارا جائے۔ رسول پر ایمان کا مطلب ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مأمور سمجھا جائے اور اس کی تعلیمات پر الٰہی تعلیمات سمجھ کر عمل کیا جائے۔

رسول پر ایمان کے ضمن میں فرشتوں اور کتب انبیاء پر ایمان لانا بھی ضروری ہوگا۔آخرت پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ اسی زندگی کو حقیقی زندگی سمجھ کر اس کے لیے تیاری کی جائے کیونکہ زندگی میں کئے گئے اعمال کی جزا آخرت میں ملے گی۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ عمل صالح ایمان میں داخل ہے۔یعنی جو شخص ایمان لائے گا اس کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ نیک اعمال بجالائے لیکن ایمان کے بعد عمل صالح کو کیوں ذکر کیا جاتا ہے؟

جواب: عمل ایمان میں داخل ہے۔ یہاں جو حرف عطف کے ساتھ ذکر ہوا ہے یہ مغایرت کے لئے نہیں بلکہ استقصاء کے لئے ہے۔ عطف کے چار مراتب ہیں:

۱: دونوں باہم متضاد ہوں۔ (اکثر یہی ہوتا ہے) معطوف معطوف علیہ کا جز ہو اور نہ ہی اس کا لازمہ ہو۔ جَاءَ زَيْدٌ وَعَمْرٌو

۲: معطوف معطوف علیہ کا لازمہ ہوتا ہے۔ ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرۃ:۴۲)

۳: معطوف معطوف علیہ کا جز ہو۔ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (البقرۃ:۲۳۸)

۴: معطوف معطوف علیہ دونوں ایک ہیں لیکن صفات مختلف میں ہیں۔ اعمال اگرچہ ایمان میں داخل ہیں لیکن استقصاء اور استیفاء بیان کے لئے عطف ڈالا گیا ہے۔ (زبدۃ البیان از حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵)

سوال: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ عمل صالح کیا ہے؟ نیز کسی عمل کے صالح ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

جواب: عمل صالح سے مراد تمام قسم کی نیکیاں ہیں یعنی جو بھی عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور سنت نبوی کے مطابق کیا جائے وہ عمل صالح کہلائے گا۔

عمل صالح کی تین شرائط ہیں: (۱) ایمان باللہ (۲) سنت نبوی کے مطابق ہونا (۳) خلوص نیت۔

ایمان باللہ کے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر عمل سنت نبوی کے مطابق نہ ہو وہ بھی ناقابل قبول ہوگا۔

سوال: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ ''تواصوا'' کیا صیغہ ہے؟

جواب: باب تفاعل ''تَوَاصٰى يَتَوَاصٰى'' سے جمع مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ و، ص، ی۔

سوال: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ میں ''تواصی'' اور ''حق'' کا مفہوم واضح کریں۔ نیز کسی معاشرے کی کامیابی کے لیے ''تواصی بالحق'' کس حد تک ضروری ہے؟

جواب: تواصوا: باب تفاعل سے ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کو وصیت، نصیحت اور تلقین وغیرہ کرنا۔

لفظ ''حق'' باطل کی ضد ہے اور عموماً دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

پہلا جو عدل وانصاف اور حقیقی بات کے مطابق ہو۔

دوسرا وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ اللہ کا حق ہو یا خود انسان کے نفس کا یا دوسرے لوگوں کا۔

''تواصی بالحق'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر معاشرے میں باطل سر اٹھا رہا ہو تو لوگ خاموش نہ رہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے باطل کا سر کچل دیں۔ نیز ایسا کرنا صرف ایک فرد پر لازم نہیں بلکہ معاشرے کی ذمہ

داری ہے۔اس لئے معاشرے کے تمام افراد کو چاہیے کہ وہ خود بھی اور ایک دوسرے کو بھی حقوق کی ادائیگی اور حق کے دفاع کی تلقین کرتے رہیں۔کسی بھی معاشرے کی کامیابی کے لیے"تواصی بالحق" نہایت ضروری ہے۔اسی کی بنیاد پر صالح اور پرامن معاشرہ وجود میں آتا ہے۔(تفہیم)

سوال ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ سے کیا مراد ہے نیز اس کے فوائد ذکر کریں۔

جواب: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ سے مراد ہے کہ معاشرے کے افراد کو حق کی حمایت میں یا راہِ حق میں جو بھی مشکلات پیش آئیں وہ خود بھی ان مشکلات کا صبر وتحمل سے سامنا کریں اور بقیہ افراد معاشرہ کو بھی صبر کی تلقین کرتے رہیں تا کہ افراد بددل ہو کر کہیں حق سے ہی برگشتہ نہ ہو جائیں۔صبر کی تلقین کرنے سے افراد میں مشکلات برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے نیز وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتے۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا
لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى
الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی کہ تمام انسان (سوائے چار اوصاف کے حاملین کے) خسارے میں ہے اس سورت میں اس خسارے کی وضاحت کیلئے ایک مثال بیان کی کہ وہ خسارے والا کن اوصاف سے متصف ہوتا ہے اور اس کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ (المنیر، روح)

اسی طرح سابقہ سورت میں کامیاب لوگوں کی یہ صفت بیان کی کہ وہ ایک دوسرے کو حق وصبر کی تلقین کرتے ہیں اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار یعنی ان بخیلوں کا کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کو ادائے حقوق پر ابھارنا تو درکنار، کسی کو اگر دیکھ لیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً وقولاً سرگرم ہے تو طعن وتشنیع اور ملامت وتحقیر کر کے اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ (تدبر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے چند اخلاقی برائیوں کی مذمت بیان کی ہے اور ان میں ملوث لوگوں کے انجام کا تذکرہ کیا ہے۔ ابتدا میں لوگوں کو طعن وتشنیع اور ان کی حقارت کرنے والوں کو شدت عذاب اور ہلاکت کی وعید سنائی ہے۔ اس کے بعد ان کی زر پرستی کو بیان کیا ہے۔ اور آخر میں ان کیلئے جہنم کے سخت عذاب کو بیان کیا ہے کہ ان کو سخت سے سخت عذاب دیا جائے گا۔ (المنیر)

سوال: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ میں ''ویل'' کیا صیغہ ہے؟ اور وضاحت کریں کہ اس کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا کیوں بنایا گیا؟

جواب: ویل: اسم ہے جس کا کوئی باب نہیں۔ (لسان)
جب یہ بغیر لام کے مضاف ہوتا ہے تو مصدر منفرد کے قائم مقام ہوتا ہے مثلاً ﴿وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ (طٰہٰ:۶۱)
اور جب لام کے ساتھ استعمال ہو تو اس وقت ویل مبتدا اور بعد والا جملہ محل رفع میں ہوتا ہے۔
چونکہ ''ویل'' میں بددعا کا معنی ہے اس لئے اسے مبتدا بنایا گیا۔ جب نکرہ میں دعا یا بددعا کا معنی ہو تو اسے مبتدا بنانا جائز ہے۔ مثلاً ﴿وَسَلٰمٌ عَلَيۡهِ يَوۡمَ وُلِدَ﴾ (سورۃ مریم:۱۵) (اعراب، معجم النحو)

سوال: اس سورت کے شان نزول کی وضاحت کریں۔

جواب: اس بارے میں بعض صحابہ اور تابعین سے تفسیری روایات منقول ہیں جن میں بعض ساداتِ مکہ کے نام ملتے ہیں کہ یہ ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن قرآن مجید کے الفاظ ﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ عام ہیں جو کہ ان تمام لوگوں پر صادق آتے ہیں جو ان اخلاقی برائیوں میں ملوث ہیں۔ چاہے وہ اس دور کے مشرکین ہوں یا بعد کے زمانہ کے لوگ۔ (طبری، التحریر)

سوال: ﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ میں ''همزة'' اور ''لمزة'' کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: ''همزة'' اور ''لمزة'' دونوں ''فُعَلَةٌ'' کے وزن پر اسم مبالغہ ہیں۔ ان کا ایک ہی مفہوم ذکر کیا گیا ہے کہ کسی کی عیب جوئی اور تحقیر وتذلیل کرنا۔ جب کہ بعض اہل لغت نے ان میں فرق کیا ہے کہ ''همز'' کسی کی غیر موجودگی میں اس کی عیب جوئی کرنا اور ''لمز'' اس کے سامنے عیب جائی کرنا۔ جب کہ بعض کہتے ہیں کہ ''همز'' کا معنی اشاروں سے کسی کی تضحیک کرنا اور ''لمز'' زبان سے عیب جوئی کرنا۔ (لسان، تدبر)

سوال: جملہ ﴿الَّذِيۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: ''الذی'' اسم موصول کو ''هو'' ضمیر مبتدا محذوف کی خبر بنانا بھی درست ہے۔ اس وقت یہ جملہ محل رفع میں ہوگا اور اس کو ''لکل'' سے بدل بنانا بھی درست ہے۔ اس وقت یہ جملہ محل جر میں ہوگا۔ (اعراب)

سوال: ﴿الَّذِيۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾ کیا مال کو جمع کرنا اور گن کر رکھنا قابل مذمت ہے؟

جواب: مال کو جب حلال ذریعہ سے کمایا جائے اور اس کے حقوق ادا کئے جائیں تو مال جمع کرنے اور اس کا شمار کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ دراصل اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو ہر وقت مال سمیٹنے کی فکر میں مگن رہتے ہیں، انہیں فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں ہمارے مال ودولت میں کمی نہ ہو جائے اور بخل کے آخری درجہ تک پہنچے ہوتے ہیں کہ

غرباء ومساکین کو دینے کی بجائے ۹۹ کو ۱۰۰ بنانے کے چکروں میں رہتے ہیں۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾ "عَدَّدَهٗ" کا درست ترجمہ کیا ہے؟

جواب: "عَدَّدَهٗ" کا صحیح ترجمہ ہے کہ اس کو شمار کرتا رہا۔

"عدّ" باب ثلاثی کا معنی بھی شمار کرنا ہوتا ہے لیکن "عَدَّدَ" باب تفعیل سے اس لئے ذکر کیا تاکہ اس کے معنی میں مزید مبالغہ بیان ہو کہ وہ شخص بار بار اس کو گنتا ہے۔ کیونکہ یہاں اس شخص کی زر پرستی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ (التحریر)

سوال: جملہ ﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(۱) یا تو یہ جملہ مستأنفہ ہوگا۔ اس صورت میں یہ "لا محل لها من الإعراب" سے ہوگا۔

(۲) یہ جملہ محل نصب میں ہوگا۔ سابقہ آیت میں "جمع" کے فاعل سے حال بن سکتا ہے۔

سوال: ﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾ "یحسب" کے دو مفعولوں کی وضاحت کریں۔

جواب: جملہ "أن ماله أخلده" "یحسب" کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور یہ محل نصب میں ہے جس کو سدّ مسدّ مفعولین کہا جاتا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾ میں "اَخْلَدَهٗ" کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: جملہ "اَخْلَدَهٗ" محل رفع میں ہے کیونکہ یہ "أن" کی خبر واقع ہو رہا ہے۔

سوال: ﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ﴾ "اَخْلَدَهٗ" کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟

جواب: "أخلد الشیئ" کا معنی ہے: ہمیشہ رکھنا، برقرار رکھنا، دوام عطا کرنا اور حیات ابدی بخشنا۔ (قاموس)

لہذا اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا "کہ وہ گمان کرتا ہے کہ بے شک اس کا مال اس کو ہمیشہ باقی رکھے گا"۔

جبکہ بعض مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ "اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا" (تفہیم، تفسیر ماجدی)

"أخلد" فعل ماضی ہے لیکن معنی فعل مضارع والا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اکثر تحقق وقوع کا اعتبار کرتے ہوئے مستقبل کو فعل ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ﴾ "كَلَّا" کس کلام کی تردید کے لیے آیا ہے؟

جواب: "كَلَّا" یا تو اس شخص کے اس زعم "أن ماله أخلده" کی تردید کے لیے آیا ہے۔ یا پھر سابقہ تمام کلام کو شامل ہے

یعنی اس کی تمام اخلاقی برائیوں کی تردید کے لیے آیا ہے۔ پہلی توجیہ احسن معلوم ہوتی ہے۔

سوال: ﴿كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ "لینبذن" صیغہ اور معنی بتلائیں۔

جواب: لینبذن: "نَبَذَ يَنْبِذُ نَبْذًا" (ض) سے واحد مذکر غائب مضارع مجہول، بانون تاکید ثقیلہ ہے۔ مادہ: ن، ب، ذ۔ جس کے معنی کسی چیز کو حقیر جانتے ہوئے پھینک دینے کے ہیں۔ (التحریر، تفہیم)

سوال: ﴿كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ "الحطمة" کی لغوی تشریح کریں۔

جواب: الحطمة: "فُعَلَة" کے وزن پر "حَطَمَ يَحْطِمُ" (ض) سے اسم مبالغہ ہے جو کہ "حطم" سے مشتق ہے جس کے معنی کسی کو توڑ دینے، ریزہ ریزہ کر دینے کے ہیں۔ (اعراب) مادہ: ح، ط، م۔

سوال: ﴿وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ﴾ کی ترکیب کریں۔

جواب: واؤ اعتراضیہ، ما مبتدا، أدرٰك فعل + فاعل (مستتر ھو) + ك ضمیر مفعول اول، ما (الثانیة) مبتدا، الحطمة خبر، مبتدا خبر جملہ اسمیہ ہو کر مفعول ثانی أدری فعل کے۔ فعل اپنے مستتر فاعل اور دونوں مفعولوں سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر ما اول کی خبر ہوا۔ مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

سوال: ﴿وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ﴾ "أدری" کی صرفی تحلیل کریں۔

جواب: أدری: باب افعال أَدْرٰى يُدْرِي سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: د، ر، ی۔

أدری اصل میں أدرَيَ بروزن أكرَمَ تھا۔ ی متحرک ماقبل مفتوح، ی کو الف سے بدل دیا، أدری ہو گیا۔

سوال: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ کا محل اعراب کیا ہے؟

جواب: یہ جملہ خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ ھی ضمیر مبتدا محذوف ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ جہنم کی آگ کو "نَارُ اللّٰهِ" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟

جواب: اس آگ کی شدت اور ہولناکیوں کے اظہار کے لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ اللہ ہی کی آگ ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی دولت پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جانے والوں کو اللہ کس قدر سخت نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس نے اس آگ کو خاص اپنی آگ کہا ہے جس میں وہ پھینکے جائیں گے۔ (التحریر، تفہیم)

سوال: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ "الْمُوْقَدَةُ" مرفوع اور مونث کیوں ہے؟

جواب: الْمُوْقَدَةُ: "نار" کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ چونکہ "نار" مؤنث سماعی ہے، اس لئے اس کی صفت "الْمُوْقَدَةُ" بھی مؤنث لائی گئی ہے۔

سوال: ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ "الْمُوْقَدَةُ" کی لغوی اور صرفی تشریح کریں۔

جواب: الْمُوْقَدَةُ: باب افعال "أَوْقَدَ يُوْقِدُ" سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ مادہ: و، ق، د۔ اس کے معنی ہیں: "آگ جلانا اور بھڑکانا"۔ یعنی اللہ کی آگ جو کہ جلائی اور بھڑکائی گئی ہے۔

سوال: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ کا محل اعراب بتلائیں۔

جواب: یہ جملہ "نار" کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اسی لئے مؤنث استعمال ہوا ہے۔

سوال: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ "تَطَّلِعُ" کیا صیغہ ہے؟

جواب: تَطَّلِعُ: باب افتعال "اِطَّلَعَ يَطَّلِعُ" سے واحد مؤنث غائب مضارع معلوم ہے۔ اصل میں تطتلع تھا۔ فاکلمہ میں طا آنے کی وجہ سے تاء افتعال کو طا سے بدل کر طا میں ادغام کردیا۔ جس کی وجہ سے تَطَّلِعُ بن گیا۔ مادہ: ط، ل، ع۔

سوال: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ "تَطَّلِعُ" کا معنی ومفہوم ذکر کریں۔

جواب: تطلع اِطّلاع سے ہے جس کا ایک معنی تو واضح ہونا، باخبر ہونا اور اطلاع پانے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ آگ دلوں پر مطلع ہو کر ان کے کفر اور برے اعتقادات کو جاننے کے بعد ہی ان کو اس کے مطابق سزا دے گی۔

اس کا دوسرا معنی کسی چیز پر قابو پالینا، اور پہنچ جانے اور قوت و غلبے کے ساتھ تیزی سے آنے کے ہیں۔ یعنی وہ آگ ان مجرموں کے دلوں پر قابو پاکر ان کو جلا دے گی جو دل برے عقائد اور بیماریوں کا مرکز تھے۔ (التحریر، قاموس، تفہیم)

سوال: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ "الأفئدة" کی واحد اور معنی بتلائیں۔

جواب: الأفئدة: "فؤادٌ" کی جمع ہے جو کہ دل کو کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

بعض کے نزدیک دل کے درمیانے حصے کو کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم میں سب سے زیادہ تکلیف کو محسوس کرنے والا یہی حصہ ہوتا ہے۔ (کشاف)

انسان کے ادراک وشعور، جذبات وخواہشات، عقائد وافکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام یہی حصہ ہوتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ﴾ "مُّؤْصَدَةٌ" کی لغوی اور صرفی وضاحت کریں۔

جواب: مُّؤْصَدَةٌ: باب افعال آصَدَ يُوْصِدُ اِيْصَاد سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ آصَدَ کا معنی ہے: بند کرنا۔

مادہ: أ،ص،د۔ یعنی وہ آگ ان پر بند کر دی جائے گی کیونکہ جب آگ کو ہر طرف سے بند کر دیا جائے تو اس کی تپش میں اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ویلڈنگ کے پائپ میں بھی گرمی کی تپش زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی ہر طرف سے بند ہوتا ہے اور صرف آگ کے نکلنے کے لئے چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ اسی ہولناکی کو ﴿إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ﴾ کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ (قاموس، تدبر)

سوال: ﴿فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ ”عمد“ اور ”ممدۃ“ کی لغوی اور صرفی وضاحت کریں۔

جواب: عمد عمود کی اسم جمع ہے۔ جو کہ ستون کو کہا جاتا ہے۔ ممددۃ: مدّدَ یُمَدِّدُ سے واحد مؤنث اسم مفعول ہے۔ جس کا معنی ہے کہ ”جس کو بہت لمبا بنایا گیا ہو“۔ (التحریر)

سوال: ﴿فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ کس کے متعلق ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: ﴿فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ کی ترکیب اور مفہوم کے لحاظ سے دو توجیہات زیادہ مناسب ہیں۔

(۱) ”فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ“ کا تعلق علیھم کی ضمیر سے ہو اور ضمیر ذوالحال ہو اور موثقین فی عمد ممددۃ حال ہو۔ اس توجیہ کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ یہ مجرم اونچے اونچے ستونوں سے بندھے ہوں گے۔

(۲) ”فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ“ کا تعلق آگ سے ہو۔ اس صورت میں إنها کی ھا ضمیر ذوالحال اور موقدۃ فی عمد ممددۃ حال ہو گا۔ یعنی آگ کو لمبے لمبے ستونوں میں جلایا جائے گا۔ أعاذنا الله منها۔ (التحریر، کشاف، تفہیم)

سُوۡرَةُ الۡفِيۡلِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِؕ ۝١ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍۙ ۝٢
وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَۙ ۝٣ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍۙ ۝٤ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ
مَّاۡكُوۡلٍ ۝٥

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے کیا مناسبت ہے؟

جواب: سابقہ سورت میں اللہ تعالیٰ نے همز و لمز سے متصف لوگوں کی مذمت کی تو قریش مکہ جو کہ نبی ﷺ کے خلاف تدابیر کرتے رہتے تھے وہ بھی اس وعید میں شامل تھے۔ اس سورت میں اصحاب الفیل کا تذکرہ کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے تحفظ کیلئے ان کو دنیا میں ہلاک کیا۔ لہذا قریش مکہ کو بھی وعید سنائی ہے کہ جو ذات بیت اللہ کے تحفظ کیلئے اتنا کچھ کرسکتی ہے وہ اپنے محبوب پیغمبر کے تحفظ کیلئے کیا کچھ نہ کرے گی؟

اسی طرح سابقہ سورت میں زر پرستوں کی مذمت کرنے کے بعد اس سورت میں اس کی ایک مثال بیان کی کہ اصحاب الفیل جو اپنے مال وجاہ اور لشکر کے گھمنڈ میں تھے کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی چھوٹی سی مخلوق سے تباہ و برباد کیا۔ (روح، المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کی تباہی کا تذکرہ کیا ہے جو کہ اپنے مال وزر اور لشکر جرار پر فخر وگھمنڈ میں مبتلا تھے اور بیت اللہ کو تباہ کرنے کی مذموم سعی کیلئے آئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو پرندوں کے لشکر سے اور چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے اس طرح ہلاک کر دیا کہ ان کا نام ونشان بھی ختم کر دیا۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کے نزول کی حکمت اور اہم درس عبرت ذکر کریں۔

جواب: اس سورت کے ذریعے اہل عرب کو انتہائی حکیمانہ اور بلیغانہ نصیحت کی گئی ہے۔ عرب کا ہر فرد جانتا تھا کہ اصحاب الفیل کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں تھی فقط اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید سے وہ ان کے حملہ [illegible] ہے، حالانکہ اس وقت

خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے۔ مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں ان سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ ان کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابن ہشام نے سیرت میں عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں:

لَا هُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حِلَالَكَ لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيْبُهُمْ وَمِحَالُهُمْ غُدْوًا مِحَالَكَ

اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے۔

اسی لئے تقریباً دس سال تک اہل عرب اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے رہے۔ لیکن اب دوبارہ اہل عرب اپنی ڈگر پر لوٹ آئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کئی معبودوں کو شریک کر لیا تھا اس لئے یہ سورت نازل کر کے انکو دوبارہ توحید کا سبق یاد دلایا گیا ہے اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے نبی ﷺ کی مخالفت جاری رکھی تو تمہارا انجام بھی اصحاب الفیل کی طرح ہو سکتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ تاریخ عرب میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے اسے مفصل بیان کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے مختصر کیوں بیان کیا؟

جواب: دراصل یہ انتہائی قریبی دور کا واقعہ تھا کہ نبی ﷺ کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ، دو ماہ قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس لئے عرب کا ہر باشندہ اس واقعہ سے بخوبی واقف تھا شاید یہی حکمت ہے کہ اس واقعہ کو انتہائی اختصار کیساتھ بیان کیا گیا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ "أَلَمْ تَرَ" کا معنی ومفہوم ذکر کریں۔

جواب: "أَلَمْ تَرَ" کا معنی ہے کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ بعض دفعہ مخاطب نے اس چیز کا عینی مشاہدہ نہیں کیا ہوتا لیکن وہ واقعہ اس قدر مشہور و معروف ہوتا ہے اور ہر کسی کے علم میں ہوتا ہے کہ مخاطب کو بھی "أَلَمْ تَرَ" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے گویا وہ اسکا مشاہدہ کر چکا ہے۔

سوال: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ اصحاب الفیل کون تھے ان کے حملے کا مختصر پس منظر بیان کریں۔

جواب: اصحاب الفیل کا سردار "ابرہہ" یمنی حبشی فوج کا سربراہ نیز یمن کا حکمران تھا۔ بعض معاشی اور مذہبی حالات کے پیش نظر اس نے بیت اللہ پر حملہ کیا تھا دراصل وہ بیت اللہ کی وجہ سے اہل مکہ کی سیادت ختم کر کے یمن میں بیت اللہ کے بالمقابل قبلہ تعمیر کرنا چاہتے تھے نیز حجاز پر قبضہ کر کے یہاں کی بندرگاہ کے ذریعے مشرقی ممالک میں اپنی تجارت کا فروغ

چاہتا تھا۔ اسی لئے 570ء یا 571ء میں ابرہہ نے ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تھا۔ (تفہیم)

سوال: کیا قریش کی طرف سے اصحاب الفیل کے مقابلے میں کوئی مزاحمت کی گئی؟

جواب: بعض اصحاب کے ہاں قریش جیسی بہادر اور جفاکش قوم سے کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ کعبۃ اللہ کے دفاع کے لئے انکی طرف سے کوئی مزاحمت سامنے نہ آئی ہو خصوصاً جب عام عرب قبائل نے بھی اصحاب الفیل کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہو تو غیرت مند عرب کیسے پیچھے رہ سکتے تھے؟

مذکورہ بالا جذباتی اور عقیدت مندانہ باتوں سے قطع نظر حقائق کچھ اور بتاتے ہیں۔ قرآنی اسلوب، تاریخی روایات اور بالخصوص مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق نظر آتی ہے کہ قریش نے اصحاب الفیل کے مقابل لڑائی نہیں کی۔

عبدالمطلب نے اصحاب الفیل کو سمجھانے کی کوشش ضرور کی لیکن جب وہ اپنے ارادے پر مصر نظر آئے تو عبدالمطلب نے کعبۃ اللہ میں کچھ سرداروں کے ہمراہ جا کر دعا کی اور لوگوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے گئے انکی خالص دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے ذریعے اصحاب الفیل کو ہلاک کر دیا۔

ویسے بھی غزوہ احزاب کے موقع پر قریش کل دس ہزار کی جمعیت لا سکے جبکہ اصحاب الفیل کا واقعہ تقریباً ایک نصف صدی قدیم تھا ایسی صورتحال میں قریش اصحاب الفیل کی ساٹھ ہزار فوج کا کیسے مقابلہ کر سکتے تھے؟ (تفہیم)

سوال: ﴿اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِىْ تَضْلِيْلٍ﴾ "تَضْلِيْلٍ" کا لغوی مفہوم واضح کرتے ہوئے بتائیں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کی تدبیر اور حملے کو کیسے بے کار کیا؟

جواب: تَضْلِيْل: ضَلَّلَ يُضَلِّلُ تَضْلِيْلًا سے مصدر ہے۔ "تَضْلِيْلٍ" کا معنی ہے بے راہ کرنا، غلط کرنا اور کسی تدبیر کو ناکام کرنا۔ مادہ: ض، ل، ل۔

اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ کے لئے چھوٹے چھوٹے پرندے بھیجے جنہوں نے اس لشکر پر کنکر گرائے جس کو وہ کنکر لگتا اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا اس طرح وہ بھاگنے لگے کچھ لوگ وہیں مر گئے، کچھ بھگدڑ میں مر گئے اور کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اگلے علاقوں میں جا کر ہلاک ہو گئے اور یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان، وادی محصب کے قریب محسّر کے علاقے میں پیش آیا تھا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ "اَبَابِيْلَ" کی لغوی وضاحت کریں نیز بتائیں "طَيْرًا" اور "اَبَابِيْلَ" مفرد ہیں یا جمع، مذکر ہیں یا مؤنث؟

جواب: امام فراء اور ابوعبیدۃ کے ہاں "أبابیل" اسم جمع ہے جس کی واحد نہیں جبکہ زمخشری کے ہاں "أبابیل" کی واحد "أبالۃ" ہے۔ اس کا معنی جماعتیں اور جھنڈ ہیں اگر یہ گھوڑوں کیلئے استعمال ہو تو اس کا معنی جماعتیں، اگر چڑیوں کیلئے استعمال ہو تو جھنڈ ہے۔ "أبابیل" مؤنث ہے۔ جبکہ "طَيْرًا" واحد، جمع اور مذکر ومؤنث ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

سوال: ﴿وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جھنڈ اصحاب الفیل پر کیوں بھیجے تھے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کی تباہی کیلئے پرندوں کے جھنڈ بھیجے جو کہ اصحاب الفیل پر کنکریاں گرا رہے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾

بعض احباب کا مؤقف ہے کہ سنگ ریزے قریش کے لوگوں نے ابرہہ کے لشکر پر برسائے تھے۔ کیونکہ رَمْی کا لفظ صرف اس وقت استعمال ہوتا ہے جب پھینکنے میں بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہوا ہو یا ہوا کے تند وتیز تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔ چڑیوں کے لئے یہ لفظ کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ پرندے تو فقط اصحاب الفیل کی لاشیں کھانے کے لئے آئے تھے انکی ہلاکت کے لئے نہیں۔ یہ مؤقف حقائق وواقعات کے کسی طرح بھی موافق نہیں ہے۔ اول تو "تَرْمِيْهِمْ" کی ضمیر ان کے مؤقف کے مخالف ہے۔ دوئم: قرآن پاک میں کسی جگہ یہ ذکر نہیں کہ پرندے لاشوں کو کھانے کے لئے آئے تھے۔ سوئم: تمام تاریخی واقعات سے بھی اس مؤقف کی تردید ہوتی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: تفہیم، طبری، التحریر اور دیگر تفاسیر وتاریخی کتب)

سوال: ﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ "تَرْمِيْهِمْ" میں فاعل کی ضمیر کا مرجع ذکر کریں۔

جواب: "تَرْمِيْهِمْ" میں فاعل کی ضمیر "هِيَ" ہے اور اس کا مرجع "طَيْرًا" ہے۔ بعض کے ہاں اس کا مرجع فردًا فردًا افراد قریش ہیں لیکن یہ مؤقف سیاق کلام کے مخالف ہے۔

سوال: ﴿تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ "سِجِّيْلٍ" کی لغوی اور صرفی وضاحت کریں۔

جواب: "سِجِّيْلٍ" کی نسبت مختلف اقوال منقول ہیں۔

۱۔ یہ فارسی زبان کے "سنگ گل" سے معرب ہے جس کا معنی "آگ میں پکی ہوئی مٹی یعنی کھنگر" ہے۔ یہ قول عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔

۲۔ جس طرح "سجین" جہنمیوں کے اعمال کی جگہ ہے اسی طرح "سِجِّيْلٍ" وہ جگہ ہے جہاں ان کے متعلق عذاب لکھے ہوئے ہیں۔

۳۔ "سِجِّيْلٍ" "سِجِلٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی "بڑا ڈول" ہے۔ یعنی جس طرح بڑے ڈول سے مسلسل اور کثرت کے

ساتھ پانی بہتا ہے اسی طرح ان پر بھی عذاب اسی طرح آیا تھا۔

۴۔ "سِجِّيلٍ" "سَجَلَ يَسْجُلُ" سے ہے جس کا معنیٰ "مسلسل چھوڑنا، ڈالنا اور اوپر سے پھینکنا" ہے۔ یعنی ان پر اوپر سے پتھر برابر برسائے گئے۔ (روح، کشاف، التحریر، قاموس)

سوال: ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ﴾ "كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "عَصْف" کھیتی کے پتوں کو کہا جاتا ہے۔ یہ اسم ہے جبکہ صاحب التحریر نے اسکو اسم جمع لکھا ہے۔

مأكول: "أَكَلَ يَأْكُلُ أَكْلًا" (ن) سے واحد مذکر اسم مفعول ہے۔ "کھایا ہوا"

اصحاب الفیل کو ہلاکت کے بعد "عصف مأکول" سے مشابہت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ عذاب کے نزول کے بعد اس طرح بکھرے ہوئے تھے جس طرح جانور بھس کھا کر لید کرتا ہے اور وہ خشک ہو کر ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ یا جس طرح پتے پہلے سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور جانور پتوں کے بعض حصوں کو کھاتے ہیں اور باقی کو زمین پر گرا کر روندھ ڈالتے ہیں اور وہ بری حالت میں ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں اسی طرح وہ اصحاب الفیل بھی قوت کے بعد زمین پر بری حالت میں ہلاک ہوئے پڑے تھے۔ (روح، التحریر)

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ① اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ② فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا
الْبَيْتِ ③ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ④

سوال: اس سورت کا ماقبل سورت سے تعلق واضح کریں۔

جواب: سابقہ سورت میں اللہ رب العزت نے قریش کو اپنا احسان یاد دلایا کہ کس طرح اس نے اصحاب الفیل کو ناکام بنایا اور کس طرح اس واقعہ کے بعد پورے عرب میں تمہارے رعب کی دھاک بیٹھی۔ اس سورت میں بھی ایک عظیم احسان کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اللہ رب العزت نے کس طرح تم منتشر لوگوں کو یکجا کیا، تمہاری نااتفاقی کو اتفاق و اتحاد میں تبدیل کیا، جہاں ہر طرف بدامنی تھی تمہیں امن دیا اور ہر طرف فقر و فاقہ اور بھوک و افلاس تھی تمہیں بہترین رزق اور کھانا مہیا کیا۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ پر اپنے عظیم انعامات کا تذکرہ کیا ہے۔

پہلا انعام واحسان تو یہ کہ ان کے دل میں سفر کی محبت ڈال دی کہ وہ اپنی معیشت کے استحکام کیلئے گرمی میں شام کی طرف اور سردی میں یمن کی طرف سفر کرتے ہیں۔

دوسرا احسان یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انکو ہر قسم کے پھلوں سے نوازا اور طرح طرح کی نعمتیں دیں کہ لوگ حج اور عمرہ کیلئے آتے ہوئے دنیا بھر سے یہاں سامان لاتے جس سے قریش کے کھانے کی تمام حاجات پوری ہوتی رہتی تھیں اور انکو بھوک و افلاس کی پرواہ نہ ہوتی تھی۔

تیسرا احسان یہ کیا کہ ان کو بدامنی اور پرخطر حالات میں امن وامان سے نوازا کہ نہ تو کوئی ان پر حملہ آور ہوتا اور نہ ہی کوئی ان کے تجارتی قافلوں کو لوٹتا۔

لہٰذا ان احسانات کا یہ تقاضا ہے کہ قریش مکہ جن کو یہ سبھی کچھ بیت اللہ کی برکت سے اور اپنے رب کے عطیہ سے نصیب ہوا وہ صرف اس گھر کے رب کی عبادت کریں جو وحدہ لاشریک ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم، المنیر)

سوال: اس سورت کا نہایت سلیس ترجمہ کریں۔

جواب: چونکہ قریش مانوس ہوئے، (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟

جواب: اس بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد والی آیت میں "فليعبدوا" کے متعلق ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سورہ کی آخری آیت میں "فجعلهم" کے ساتھ ہے۔ یہ حضرات بوجوہ ان دونوں سورتوں کو ایک سورت شمار کرتے ہیں۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ الگ الگ دو سورتیں ہیں اس پر تواتر اور اجماع امت دال ہے۔

سوال: ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ میں لام کس معنی میں ہے؟

جواب: یہ علت کے معنی ادا کر رہا ہے۔ "أي من أجل إيلاف قريش" اور بعض نے اس سے تعجب کے معنی لئے ہیں یعنی "أعجبوا لإيلاف قريش وتركهم عبادة رب هذا البيت"۔ (اعراب)

سوال: ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ "إيلف" کیا صیغہ ہے؟ مکمل تعلیل کریں اور معنی بھی ذکر کریں۔

جواب: إيلاف: باب افعال "أَلَفَ يُؤْلِفُ" سے مصدر ہے۔ اس کی اصل أألف يؤلف إئلافا۔ مادہ: ء، ل، ف۔

إئلاف: ہمزہ ساکن ماقبل مکسور، اس لئے ہمزہ ساکنہ کو ماقبل کی حرکت کے موافق حرف علت سے بدلا، إيلاف بن گیا۔

معنی: إيلاف الف سے ماخوذ ہے جس کے معنی "خوگر ہونا، مانوس ہونا، پھٹنا اور مل جل جانا" ہے۔ اردو زبان میں الفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔

سوال: ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ قریش کون لوگ ہیں اور کس شخص کی بدولت انکو یہ لقب حاصل ہوا؟

جواب: قریش وہ لوگ ہیں جو نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ اور بعض محققین فہر کی اولاد سے شروع کرتے ہیں۔ حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں:

أما قريش فالأصح فهر جماعها والأكثرون النضر

انہی مذکورہ بالا شخصیات کی بدولت باختلاف روایت ان لوگوں کو یہ لقب حاصل ہوا تھا۔ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، چونکہ فہر کے بیٹے قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا تھا اس لئے ان کو قریش کہا جاتا ہے، بعض کے نزدیک قریش قرش

کی تصغیر ہے، قرش ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے اور کشتیوں پر بھی حملہ کرتی ہے، چونکہ قصی بڑے سردار تھے اس لئے ان کو مچھلی سے تشبیہ دی ۔ امام سہیلی کے نزدیک یہ قبیلہ کا نام ہے جس طرح عرب اپنے قبائل کے نام جانوروں کے نام پر رکھتے تھے جیسے اسد، نمر وغیرہ۔ (سیرۃ النبی از شبلی نعمانی: 110/1 حاشیہ)

سوال: ﴿اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ "إيلافهم" اور "رحلة" کی وجہ اعراب ذکر کریں۔

جواب: "إيلافهم" پہلے "إيلاف" سے بدل ہے اور "رحلة" "إيلاف" مصدر کا مفعول بہ ہے۔ اور هم ضمیر یہاں فاعل کے مقام پر ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ "الشتاء" کی صرفی تحلیل کریں اور معنی ذکر کریں۔

جواب: یہ شتا یشتو سے مشتق ہے۔ اس کی اصل "شتاو" ہے۔ واؤ کو ہمزہ سے بدلا کیونکہ وہ کلمہ کے آخر میں واقع ہے اور اس سے قبل الف ساکن ہے۔ (اعراب) اور اس کا معنیٰ "سخت جھاڑے کے دن" ہیں۔

سوال: ﴿اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ کی وضاحت کریں۔

جواب: اس آیت کے مفہوم کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا تاریخی پس منظر پیش نگاہ ہو۔ جس طرح اوپر ایک سوال کے جواب میں گزر چکا ہے کہ قریش بنو اسماعیل تھے اور یہ سب لوگ کعبۃ اللہ سے دور دور رہا کرتے تھے۔

سب سے پہلے قصی بن کلاب نے تمام منتشر لوگوں کو کعبۃ اللہ کے گرد جمع کیا۔ اس لئے قصی مُجَمِّع سے بھی ملقب ہیں۔ اس شخص نے ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی اور تمام حاجیوں کی اعلیٰ خدمات کے لئے جو ممکن تھا کرتا تھا۔ اس کی حسن تدبیر کی وجہ سے کل عرب کے دلوں میں تمام قریش کی عظمت اور دھاک بیٹھ گئی ۔ قصی نے مرتے وقت حرم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو دے دیے۔ قصی کی قدر و منزلت کی وجہ سے اس وقت تو وصیت کے مطابق عبدالدار کو ہی تمام منصب ملے لیکن بعد میں عبد مناف کے بیٹوں نے عبدالدار کی اولاد سے منصب واپس لینے چاہے تو جنگ شروع ہونے لگی لیکن پھر اس بات پر صلح ہوئی کہ عبد مناف کے بیٹے ہاشم کو سقایہ اور رفادہ دے دیے جائیں۔ سب سے پہلے ہاشم (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا) کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینا چاہیے جو عرب کے راستے سے بلاد مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی۔ اور ان بازاروں سے اپنی شہری ضروریات کا سامان بھی لانا چاہیے تاکہ راستے میں جو قبائل ہیں وہ ان سے سامان خرید یں۔

اس خیال سے ہاشم نے تجارت شروع کی۔ باقی عرب کی نسبت قریش کو یہ خاص عظمت حاصل تھی کہ یہ خدام حجاج اور کعبۃ

اللہ کے متولی تھے اور ان کی حجاج کی مہمان نوازی پر تمام نازاں تھے اور ان کو عزت و شرف کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لئے ان کو اس بات کا کوئی کھٹکا نہ تھا کہ ان کا مال لوٹ لیا جائے گا یا ان سے راہ گزر کا ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ اس امر سے یہ بالکل بے خوف تھے۔

اس لئے ہاشم نے ان تمام پہلوؤں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے یہ اسکیم بنائی کہ اپنے اس پروگرام میں اپنے تینوں بھائیوں کو بھی شامل کر لے۔ چنانچہ شام کی طرف ہاشم نے، عبد شمس نے حبش کی جانب اور مطلب نے یمن کی طرف اور نوفل نے عراق و فارس کی طرف تجارتی سفر شروع کئے۔ اس پیشہ کی بنا پر یہ چاروں بھائی متجرین کے لقب سے مشہور ہوئے اور تمام عرب اور دوسرے ممالک کے روابط سے ان کو اصحاب الایلاف بھی کہا جاتا تھا۔ جس کے معنی الفت پیدا کرنیوالے کے ہیں۔

اس تجارت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ قریش مال و ثروت اور عظمت و شرف کے لحاظ سے کل عرب پر فوقیت لے گئے۔ قریش روز بروز ترقی کی راہ پر آگے بڑھتے جاتے تھے کہ ابرہہ نے کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی مذموم سعی کی۔ اللہ رب العزت نے ابابیل کے ذریعے اس کی ساٹھ ہزار فوج۔ کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس واقعہ نے قریش کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے کہ واقعۃ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور پیارے ہیں۔ اس تاریخی پس منظر سے آشنائی کے بعد آیت پر غور کی نگاہ ڈالنی چاہئے۔ اور دیکھئے کہ اللہ جل شانہ نے کس بلاغت کے ساتھ چند جملوں میں صدیوں پر محیط تاریخ ان کے سامنے بطور دلیل پیش کی ہے کہ تم سخت جاڑے کے دنوں میں اور گرمی کے ایام میں یعنی پورا سال اس اللہ کے گھر کی ہمسائیگی کی بدولت تجارت کرتے ہو۔ یہ لوگ سردیوں کے دنوں میں عرب کے جنوبی جانب رخت سفر باندھتے تھے اور گرمی کے دنوں میں اپنے تجارتی قافلوں کا رخ شام و فلسطین کی جانب کرتے تھے۔ (تفہیم، سیرۃ النبی از شبلی نعمانی: 111/1)

سوال: ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ "فلیعبدوا" میں ف کس معنی میں استعمال ہوئی ہے؟

جواب: یہ محذوف شرط کے جواب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: إن لم يعبدوه لأية نعمة فليعبدوه لإيلافهم فإنها أظهر نعمة۔ (اعراب)

سوال: ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ "جوع" اور "خوف" کی وضاحت کریں۔

جواب: "جوع" سے مراد کسی علاقہ کی وہ خاص حالت ہے جو غذائی اشیاء و اجناس کی قلت یا نایابی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح "خوف" سے کسی علاقہ کی وہ حالت مراد ہے جو امن و امان کے فقدان اور جان و مال کے عدم تحفظ سے رونما ہوتی ہے۔ (تدبر)

سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى
طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: سابقہ سورت میں اللہ رب العزت کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کے لیے قریش کو ابھارا ہے اور اس سورت میں اس شخص کی مذمت بیان کی گئی ہے جو ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اور مساکین پر دست شفقت نہیں رکھتا۔

(۲) سابقہ سورت میں اللہ رب العزت نے قریش کو حکم دیا کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں۔ اور اس سورت ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو نماز سے غافل اور نماز سے روکنے والے ہیں۔

(۳) ماقبل سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنی عظیم نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ وہ آخرت کے انکاری اور اخروی جزاو سزا کے منکر تھے اور اس سورت میں ان لوگوں کو عذاب سے ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے۔ (المنیر)

سوال: سورۃ الماعون کا بنیادی موضوع و مضمون ذکر کریں۔

جواب: اس سورۃ کا موضوع اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان میں کس طرح کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ جب انسان آخرت کا منکر ہو جاتا ہے تو وہ یتامی اور مساکین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ اخلاص کی بجائے ریاکاری کا عادی ہو جاتا ہے۔ گویا حقوق اللہ کا لحاظ رکھتا ہے اور نہ ہی حقوق العباد کا۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ﴾ "اَرَءَيْتَ" کا اطلاق کس معنی پر ہوتا ہے؟

جواب: اَرَءَيْتَ کا لغوی معنی ہے کیا آپ نے دیکھا۔ لیکن مفہوماً اس کا اطلاق تعجب وغیرہ کے معنی پر یا علم ومعرفت کے معنی پر ہوتا ہے۔ یعنی کیا آپ کو علم ہوا یا کیا آپ جانتے ہیں؟ وغیرہ۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ﴾ میں "الدین" کس معنی میں ہے؟

جواب: ''الدین'' جزاء اعمال کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور دین اسلام کے لئے بھی۔ اس آیت مبارکہ میں بھی دونوں معانی کا احتمال موجود ہے اور دونوں مفہوم درست ہیں۔ (تفہیم)

سوال: ﴿فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ ''یَدُعُّ الْیَتِیْمَ'' کا مفہوم بیان کریں۔

جواب: ''یَدُعُّ الْیَتِیْمَ'' کا معنی ہے کسی کو بے رحمی کیساتھ دھکے دینا، یتیم کو بے رحمی کیساتھ دھکے دے کر نکال دینا۔ اس کو وراثت سے محروم کر دینا۔ اس کا حق مار کھانا۔ اگر طلب مدد کے لئے آئے تو بے رحمی سے نظر انداز کر دینا وغیرہ۔ (تفہیم، التحریر)

سوال: ﴿فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ ''اَلْیَتِیْمَ'' کی لغوی واصطلاحی تعریف کریں۔

جواب: اَلْیَتِیْم: اَلْیُتْمُ اکیلا اور تنہا، جس کا باپ نہ ہو اور جانوروں میں اسے یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو، انسانوں میں جس کی ماں نہ ہو اسے یتیم نہیں کہتے۔ جس کا باپ نہ ہو اسے یَتِیْمٌ اور جس کی والدہ نہ ہو اسے عَجِیٌّ اور جو دونوں کو مفقود پائے اسے اَللَّطِیْم کہتے ہیں۔ (لسان)

اصطلاحی تعریف: ''مَنْ مَاتَ أَبُوْهُ وَهُوَ دُوْنُ الْبُلُوْغِ لِحَدِیْث لاَ یُتْمَ بَعْدَ احْتِلاَمٍ'' (وقال الھیثمی فی مجمع الزوائد: ۴/ ۲۶۶: رجالہ ثقات وصححہ الالبانی فی الارواء: ۱۲۴۴)۔ ایسا نابالغ لڑکا یا لڑکی جس کا والد وفات پا جائے۔ کیونکہ حدیث میں ہے: بلوغت کے بعد یتیمی نہیں رہتی۔

سوال: ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ﴾ کیا طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ اور إطعام المسکین میں کوئی فرق ہے؟ نیز اس سورت میں طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ کہنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: إطعام المسکین کا معنی مسکین کو کھانا کھلانا اور طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ کا معنی مسکین کا کھانا ہے۔ نیز اس سورت میں طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ کہنے کی حکمت یہ ہے کہ ایسے افراد کی مذمت بیان کی جائے جو یتیم کو اسکا اپنا حق دینے پر بھی راضی نہیں اور لوگوں کو یتیم کا حق دینے پر اکساتے بھی نہیں۔ بعض علماء کے ہاں یہاں طَعَام اطعام کے معنی میں ہے۔ (تفہیم، التحریر)

سوال: ﴿فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ﴾ ''ویل'' کا معنی ومفہوم ذکر کریں۔

جواب: ''ویل'' کا لغوی معنی ہلاکت، بربادی اور تباہی وغیرہ ہے۔ درحقیقت یہ کلمہ عذاب اور بددعا کے لئے مستعمل ہے جیسا کہ کئی اور مقامات پر بھی ہے۔ ﴿وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ﴾ (المرسلات: ۱۵) جھٹلانے والوں کے لئے ہلاکت ہو۔

سوال: ﴿عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ اور ﴿فی صلاتھم ساھون﴾ میں فرق واضح کریں۔

جواب: ''فی صلاتھم ساھون'' کا مطلب ہے نماز میں بھول جانا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں اور نہ ہی یہ قابل گرفت گناہ

ہے۔جبکہ "عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" کا مطلب ہے نمازوں سے غفلت برتنا۔ یہ بڑا گناہ ہے اور قابل مؤاخذہ فعل ہے۔ اسکی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً کبھی نماز پڑھ لی کبھی نہ پڑھی، یا عادت بنالینا کہ بالکل آخری وقت میں چار ٹھونگیں مار لینا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ ہے:"تلك صلوة المنافق، تلك صلوة المنافق، تلك صلوة المنافق يجلس احدهم حتى إذا اصفرت الشمس فكانت بين قرني الشيطان او على قرني الشيطان قام فنقر أربعا لا يذكر الله فيها إلا قليلا۔ (ترجمہ: یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، ایک شخص (جوکہ) بیٹھا رہتا ہے یہاں تک کہ سورج زرد ہو جاتا ہے اور شیطان کے دوسینگوں کے درمیان ہوجاتا ہے یا سینگوں پر ہوجاتا ہے تو وہ اٹھتا ہے، چار ٹھونگے مارتا ہے، نماز میں اللہ کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہے۔(ابوداؤد: ۴۱۳، مسلم: ۱۴۴۳، واللفظ لابی داؤد)

نیز نمازوں کی ادائیگی میں سستی کرنا نیز بددلی کیساتھ نماز کے لئے آنا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (ترجمہ: اور وہ نمازوں کو نہیں آتے مگر اس حالت میں کہ وہ سست ہوتے ہیں)(التوبۃ: ۵۴) اگر کبھی موقع مل جائے یا فرصت مل جائے تو پڑھ لینا یا اس طرح پڑھنا کہ مکمل نماز میں دھیان کسی اور طرف رہے یا کسی اور خیال میں نماز گزار دینا وغیرہ سبھی اس میں شامل ہے۔(تفہیم)

سوال: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ﴾ کا تعلق کس جملے کیساتھ ہے؟

جواب: یہ جملہ "المصلین" کی صفت ثانی ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

سوال: درج ذیل صیغے بتائیں۔

يَدُعُّ، يَحُضُّ، سَاهُوْنَ، يُرَاؤُوْنَ۔

جواب: يَدُعُّ: "دَعَّ يَدُعُّ دَعًّا" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مضاعف ثلاثی۔ مادہ: د، ع، ع۔ معنی: وہ دھکے دیتا ہے۔

يَحُضُّ: "حَضَّ يَحُضُّ حَضًّا" (ن) سے واحد مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مضاعف ثلاثی۔ مادہ: ح، ض، ض۔ معنی: وہ ترغیب دیتا ہے، ابھارتا ہے۔

سَاهُوْن: "سَهَا يَسْهُوْ سَهْوًا" (ن) سے جمع مذکر اسم فاعل ہے۔ ناقص واوی۔ مادہ: س، ہ، و۔ معنی: غافل لوگ، بھولنے والے۔

يُرَاؤُوْن: باب مفاعلہ "رَاءَا يُرَاءِيْ مُرَاءَةً" سے جمع مذکر غائب مضارع معروف ہے۔ مادہ: ر، ا، ی۔ مہموز العین اور ناقص یائی۔ معنی: دکھاوا کرتے ہیں، ریا کاری کرتے ہیں۔

سوال: ﴿وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ﴾ "الْمَاعُونَ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: تھوڑی، معمولی اور ہر منفعت والی چیز کیلئے "مَعْنٌ" استعمال ہوتا ہے۔ ماعون کا مادہ بھی معن ہے گویا ہر منفعت والی چھوٹی موٹی چیز ماعون کہلاتی ہے جو استعمال سے گھستی نہیں جیسے چھری، کلہاڑی، چارپائی وغیرہ اور یہ چیزیں عموماً پڑوسی عاریتاً ایک دوسرے سے لے لیتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر زمانے میں مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ (اعراب)

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

سوال: سابقہ سورۃ سے اس سورت کا تعلق ظاہر کریں۔

جواب: سابقہ سورت میں کفار ومنافقین کی چار صفات بیان کی گئی ہیں: البخل، ترك الصلاة، الرياء، منع الخير والزكاة۔
اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے میں چار محمود صفات ذکر کی ہیں: فرمایا ہم نے آپ کو کوثر عطا کی یعنی دائمی خیر کثیر، آپ زیادہ سے زیادہ تقسیم کیجئے، بخل مت کیجئے اور نماز پر مواظبت اختیار کریں اور لربك سے اخلاص کی تاکید کی گئی نہ کہ نمود ونمائش کے لیے۔ اور آپ کو انْحَرْ سے صدقہ کا حکم دیا جو وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ کے مقابلہ میں ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کثیر کے عطیہ کی نعمت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں حوض کوثر بھی شامل ہے۔
اس نعمتِ عظمیٰ کے شکرانے کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رب کیلئے نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔
اور آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ یقیناً آپ ہی غالب ہوں گے اور آپ کا دشمن ذلیل ورسوا ہوگا جس کا بعد میں کوئی اچھے الفاظ میں تذکرہ بھی نہیں کرے گا۔ (المنیر)

سوال: ﴿اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ کا محل اعراب ذکر کریں۔

جواب: جملہ ﴿اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ "اِنَّ" کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سوال: ﴿اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ "الکوثر" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "الکوثر" کے حرف اصلی ک، ث، ر ہیں۔ صاحب تحریر کے ہاں "فَوْعَلٌ" کا وزن اکثر اسم جامد کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کوکب، جورب وغیرہ۔
تاہم اس میں مبالغہ کا معنی موجود ہے یعنی اس کا لغوی معنی ہوگا "بڑی کثرت اور بڑی برکت والا" اسی وجہ سے عربی میں صاحب ثروت کو بھی "کوثر" سے ملقب کیا جاتا ہے۔ (التحریر، تدبر، لسان)

سوال: ﴿اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ﴾ میں "الۡكَوۡثَرَ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: کوثر کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بصراحت کئی احادیث میں منقول ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسمان کی طرف لے جایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں جنت میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک نہر آ گئی جس کے کنارے کھوکھلے موتیوں کے قبے تھے، میں نے کہا جبریل یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا یہ کوثر ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی ہے، پھر دیکھا تو اس کی مٹی یا خوشبو مہکنے والی کستوری کی طرح تھی۔ (بخاری: باب فی الحوض وتفسیر الکوثر)

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوض کو بھی کوثر کہا گیا ہے۔ تاہم "الۡكَوۡثَرَ" کی یہ ایک تصویر ہے جب کہ کوثر کے مفہوم میں وہ تمام خیر کثیر شامل ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کی گئی۔ یہ مفہوم بعض جلیل القدر صحابہ کرام اور تابعین عظام سے بھی منقول ہے۔ (طبری، التحریر)

سوال: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ﴾ میں کیا کوئی خاص نماز پڑھنے کا حکم ہے؟

جواب: بعض ائمہ نے اس سے مراد عید کی نماز لی ہے لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر ہی باقی رکھا جائے کیونکہ اس وقت عرب اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور انہی کے آستانوں پر قربانیاں کرتے تھے۔ اس لیے حکم دیا کہ تمہاری نماز اور قربانی خالصۃً اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِيۡ وَنُسُكِيۡ وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِيۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (ترجمہ: کہہ: بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے) (الانعام: ۱۶۲) (طبری، ابن کثیر، تفہیم)

سوال: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ﴾ "انحر" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: "انحر" "نحرٌ" سے مشتق ہے جو کہ اصلاً لغت میں "اونٹ کو گلے میں نیزہ مار کر ذبح کرنے" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اپنے عام استعمال میں دوسرے چوپائے کی قربانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قاموس، تدبر، انوار)

سوال: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ﴾ قربانی کے لیے "انحر" کے لفظ استعمال کرنے میں حکمت ہے؟

جواب: اہل عرب کے ہاں اونٹ سب سے زیادہ معزز تھا، اس لئے خیر کثیر کے عطیہ کے ذکر کے بعد اونٹ کو راہ الٰہی میں نحر کرنے کا حکم دیا تا کہ نعمت عظمی کے شکرانے کے طور پر قربانی کر کے نفس کو دنیاوی لذات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس لفظ (نحر) کے استعمال سے مقصود ابراہیمی قربانی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ اونٹ کی قربانی ملت ابراہیم میں ایک محبوب قربانی تھی جس کو یہود نے اپنی بدعتوں کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا۔ (تدبر)

سوال: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ کیا "انحر" سے مراد نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ہیں؟

جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ قول منسوب ہے۔لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت تو ضعیف ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو "منکر جدًا" کہا ہے اور فرمایا ہے کہ "وكل هذه الأقوال غريبة جدا والصحيح القول الأول أن المراد بالنحر ذبح المناسك" کہ یہ تمام اقوال انتہائی غریب ہیں اور پہلا قول درست ہے کہ نحر سے قربانی کرنا ہی مراد ہے۔(تفسیر ابن کثیر مع تخریج عبدالرزاق المهدی)

سوال: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ عام طور پر قرآن میں صلاۃ کے ساتھ زکوۃ کا ذکر ہوتا ہے یہاں قربانی کا ذکر کیونکر ہوا؟

جواب: چونکہ پہلی آیت میں "الکوثر" (خیر کثیر) کا تذکرہ کیا ہے اسی مناسبت سے بعد میں نماز کے ساتھ نحر کا حکم دیا ہے۔کیونکہ عرب کے ہاں اونٹ کو سب سے بہتر مال سمجھا جاتا تھا اس لئے خیر کثیر کے مقابلے میں شکرانے کے طور پر خیار أموال العرب کو نحر کرنے کا حکم دیا۔(واللہ اعلم بالصواب)

سوال: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ "شانئك" کی لغوی وضاحت کریں نیز بتلائیں کہ کیا اس سے کوئی خاص شخص مراد ہے یا یہ عام ہے؟

جواب: شانئ: شَنَأَ يَشْنَأُ شَنْأً (ف) سے واحد مذکر اسم فاعل ہے، جس کے معنی بغض رکھنا اور نفرت کرنا ہے۔(قاموس)
﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ کہ اولین مخاطب اگرچہ قریش مکہ کے بعض سردار ہیں لیکن اس کا مفہوم عام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہر بغض رکھنے والے چاہے وہ کسی بھی زمانے سے تعلق رکھنے والا ہو وہ بے بنیاد، دم کٹا اور ابتر ہی ہے۔

سوال: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ "هو" ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے؟

جواب: "هو" ضمیر منفصل تاکید کیلئے ہے اور زائدہ ہے اور "إنّ" کی خبر "الأبتر" ہے۔ یا پھر "هو" ضمیر مبتدا، "الأبتر" خبر ہے اور جملہ اسمیہ "إن" کی خبر ہے۔(اعراب، روح)

سوال: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ کا سلیس ترجمہ کریں نیز "أبتر" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: بے شک تیرا دشمن بے اولاد ہی تو ہے۔الأبتر: "بَتَرَ يَبْتُرُ بَتْرًا" (ن) سے صفت مشبہ ہے۔(اعراب)
بَتَرَ کا اصل معنی تو "کاٹنا" ہوتا ہے اسی سے بعد میں یہ لفظ اس جانور کیلئے بولا جانے لگا جس کی دم کٹی ہوتی تھی۔اسی سے استعارۃً اس شخص کو کہا جانے لگا جو شخص خیر سے محروم ہوتا تھا اور عرب جس شخص کی اولاد نہ ہوتی تھی اسکو ابتر اس لئے کہتے تھے کہ اس کا بھی مستقبل کٹا ہوا ہے، بعد میں اس کا کوئی تذکرہ کرنے والا نہیں ہے۔اسکی دم کٹی ہوئی ہے۔(روح، التحریر)

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَاۤ اَنَا
عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: سورۃ الکوثر میں پیارے حبیب ﷺ کو اخلاص سے بھرپور عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔اس سورت میں اس بیان کو مزید کھولا گیا ہے۔توحید کا ڈنکے کی چوٹ اعلان اور شرک سے اعلانیہ بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔جس سے اخلاص میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔(المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں کفار کے دین اور ان کے معبودوں کی پرستش سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے۔صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت اور اس معاملے میں مداہنت یا مصالحت کی تمام زنجیروں کو کاٹا گیا ہے۔اور یہ بتلایا گیا ہے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں،ان کے باہم ملنے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔(تفہیم،المنیر)

سوال: اس سورت کی فضیلت میں صحیح احادیث ذکر کریں۔

جواب: حارث بن جبلہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ سکھلا دیجئے جو میں سوتے وقت پڑھوں،آپ ﷺ نے فرمایا: رات کے وقت جب تو اپنے بستر پر جائے تو ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھ، بے شک یہ سورت شرک سے بری کرنے والی ہے۔(احمد: ج ۳۹ ص ۴۴۰)

سوال: اس سورت کا شان نزول بیان کریں۔

جواب: طبرانی اور تفسیر ابن ابی حاتم وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ولید بن مغیرہ اور چند دیگر مشرکوں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دو اور اس طرح ہم باہم مل جل کر مکہ میں رہیں گے۔ایک سال تم ہمارے بتوں کی پوجا کر لیا کرو دوسرے سال ہم تمہارے اللہ کی بندگی کر لیا کریں گے،اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت

نازل فرمائی ۔ اگر چہ اس شان نزول کی روایت میں ایک راوی ابوحنیف عبداللہ ضعیف ہے، لیکن ﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ﴾ (ترجمہ: کہہ دیجئے کیا اللہ کے غیر کے بارے میں تم مجھے حکم کرتے ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، اے جاہلو!) (الزمر: ٦٤) کے مضمون سے اس شان نزول کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ قریش کی جس فرمائش کا ذکر اس شان نزول کی روایت میں ہے، آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے آپ ﷺ سے اس قسم کی فرمائش ضرور کی تھی۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ میں "قُلْ" کو صراحتاً ذکر کرنے کی وجہ بیان کریں۔

جواب: "قُلْ" کے بعد والے مقولہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے "قُلْ" کو صراحتاً ذکر کیا گیا ہے تا کہ مخاطب کلی طور پر متوجہ ہو جائے کہ اب ایسا کلام آرہا ہے جسکو خصوصیت اور توجہ سے سننا ہے۔ (التحریر)

سوال: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ "یٰٓاَیُّهَا المشرکون" کی بجائے "یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْن" کیوں کہا گیا؟

جواب: اسکی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔

۱۔ "یأیھا الکٰفرون" کے الفاظ میں مخاطب کر کے انکو زیادہ سرزنش کرنا مقصود ہے کیونکہ مشرکین مکہ کو جب کفر سے منسوب کیا جاتا تھا تو وہ اس کو برا محسوس کرتے تھے اور غصے میں آجاتے تھے۔ (التحریر، روح)

۲۔ "یأیھا الکٰفرون" اس لئے کہا کہ مخاطب صرف مشرکین نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ جو محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم وہدایت کو اللہ تعالیٰ کی تعلیم وہدایت ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ خواہ وہ یہود ونصاریٰ ہوں، مجوسی ہوں یا دنیا بھر کے کفار ومشرکین اور ملاحدہ ہوں۔ اس خطاب میں سبھی شامل ہیں۔ (تفہیم)

۳۔ "یأیھا المشرکون" کی بجائے "یأیھا الکٰفرون" اس لئے کہا کیونکہ درحقیقت شرک بھی کفر ہی ہے۔ دین میں ایمان صرف وہی معتبر ہے جو کامل توحید پر مبنی ہو، نہ تو اس میں اللہ کا انکار ہو اور نہ ہی اس میں دوسروں کی ملاوٹ ہو۔ قرآن کے فلسفہ ایمانی کی رو سے اللہ کا منکر اور اس کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کو شریک کرنے والا دونوں برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں ہی اللہ کے منکر یا دوسرے الفاظ میں کافر ہی ہیں۔

اس لئے قرآن کریم نے یہاں ان مشرکوں کو کافر کہہ کر اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ کسی درجے میں بھی کفر کے مقابلے میں اَہون یا قابل لحاظ ہے۔ (تدبر)

سوال: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: "يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" "قل" کا مقولہ ہونے کی بنا پر حالت نصب میں ہے۔

سوال: ﴿لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ﴾ میں کیا "لا" مضارع کو مستقبل کے معنی ادا کرنے کے لیے خاص ہے؟

جواب: جمہور علماء نحاۃ کے نزدیک "ما" مضارع کو حال کے معنی میں کرتا اور "لا" مضارع کو مستقبل کے معنی میں کرتا ہے۔ یہی رائے صائب معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس آیت میں مضارع سے حال کے معنی لیں تو آیت کا مفہوم اور مقصد واضح نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بات بداہۃً معلوم ہے کہ یہ لوگ اس بات سے کلی طور پر آشنا تھے کہ آپ ﷺ اور آپکے اصحاب ان معبودان باطلہ کی پرستش نہیں کرتے۔ اس پر یہ اعتراضات بھی وارد نہیں ہوتے اور سیاق کلام بھی اس کا مؤید ہے کیونکہ ﴿لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ﴾ کہہ کر در اصل یہ اعلان کیا ہے کہ جن کی تم عبادت کر رہے ہو انکی عبادت کی آئندہ بھی مجھ سے توقع نہ رکھنا۔

سوال: ﴿وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ﴾ کیوں کہا حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بھی عبادت کرتے تھے۔ اس نفی سے کون سی نفی مقصود ہے؟

جواب: اس نفی سے ان کے کل معبودان کی نفی مقصود ہے چاہے وہ ملائکہ، جن، سورج یا چاند ہو۔ مشرکین عرب اس اللہ کی عبادت کرتے تھے جسکی اولاد اور بیٹیاں تھیں، اسی طرح وہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ان معبودوں کو بھی اللہ وحدہ لاشریک کا شریک وسہیم مانتے تھے۔ وہ لوگ تمام مجموعہ معبودان میں سے ایک الٰہ اللہ تعالیٰ کو بھی مانتے تھے۔ ہر مؤمن ایسے شخص سے برأت کا اظہار ضرور کرے گا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اللہ معبودوں کے مجموعے میں سے ایک معبود نہیں بلکہ تنہا و یکتا معبود ہے۔ اور اس مجموعے کی عبادت سرے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں گو اس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآن حکیم نے اس بات کو کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے۔ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو۔ ﴿وَمَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ حُنَفَآءَ﴾ (ترجمہ: اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس حال میں کہ اس کے لئے دین کو خالص کرنے والے) (البینۃ: ۵)۔ اور فرمایا ﴿قُلۡ اِنِّىۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ﴾ (ترجمہ: کہہ بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اس حال میں کہ دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والا ہوں) (الزمر: ۱۱) (تفہیم)

سوال: ﴿لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ﴾ کیا "ما" مضارع کو حال منفی کے ساتھ مخصوص کرتا ہے؟

جواب: جمہور علماء کا مؤقف یہی ہے کہ ماجب مضارع پر داخل ہوتا ہے تب مضارع حال کے معنی ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں ہے: ﴿مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ﴾ (یونس: ۱۵) (ترجمہ: میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس (قرآن حکیم) کو اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں صرف وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے) اور سورۃ

المطففین میں ہے:﴿ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴾(المطففین:۱۲)(قیامت کے دن کی کوئی تکذیب نہیں کرتا بجز حد سے بڑھنے والے سخت گناہ گار کے)۔

اسی طرح مذکورہ آیت میں ہے:﴿ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴾اور تم اس کی عبادت کرنے والے نہیں ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

تفصیل کے طالب حضرات دراسات لأسلوب القرآن الکریم میں مذکورہ بحث دیکھیں۔

سوال:﴿ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴾میں "ما" کس معنی میں استعمال ہوا ہے اور کس حالت میں ہے؟

جواب: یہاں ما، من کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ یہاں ما کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف ہے۔

ما،عٰبدون کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے۔

سوال:﴿ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴾کی اعرابی حالت واضح کریں۔

جواب: اس کی اعرابی حالت کوئی نہیں۔(لا محل لها من الإعراب) کیونکہ اس کا عطف ماقبل آیت پر ہے اس کی اعرابی حالت جواب الندا ہونے کی بناء پر کچھ نہیں۔

سوال:﴿ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴾سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل دیں۔

جواب: اس آیت میں مستقبل کی یہ خبر سنائی گئی ہے کہ تم کبھی بھی ایمان کی دولت سے سرفراز نہیں ہو گے اور تم آخری سانس تک کفر پر رہو گے۔ چونکہ اس سے مخصوص کفار مراد ہیں، جیسا کہ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾(البقرۃ:٦) میں ہے۔ اس لئے یہ خبر صرف اور صرف اللہ کے نبی کی زبان اقدس سے جاری ہو سکتی تھی۔ لیکن عقل کل کا دعوی کرنے والے احمق اس سادہ سی خبر سے بے خبر رہے اور اس کلام حکیم کی تہ تک نہ پہنچ پائے۔ ابوالحکم کا لقب پانے والے بھی ابوجہل ہی رہے۔

سوال:﴿ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴾مکرر لانے کی توجیہ ذکر کریں۔

جواب: اس میں علماء کی آراء باہم مختلف ہیں۔ ان کی آراء کے ذکر کرنے میں گو طوالت کا خطرہ ہے لیکن برادران طلبۃ العلم کے افادہ کے لئے ہم ان کو ذکر کر دیتے ہیں۔ تا کہ تمام آراء میں سے جو مؤقف بدلائل ان کے دل کو بھائے اس کو علی وجہ البصیرۃ اختیار کر سکیں۔

ا:۔ پہلی رائے صاحب کشاف کی ہے اور متاخرین میں اہل رائے نے اس مؤقف کو ترجیح دی ہے کہ پہلی آیت "وَلَآ أَنتُمْ

﴿عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ﴾ مستقبل کے بارے میں ہے۔ اس رائے کے تناظر میں ترجمہ یوں ہوگا اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرو گے۔ دوسری آیت ماضی کی نفی کے لئے: اور نہ ہی تم نے اس ذات کی عبادت کی جس کی میں عبادت کرتا آرہا ہوں۔

۲:۔ دوسری رائے ان علماء کی ہے جو دوسری آیت کا مقصد مستقبل کی نفی قرار دیتے ہیں۔

ابن عطیہ فرماتے ہیں: ولا أنا عابد ما عبدتم أی أبدا وما بقیت۔ اور میں تا حیات تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کروں گا۔ "وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ حتما علیهم أنه لا یؤمنون به أبدا"۔

اس آیت سے ان پر مہر ثبت ہوگئی کہ وہ اپنی زندگی میں ایمان کی دولت سے سرفراز نہ ہوں گے۔

۳:۔ بعض گرامی قدر حضرات وہ ہیں جو اس کو محض تکرار گردانتے ہیں کہ عرب میں عام رواج یہ تھا۔ ممکن اور متوقع فعل کے لئے بلی بلی کے اور کسی کام کی نفی کو پرزور بنانا مقصود ہوتا ہے تب لا لا، یعنی لفظ کو مکرر بولتے۔ اور اپنی کلام کو مؤکد بناتے۔ لیکن یہ موقف کمزور معلوم ہوتا ہے۔

سوال: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ میں "دِيْنِ" کا معنی جزا ہے یا مذہب؟

جواب: اس آیت میں دین کا معنی مذہب (ضابطہ حیات، دستور زندگی) ہے کیونکہ یہی معنی اصل ہے، اگر قرینہ صارفہ نہ ہو تو دین کے معنی مذہب (ضابطہ حیات، دستور زندگی) کے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہاں جزا معنی کیا ہے وہ اپنی رائے میں مصیب نہیں ہیں۔

سوال: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ کی نحوی ترکیب کریں۔

جواب: لَكُمْ جار مجرور خبر مقدم محذوف کے متعلق ہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: ثَابِتٌ لَّكُمْ دِيْنُكُمْ۔ دِيْنُكُمْ مضاف مضاف الیہ ملکر مبتدا موخر۔ واؤ حرف عاطفہ، لِي جار مجرور خبر مقدم محذوف کے متعلق ہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: ثابت لی دینی۔ دینی مضاف مضاف الیہ ملکر مبتدا موخر۔

سوال: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ ولِیَ دین میں ی پر فتح اور نون پر کسرہ کس وجہ سے ہے؟

جواب: لِي مجرور متصل بحرف جار سے واحد متکلم کی ضمیر ہے اس پر فتح پڑھنا جائز ہے اور بغیر فتح کے بھی۔ دین اصل میں دینی تھا وقف کی بناء پر یائے متکلم محذوف ہوگی اور نون پر کسرہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

سوال: سورۃ الکافرون سے کون سا بنیادی سبق حاصل ہوتا ہے؟

جواب: اس سورت کا بنیادی سبق ''دین کے معاملے میں مداہنت کا خاتمہ'' ہے۔ جیسا کہ اس سورت کے موضوع ومضمون میں وضاحت کی گئی ہے کہ اس سورت میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ کفار کو دعوت اسلام اور ان سے نرم گوشہ رکھنا اپنی جگہ ضروری ہے لیکن مذہبی رواداری کے نام پر دین کے معاملات میں کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی دین کے امور میں کوئی مداہنت اور مصالحت کی جائے گی۔ (تفہیم، تدبر)

سُوْرَةُ النَّصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿٢﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿٣﴾

سوال: اس سورۃ کا ماقبل سورت سے کیا علاقہ ہے؟

جواب: سورۃ الکافرون میں اس بات کو واضح کیا گیا تھا کہ دین اسلام جس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داعی ہیں اور دین کفار دو الگ الگ دین ہیں جو کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ اس سورہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دین اسلام ہی غالب ہو گا۔ دین کفار کو مٹنا ہے اور اس کے مٹنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشارت دی جا رہی ہے کہ اسلام سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا بلکہ غالب ہو چکا ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ لوگ جوق در جوق، گروہ در گروہ دین اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بتایا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد مکمل ہو گیا ہے لہٰذا اب آپ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اسکی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اس کے ہی فضل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنا بڑا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ استغفار کریں۔ واضح رہے کہ بعض اوقات استغفار رفع درجات کے لئے ہوتا ہے۔ (تفہیم)

سوال: اس سورت کا سنہ نزول ذکر کریں۔

جواب: اس کے زمانہ نزول میں اختلاف ہے۔ مفسرین نے تمام روایات جمع کی ہیں۔ لیکن اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری زمانہ کی ہے۔ بعض رواۃ نے اس سورت کے نزول کے بعد آپ علیہ السلام کی زندگی ۸۰ دن، بعض نے ۶۰ دن اور بعض نے دو سال بتائی ہے۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری دو بہاروں میں نازل ہوئی ہے اور یہ دور فتح مکہ کے بعد کا دور ہے۔ واللہ اعلم

سوال: اگر اس سورت کا سنہ نزول فتح مکہ کے بعد یا حجۃ الوداع قرار دیا جائے تب ﴿إِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ﴾ میں إِذَا کس معنی میں ہوگا؟

جواب: تب إِذَا یہاں إِذ کے معنی میں ہوگا۔ یہ بات اصولی طور پر بھی درست ہے۔ قرآن حکیم میں ہی بہت سارے مقامات ایسے ہیں جہاں إِذَا، إِذ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جو بھی اصول کتابوں میں مذکور ہیں وہ تمام کے تمام کلی نہیں ہیں، بلکہ ہر اصول میں کہیں نہ کہیں استثناء موجود ہوتا ہے۔ گو إِذا جب صیغہ ماضی پر داخل ہے تب مستقبل کے معنی ادا کرتا ہے لیکن یہ قاعدہ کلی نہیں ہے۔ دلیل کے طور پر ہم یہاں إِذا بمعنی إِذ کی چند مثالیں نقل کر دیتے ہیں۔

سورۃ توبۃ میں ہے: ﴿وَلَا عَلَى الَّذِيۡنَ اِذَا مَاۤ اَتَوۡكَ لِتَحۡمِلَهُمۡ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحۡمِلُكُمۡ عَلَيۡهِ﴾ (ترجمہ: اور نہ ان لوگوں پر (کوئی حرج ہے) کہ جب بھی وہ تیرے پاس آئے تاکہ تو انہیں سواری دے، تو آپ نے کہا میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کروں) (توبۃ: ۹۲)

سورۃ کہف میں ہے: ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيۡنَ السَّدَّيۡنِ﴾ (ترجمہ: یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا) (الکھف: ۹۳) ﴿حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيۡنَ الصَّدَفَيۡنِ﴾ (ترجمہ: یہاں تک کہ جب اس نے دو پہاڑوں کا درمیانی حصہ برابر کر دیا) (الکھف: ۹۶) اور ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا﴾ (ترجمہ: یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا) (الکھف: ۹۶)

(اس کی مزید مثالیں دیکھنے کے لیے دراسات لاسلوب القرآن الکریم میں إِذا کی بحث دیکھیں۔ اور کتب نحو میں شرح الکافیہ از رضی اور مغنی اللبیب از ابن ہشام کی طرف مراجعت فرمائیں)

سوال: ﴿إِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ﴾ کا قواعد کے مطابق ترجمہ کریں نیز بتائیں کہ یہاں کون سا عطف ہے؟

جواب: جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی ہے۔

یہ عطف عطف الخاص علی العام کی قبیل سے ہے۔ جس طرح ﴿تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا﴾ (القدر: ٤) ہے۔

سوال: ﴿إِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ﴾ "الفتح" سے کون سی فتح مراد ہے؟

جواب: تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں: "ولم يختلف أهل التاويل أن المراد بالفتح فى الآية هو فتح مكة"۔ مفسرین میں اختلاف نہیں ہے کہ آیت میں الفتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ جو اس سے کوئی اور فتح مراد لیتے ہیں ان کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

سوال: ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ "يَدْخُلُوْنَ" کی اعرابی حالت ذکر کریں۔

جواب: "يَدْخُلُوْنَ" "الناس" سے حال ہونے کی بناء پر حالت نصب میں ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ "اَفْوَاجًا" منصوب کیوں ہے؟ نیز یہ کس کی جمع ہے اور وزن بھی لکھیں۔

جواب: اَفْوَاجًا، یدخلون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ (اعراب)

یہ فوج کی جمع غیر قیاسی ہے۔ اس کی جمع قیاسی طور پر أفوج ہونی چاہیے۔ لیکن أفوج میں واؤ پر ضمہ ثقیل تھا اس لئے أفواج بنا دیا گیا۔ علامہ ابوحیان فرماتے ہیں: ''گویا کہ معتل العین کی جمع صحیح کی طرز پر آتی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ صحیح کی أفعل پر اور معتل کی جمع أفعال کے وزن پر فتی ہے۔ مثلاً حوض و أحواض اور اس میں أفعل کا وزن شاذ ہے جیسے ثوب کی جمع أثوب ہے'' (اصل جمع تو أثواب ہی آتی ہے۔ (قاموس))۔ (البحر المحیط)

سوال: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ فسبح میں "ف" کیوں صادر ہوئی ہے؟

جواب: یہ إذا شرط کے جواب میں ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ "بِحَمْدِ رَبِّكَ" جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟

جواب: سبح کی أنت ضمیر کے محذوف حال کے متعلق ہیں۔ أي سبح ملتبسا بحمد ربك۔ (اعراب)

سوال: ﴿اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ کی ترکیب نحوی کیا ہے؟

جواب: اِنَّ حرف مشبہ بالفعل، "ہ" ضمیر اِنَّ کا اسم اور ''كَانَ تَوَّابًا'' كَانَ فعل ناقص هو ضمیر اسم، تَوَّابًا خبر، كَانَ اپنے اسم اور خبر سے ملکر جملہ فعلیہ خبر یہ ہوکر اِنَّ کی خبر ہے۔ اِنَّ اپنے اسم اور خبر سے ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

سوال: ﴿اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ توابا کیا صیغہ ہے؟ تاب یتوب: رجوع کرنا بندے اور ذات حق دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس میں فرق ہے تو واضح کریں۔

جواب: توابا: "تَابَ يَتُوْبُ تَوْبًا وَتَوْبَةً" (ن) سے فَعَّالٌ کے وزن پر صیغہ مبالغہ ہے۔ اصل میں تووابٌ تھا۔ ہم مثل حرف واؤ باہم مدغم ہوئے تواب ہوگیا۔ مادہ: ت، و، ب۔

یہ فعل عبد اور مولیٰ دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر اس کا صلہ علی ہو جیسے: تاب الله علی عبده۔ تب اس کا معنی ہوگا: اللہ کا بندے کو توبہ کی توفیق دینا۔ اگر اس کا صلہ إلی ہو تو مثلاً: تاب العبد إلی الله۔ تب اس کا معنی ہوگا: بندے کا گناہوں پر

نادم ہوکر مالک کی طرف رجوع کرنا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

تواب علی عبادہ۔ والتواب من الناس التائب من الذنب۔ یعنی یہ لفظ ذات حق تعالیٰ اور مخلوق دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ یہی بات امام فراء سے بھی منقول ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن میں "تواب" صرف خالق کائنات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مخلوق کی نسبت "تَوَّابِیْنَ" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ (البقرة:۲۲۲)

سوال: ﴿اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ میں مؤکدات کی نشاندہی کریں۔

جواب: إنَّ، کان، توابا صیغہ مبالغہ، تنوین تعظیم، اس آیت میں چار مؤکدات ہیں۔ (التحریر)

سوال: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کیسے محسوس ہوا کہ اس سورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: چونکہ اس سورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مشن کی کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ اب آپ کی بعثت کا مقصد مکمل ہوگیا ہے اور اس کے بعد اپنے رب کی تسبیح وتحمید اور اس سے استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے حضرت انہوں نے یہ سمجھا کہ مقصد کی تکمیل کے بعد تسبیح وتحمید کا حکم وفات کی خبر کو متضمن ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال: اس سورت سے دعاۃ اور مبلغین کے لئے کونسی اہم نصیحت مفہوم ہوتی ہے؟

جواب: سابقہ سطور میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت آپ کو یہ حکم ملا کہ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے بخشش طلب کریں۔ اس حکم سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ یہ جو آپ نے اسلام کی دعوت کو عرب کے کوچہ کوچہ میں پہنچایا یہ خاص توفیق الٰہی سے انجام کو پہنچا ہے۔ ممکن ہے کہ اس دعوتی کام میں کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی کوتاہی ہوگئی ہو، اس لئے آپ اپنے رب سے استغفار کیجئے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی تمام جامع اوصاف کے باوجود انابت اور رجوع الی اللہ کا حکم ہو رہا ہے تو علماء ودعاۃ اور مبلغین کو ہر وقت اپنے خالق کی جانب رجوع اور اس سے استغفار کرتے رہنا چاہئے۔ تاکہ دعوتی عمل کی تمام کوتاہیوں کا ازالہ ہوسکے۔

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: یہ سورت ماقبل کے مقابلہ میں ہے یعنی ماقبل سورت میں دنیا میں ایک مطیع وفرمانبردار کی جزا، فتح کی نوید سنائی گئی ہے اوراچھی آخرت کی بشارت دی گئی ہے۔اس سورت میں ایک شقی، بدبخت اور نافرمان کی سرگزشت کا بیان ہے کہ کس طرح وہ دنیا میں ذلیل ورسوا ہوگا اور آخرت میں اس کو کس قہرِ الٰہی کا سامنا ہوگا۔(المنیر)

سوال: اس سورت کا شانِ نزول ذکر کریں۔

جواب: اس سورت کے شانِ نزول کے بارے میں امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بہت ساری روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔''حضور صلی اللہ علیہ وسلم وادی بطحاء کی طرف نکلے اور پہاڑ پر چڑھ کر ندا دی: یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت) پس قریش کے لوگ جمع ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن تم پر صبح یا شام حملہ کرنے والا ہے کیا تم میری تصدیق کروگے؟

(سب نے یک زبان) جواب دیا: **نعم**۔آپ نے فرمایا:''**فإني نذير لكم بين يدي عذاب شديد**'' میں تمہیں شدت والے عذاب سے ڈرا رہا ہوں۔ ابولہب یوں بولا۔**ألهذا جمعتنا تبا لك**۔ تیرے لئے ہلاکت ہو تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ آخر تک نازل فرمائی۔(بخاری: ۴۹۷۲)

سوال: اس سورت کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں ابولہب کی ہلاکت وبربادی کا تذکرہ ہے۔

اسلام سے بغض وعداوت اور لوگوں کو بھی اسلام سے روکنے کی وجہ سے اسکے حصہ میں یہ ہلاکت وبربادی آئی کہ ہلاکت و تباہی کے وقت اس کا مال ومتاع بھی اس کے کام نہ آسکا۔کیونکہ اس کی پیشین گوئی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے کردی تھی۔

اس طرح ابولہب اور اسکی بیوی ام جمیل (جو کہ اس کام میں اسکی مددومعاون تھی) کیلئے سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔(المنیر)

سوال: کیا یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟

جواب: اس کے مکی ہونے میں مفسرین سے لیکر محدثین تک کوئی اختلاف نہیں۔ اس لیے صاحب المحرر الوجیز نے کہا: وھی مکیۃ باجماع۔

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ "تبت" صیغہ تانیث کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: اس لئے کہ اس کا فاعل "يَدَانِ" ہے۔ نون تثنیہ بوجہ اضافت حذف ہو گیا۔ جو انسانی اعضاء دو دو ہیں ان کے لیے صیغہ تانیث استعمال کیا جاتا ہے۔ سوائے "خَدٌّ، كَتِفٌ، حَاجِبٌ اور عَضُدٌ کے، یہ مذکر استعمال ہوتے ہیں۔ (معجم النحو)

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ "تبت" کے معنی کیا ہیں؟

جواب: تب کے معنی ہلاک ہونے اور خسارہ میں پڑنے کے ہیں۔

صاحب لسان نے لکھا ہے: تبت یدا أبی لھب أی خلتا وخسرتا۔ اور صاحب کشاف نے کہا ہے: التباب الھلاك۔ ہلاک ہونے کی تعبیر ہاتھ ٹوٹنے سے کی جاسکتی ہے۔ اس لئے مترجمین نے ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے، ترجمہ کیا ہے۔

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ کیا ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے؟

جواب: یہ لفظ محاورے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کی کوشش نامراد ٹھہری اور جدوجہد بے ثمر رہی، اس کی کوشش اور محنت نے اس کے دامن میں بجز کانٹوں کے کچھ نہیں ڈالا۔ محنت اور کوشش کی تعبیر ہاتھ کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ جس طرح قرآن میں ﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ﴾ (الحج: ۱۰) کے الفاظ آئے ہیں۔

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ اس کے نام کی بجائے اس کی کنیت کیوں ذکر کی گئی؟

جواب: اس شخص کا اصل نام عبدالعزی تھا۔ ابولہب اس کی کنیت تھی یہ کنیت بیٹے کے نام سے تھی یا اس کے رخساروں کی لالی کی شدت سے تھی۔ یہ دونوں رائے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں نقل کی ہیں۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے نام نہ ذکر کرنے کی یہ وجوہ ذکر کی ہیں کہ وہ اس کنیت سے نام کی نسبت زیادہ مشہور تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کا نام عزی بت کی طرف منسوب تھا۔ تیسری وجہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے کہ اس کا انجام جو اس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی کنیت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ اس شخص میں کونسی بری صفت تھی جس کی وجہ سے اس کی خاص طور پر مذمت بیان کی گئی ہے؟

جواب:اس سوال کے جواب میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے طویل کلام کیا ہے ہم اس کا خلاصہ نقل کرتے ہیں:

(۱) عربی معاشرے میں اخلاقی قدروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خاص طور پر خونی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کو۔ عرب معاشرے میں قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ تصور کیا جاتا ہے۔ گو وہ رشتہ دار حق بجانب نہ بھی ہو تب بھی اس کی پشت پناہی کرنا ضروری ہوتا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا ابولہب کفر اور بتوں کی محبت میں اس قدر اندھا تھا کہ اس کو یہ سوجھ بوجھ بھی نہ رہی کہ اس کا خاندان اور اس کا معاشرہ اس سے یہ توقع نہیں رکھتا۔ باقی خاندان کے لوگ بھی اسلام کی دعوت کو قبول کرنے والے نہ تھے لیکن مخالفت میں اس سے بہت پیچھے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت عقیدے کے لحاظ سے تو کرتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا بھلا کہنا خاندانی اعتبار سے ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

(۲) یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد اور ابولہب صلبی بھائی تھے۔ چچا کی اپنے سگے بھتیجے کی مخالفت اور اذیت رسانی بہت گھناؤنا عمل تھا۔ اور یہ مزید گھناؤنا پن تھا کہ بھائی فوت ہو چکا ہو اور بھتیجا چچاؤں کے رحم و کرم پر ہو لیکن چچا نے بھتیجے کے سر پر دست شفقت رکھنے کی بجائے اس کا جینا بھی حرام کیا ہو۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قریب ترین ہمسایہ تھا دونوں گھروں کی دیوار ایک ساتھ تھی۔ باقی کافر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے قریب تھے، یہ سب لوگ آپ کو تنگ کرتے تھے، لیکن ان میں سب سے بڑھ کر جس کی قسمت نے ان کو مارا، یہی بدبخت گھرانہ تھا۔ یہ لوگ حالت نماز میں بکری کی اوجھری پھینک کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دیتے تھے۔ اس سے بڑھ کر انسانیت سے گری ہوئی حرکت کرتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کھانا تیار ہو رہا ہوتا اس میں غلاظت پھینک دیتے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف یہی فرماتے: بنی عبد مناف یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟

(۴) نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیاں ابولہب کے دو بیٹوں کے عقد میں تھیں۔ اس نے اپنے اوپر اپنے بیٹوں سے ملاقات حرام کر لی کہ جب تک تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو۔ انہوں نے باپ کے اصرار پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت صدمہ پہنچایا۔

(۵) ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ابولہب کا ایک بیٹا آیا اور کہتا ہے ﴿والنجم إذا هوى﴾ اور ﴿ثم دنا فتدلى﴾ کا میں انکار کرتا ہوں اور اس شقی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ انور پر تھوکنے کی گستاخی کی لیکن وہ خطا ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔ ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا اس پر پوری ہوئی۔

(۶) ابولہب کے خبث باطن کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر قاسم کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ کی روح پرواز ہو گئی، یہ شقی غم میں شریک ہونے کی بجائے دوڑا دوڑا سرداران قریش کے پاس گیا کہ محمد بے

نام ونشان ہو گئے ہیں۔

(۷) حج کے ایام میں مکہ کی بین الاقوامی منڈیوں میں حضورﷺ جہاں جہاں دعوت حق کے لیے جاتے ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور یہ کہتا: یہ جھوٹا ہے۔ یہ جھوٹا ہے۔

(۸) نبوت کے ساتویں سال جب قریش نے بنی ہاشم سے قطع تعلقی کا اظہار کیا۔ اور سب بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔ تمام بنی ہاشم حضورﷺ کے ساتھ خاندانی تعلق کا پاس کرتے ہوئے حضورﷺ کے ساتھ سزا میں برابر کے شریک تھے لیکن خاندان کا صرف ایک گھرانہ تھا جس نے خاندانی روایات کا لحاظ نہ کیا اور کفر اور بتوں کی محبت میں قریش کے ساتھ مل گیا۔ وہ یہی ابولہب ملعون کا گھرانہ تھا۔ تنہا صرف یہی بات نہیں بلکہ جب کبھی مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور محصورین میں سے بعض لوگ مہنگے داموں خورد ونوش کی اشیاء خریدنے کے لیے آتے۔ یہ قافلے والوں کو روکتا اور کہتا ان کے ہاتھ سامان فروخت نہ کرنا۔ جس قدر خسارہ ہوگا۔ میں ادا کروں گا۔ وہ لوگ خالی ہاتھ پلٹ جاتے اور اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بچوں کے لیے کچھ نہ کر پاتے۔

اس کی انہی شقاوتوں کی بدولت اللہ پاک نے قرآن میں اس کا ذکر کر کے مذمت کی ہے۔ (تفہیم)

سوال: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ "تب" بطور خبر استعمال ہوا ہے یا بطور دعا؟

جواب: اس سے دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں یعنی "تب" کا عطف "تبت" پر ہو اور جس طرح "تبت" بد دعا کے معنی میں ہے یہ بھی بد دعا کے معنی میں ہو۔ پہلے چونکہ "تبت یدا" کہا اب یہاں "تب" کہہ کر مکمل ذات کو مراد لیا ہے۔

"تب" خبر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں 'واؤ' حالیہ اور یہ جملہ حال بنے گا۔ (روح، التحریر)

سوال: ﴿مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ﴾ میں "ما" کیا ہے؟

جواب: اس "ما" کو نافیہ یا استفہامیہ بنایا جا سکتا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ﴾ "مَا كَسَبَ" کی اعرابی حالت اور اسکا مفہوم ذکر کریں۔

جواب: "مَا كَسَبَ" محل رفع میں ہے کیونکہ اس کا عطف "مَالُهٗ" پر ہو رہا ہے۔ (اعراب)

چونکہ "مَا كَسَبَ" کا مفہوم "مَالُهٗ" سے الگ ہے اس لئے اس کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ "مَالُهٗ" اور "مَا كَسَبَ" کے مفہوم میں درج ذیل توجیہات کی گئی ہیں:

(۱) "مَالُهٗ" سے اسکا وراثتی مال اور "مَا كَسَبَ" سے اس کا اپنا کمایا ہوا مال ہے۔

(۲) "مَالُهٗ" سے مراد اس کا مال اور "مَا كَسَبَ" سے اس مال سے کی گئی دوسری کمائی یعنی جانور، تجارت وغیرہ مراد ہے۔

(۳) "مَالُهٗ" سے مراد مال اور "مَا كَسَبَ" سے مراد اسکی اولاد ہے۔

(۴) "مَالُهٗ" سے مراد اس کا مال اور "مَا كَسَبَ" سے مراد اسکے اعمال ہیں جسکو اس نے اپنے زعم میں نیکی سمجھ کر کیا تھا۔ کیونکہ وہ بیت اللہ کے شعبہ مالیات کا انچارج تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بھی اس کے خبث باطن اور شرک کی وجہ سے رائیگاں گیا۔ (کشاف، روح، التحریر، تدبر)

سوال: ﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ "سَيَصْلٰى" کا معنی ذکر کریں۔

جواب: صَلِيَ النَّارَ کا معنی ہے آگ میں جلنا۔ لیکن تجرید معنی کیلئے صَلِيَ النَّارَ کا ترجمہ "آگ میں جلا" کی بجائے "آگ میں داخل ہوا" کیا جاتا ہے، کیونکہ جلانے کا معنی اور صفت تو "النار" میں بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۶۰) میں "ولا تعثوا" کا معنی "تم نہ پھرو" کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا حقیقی معنی "تم فساد نہ کرو" ہے۔ اسے تجرید معنی کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اصل معنی ہی کیا جائے تاکہ کلام میں تاکید پیدا ہو سکے۔

سوال: ﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ "لَهَبٍ" کا لغوی معنی ذکر کرتے ہوئے بتائیں کہ "أبي لهب" اور "نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ" میں کیا مناسبت موجود ہے؟

جواب: یہاں آگ کی صفت "ذات لهب" اس کی کنیت "أبي لهب" کی مناسبت سے لائی گئی ہے کہ دنیا میں اسکو اپنی جس شعلہ روی پر ناز رہا آخرت میں یہ اس کیلئے وبال بنے گی اور وہ شعلوں والی آگ میں جلے گا۔ جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ظاہر کا حسن کوئی فخر کی چیز نہیں بلکہ یہ آدمی کے لئے وبال بن سکتا ہے اگر اس کے ساتھ باطن کا حسن نہ ہو۔ (تدبر)

سوال: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ میں "امراته" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: اس کا عطف سَيَصْلٰى کی هو مرفوع ضمیر پر ہو رہا ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ "وَامْرَاَتُهٗ" سے کیا مراد ہے؟

جواب: وَامْرَاَتُهٗ سے مراد اس کی بیوی ہے۔ عرب میں امراته سے مراد بیوی ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے ﴿وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ﴾ (ھود: ۷۱)، حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ﴾ (الاعراف: ۸۳)"۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے:
﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ

مُّبِيْنٍ﴾ (یوسف: ۳۰)۔

سوال: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ ابولہب کے ساتھ اس کی بیوی کی مذمت کیوں کی گئی؟

جواب: اس لئے کہ حضور ﷺ کو اذیت دینے میں وہ اپنے خاوند کے دوش بدوش کام کرتی تھی۔ وہ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی۔ اس لئے ایک سورت میں دونوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

سوال: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ میں "حَمَّالَةَ" منصوب کیوں ہے؟

جواب: "حَمَّالَةَ" "وَّامْرَاَتُهٗ" سے حال ہے (التحریر) یا یہ فعل مقدر کا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ أي أذم حمالة الحطب۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ عربی محاورے کے اعتبار سے "حمالة الحطب" کے معنی کیا ہیں؟

جواب: "حمالة الحطب" کا لفظی ترجمہ "لکڑیاں اٹھانے والی" ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ رات کو رسول اللہ کے راستے میں خاردار ٹہنیاں بچھاتی تھی تاکہ کانٹے آپکے قدموں میں لگیں۔ اس لیے اس کو لکڑیاں اٹھانے والی یا ڈھونڈنے والی کہا گیا ہے۔

دوسری رائے حضرت عبداللہ کے شاگرد رشید حضرت مجاہد کی ہے وہ لگائی بجھائی کرتی تھی اور چغلی کھاتی تھی، یعنی لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف عداوت کی آگ بھڑکاتی رہتی تھی۔ ایسی صفت کی حامل عورت کو عرب حمالة الحطب کہتے ہیں۔

تیسری رائے حضرت سعید بن جبیر کی ہے کہ جو شخص اپنے اوپر گناہوں کا بوجھ ڈال رہا ہو اس کو عربی زبان میں فلاں یحتطب علی ظهره کہتے ہیں۔

ان تینوں معانی میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ اسکی مختلف صفات اور اسکے انجام کی طرف اشارہ ہے جسکی عربی کلام سے بھی تائید ہوتی ہے، اس لئے یہاں تینوں معانی ہی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

سوال: ﴿فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ "فِيْ جِيْدِهَا" کس کے متعلق ہے؟

جواب: یہ حَبْلٌ کی محذوف خبر مقدم کے متعلق ہے۔ أي ثابت في جيدها حبل من مسد۔ (اعراب، کشاف)

سوال: ﴿فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ "جید" اور "مسد" کے معنی بتائیں نیز "جید" اور "عنق" میں فرق واضح کریں۔

جواب: جید کے معنی گردن کے ہیں۔

مسد کے معنی ہیں: المسد حبل من لیف أو خوص أو شعر أو وبر أو صوف أو جلود أو جلود الإبل أو جلود أو من أي شيء کان۔ (لسان) مسد اس رسی کو کہتے ہیں جو کھجور کی چھال یا کھجور کے پتوں یا بالوں یا اون یا اونٹ کے چمڑے سے اور عام چمڑے سے یا کسی بھی چیز سے بنتی ہو۔

"جید" کا معنی بھی "عنق" ہی ہے لیکن عرب میں اس کا کثرت استعمال عورت کی گردن کیلئے ہوتا ہے اور عورت کی گردن میں سے خاص طور پر "ہار پہننے کی جگہ پر" یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

یہاں "جید" کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ آخرت میں أبولہب کی بیوی کی گردن میں "حبل من مسد" کا ہی زیور ہوگا۔ (التحریر)

سوال: اس سورت سے قرآن کا اعجازی پہلو نقل کریں۔

جواب: اس سورت میں ابولہب اور اس کی بیوی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دوزخی ہیں آگ میں جلیں گے۔ وہ قرآن کی حقانیت کو جھٹلانے کے لیے مسلمان ہوجاتے کہ دیکھو یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم تو مسلمان ہوگئے اور ہم آگ سے بچ گئے۔ کیونکہ یہ سورت اس کی زندگی میں نازل ہوئی اور اس نے اور اس کی بیوی نے اس سورت کے نزول کے بعد کئی سالہ زندگی گزاری۔ لیکن وہ کلمہ نہ پڑھ سکے اور لوگوں نے اس کی زندگی کے آخری لمحات دیکھے اور قرآن کی خبر من وعن پوری ہوئی اور آخرت میں بھی یہ خبیث اپنے کئے کی سزا بھگتے گا۔

سوال: درج ذیل کا محل اعراب بتائیں:

تبت یدا، تب، مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ، وَمَا كَسَبَ۔

جواب: تبت یدا: جملہ ابتدائیہ ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

تب: اگر واؤ عاطفہ ہو تو اس کا کوئی محل اعراب نہیں کیونکہ اس کا عطف بھی "تبت یدا" پر ہوگا۔ اور اگر واؤ کو حالیہ مانیں تو یہ جملہ حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ (التحریر)

ما أغنی عنه ماله: جملہ استئنافیہ ہونے کی وجہ سے اس کا بھی کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

وما کسب: چونکہ اس کا عطف بھی "ما أغنی" پر ہے اس لئے اس کا بھی کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ (اعراب)

سوال: درج ذیل کا وجہ اعراب بتائیں:

ذات لهب، وامرأته، حبل۔

جواب: ذات لهب: "ناراً" مفعول بہ کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

امرأته: یا تو "یَصْلیٰ" کی "هو" ضمیر پر عطف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا پھر یہ مبتدا ہے اور "في جيدها" اس کی خبر ہے۔

حبل: مبتدا مؤخر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (اعراب)

سوال: مندرجہ ذیل صیغے بتائیں:

تبت، أغنى، سيصلى، حمالة۔

جواب: تبت: "تَبَّ يَتُبُّ تَبًّا" (ن) سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: ت، ب، ب۔

أغنى: باب افعال "أَغْنیٰ يُغْنِي إِغْنَاءً" سے واحد مذکر غائب ماضی معلوم ہے۔ مادہ: غ، ن، ی۔

سيصلى: "صَلِيَ يَصْلیٰ صَلْيًا" (ع) سے واحد مذکر غائب مضارع معلوم ہے۔ مادہ: ص، ل، ی۔

حمالة: "حَمَلَ يَحْمِلُ حَمْلًا" (ض) سے واحد مؤنث اسم مبالغہ ہے۔ مادہ: ح، م، ل۔

سُوْرَةُ الْإِخْلَاصِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤

سوال: اس سورت کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: سورۃ الکافرون میں کفر اور شرک سے اعلان براءت کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والی سورت میں اسلام کی فتح و نصرت اور غلبہ بیان ہوا اور اس کے بعد سورۃ المسد میں اسلام دشمن لوگوں کا انجام بیان ہوا، یہ دونوں سورتیں (النصر، المسد) سورۃ الکافرون کا تتمہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سورۃ اخلاص میں توحید حقانی کو شرک کی ہر قسم سے پاک اور منزہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

سوال: اس سورت کا موضوع و مضمون کیا ہے؟

جواب: اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو نہایت مختصر الفاظ مگر جامع مفہوم میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت اور اسکی صفت کمال (صمدیت: سب سے بے نیاز ہونا) کو بیان کیا گیا ہے۔

اور نقص والی صفات (اولاد، باپ اور ہمسر) کی اس سے نفی کر کے یہود و نصاریٰ اور مشرکین (جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے) کا رد کیا گیا ہے۔ (المنیر)

سوال: اس سورت کی فضیلت میں کچھ صحیح احادیث ذکر کریں۔

جواب: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اس سورت سے محبت کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی محبت تمہیں جنت میں لے جائے گی۔ (احمد: ۱۲۴۳۲)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نے ایک شخص کو سورۃ الاخلاص بار بار پڑھتے سنا تو وہ صبح کے وقت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس بات کا تذکرہ کیا، گویا کہ وہ اس عمل کو کم حیثیتی کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (بخاری: ۵۰۱۳، بَابُ فَضْلِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ)

سوال: اس سورت کا شان نزول ذکر کریں۔

جواب: اس سورت کے شان نزول میں مختلف روایات ہیں۔ اسی سبب سے اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض وہ روایات ہیں جن میں یہ ہے کہ یہ مشرکین کے جواب میں نازل ہوئی۔ مشرکین نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ اپنے رب کا نسب بیان کرو تب یہ سورت نازل ہوئی۔ کچھ وہ روایات ہیں جو یہ بیان کرتی ہیں کہ یہ سورت یہودیوں کے جواب میں نازل ہوئی کہ کچھ یہودی علماء آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ ﷺ کا رب کس سے بنا ہے؟ اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس کے علاوہ اور بہت سی روایات ہیں۔ جو مختلف سبب بیان کرتی ہیں۔

یہ تمام روایات بادی النظر میں باہم متضاد نظر آتی ہیں لیکن نفس الامر میں حقیقت ایسے نہیں ہے۔ اس میں تطبیق بہت آسان ہے۔ بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ سورت مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہو یا مختلف سوالات کے جواب میں حضور ﷺ نے اسی سورت کو بیان کیا ہو اور رواۃ نے اسے سبب نزول میں ذکر کر دیا ہو۔

شان نزول کی روایات تفسیر طبری اور تفہیم القرآن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سوال: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کی نحوی ترکیب کریں۔

جواب: "هو" مبتدا اول، لفظ "الله" مبتدا ثانی اور "أحد" مبتدا ثانی کی خبر، لفظ "الله" اپنی خبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر مبتدا اول "هو" کی خبر، جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر "قل" کا مقولہ بنے۔ "قل" صیغہ امر ہے اس لیے یہ جملہ انشائیہ ہوا۔

اس میں دوسری ترکیب یہ بھی کی گئی ہے کہ "هو" مبتدا اور لفظ "الله" خبر اور "أحد" لفظ جلالہ سے بدل ہے۔ (المحرر)

سوال: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ "هو" کی ترکیب کیا ہے؟

جواب: اس کے تین جواب ہیں۔ (۱) یہ ضمیر شان ہے۔ سامعین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ہے۔

(۲) اس ضمیر کا مرجع رب ہے جو مشرکین کے سوال میں تھا۔ مشرکین نے کہا: "أنسب لنا ربك"۔

(۳) تیسرا جواب علامہ رازی نے دیا ہے کہ یہ اللہ کے اسماء میں سے ہے۔ یہ کمزور معلوم ہوتا ہے۔

سوال: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ لفظ "أحد" کی صرفی تعلیل کریں۔

جواب: لفظ "أحد" اصل میں "وحد" تھا۔ غیر قیاسی طور پر واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا۔ (التحریر، فتح الباری)

سوال: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ عربی زبان میں لفظ "أحد" کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے؟

جواب: یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ احد جس طرح استعمال کیا گیا ہے وہ عربی زبان کا غیر معمولی استعمال ہے۔ عام طور پر یہ لفظ یا تو مضاف۔ یا مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے

فابعثوا أحد کم: ''اپنے میں سے کسی کو بھیجو'' اور یوم الأحد: ''اتوار کا دن''۔ یا نفی عام کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے ما جائني أحد: ''میرے پاس کوئی نہیں آیا''، یا عمومیت کا پہلو لئے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے جیسے هل عندك أحد: کیا کوئی تمہارے پاس ہے؟، یا گنتی میں بولا جاتا ہے جیسے أحد، اثنان، أحد عشر: ایک، دو، گیارہ۔

ان استعمالات کے علاوہ نزول قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ کی ذات کے لئے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرز بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اس صفت سے متصف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ (تفہیم)

سوال: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ کی ترکیب کیسے ہوگی؟

جواب: لفظ اللہ مبتدا، الصمد خبر اول اور لم يلد ولم يولد خبر ثانی۔

یہ بھی درست ہے اللہ الصمد موصوف صفت مبتدا، لم يلد ولم يولد اسکی خبر۔ (المحرر الوجیز)

سوال: ''هو الصمد'' کہنے کی بجائے ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ میں اسم ظاہر کیوں استعمال کیا گیا؟

جواب: یہ هو کی دوسری خبر ہے۔ حالانکہ اس میں حرف عطف میں استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن نہیں کیا، تاکہ ہر جملہ مستقل بالذات معلوم ہو۔ تدریس میں طالب علم کے سوال کے جواب میں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص کہتا ہے: عنترة من فحول الشعراء۔ عنترة من أبطال الفرسان۔ اسی اعتبار سے اسم جلالہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ (التحریر، مفہوما)

سوال: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ مبتدا خبر ہیں۔ خبر معرف باللام ہے جو حصر کا معنی ادا کرتی ہے۔ واضح کریں کہ حصر مبتدا میں ہے یا خبر میں؟

جواب: یہاں خبر میں حصر ہے کیونکہ جب خبر معرفہ ہو اس وقت خبر میں حصر پایا جاتا ہے۔ یہاں صفت صمدیت میں حصر ہے نہ کہ اسم جلالہ میں۔ یہاں اردو ترجمہ ٹھیک یہ ہوگا۔ اللہ صمد ہی ہے۔ یا اللہ صرف بے نیاز ہے۔ جس طرح حدیث میں ہے: تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم۔ نماز میں نماز کے خلاف ہر کام کی حرمت صرف تکبیر ہے اور ان کاموں کو حلال کرنے والی چیز صرف سلام ہے۔ یہاں بھی حصر خبر میں ہے نہ کہ مبتدا میں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ کا ترجمہ جب یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ صرف بے نیاز ہے، تب ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک صرف بے نیاز ہے اور کچھ نہیں۔ اگر حصر کی اقسام مستحضر ہوں تو یہ سوال آپ سے آپ حل ہو جاتا ہے۔

حصر کی دو قسمیں ہیں: ایک حصر حقیقی، دوسرا حصر اضافی۔

(۱) حصر حقیقی: کسی چیز میں حقیقی اور کلی حصر مراد ہوتا ہے۔ جیسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ . اِنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔

(۲) حصر اضافی: یہ کسی سوال کے جواب میں آتا ہے، جیسے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ (آل عمران: ۱۴۴) (ترجمہ: محمد ﷺ صرف رسول ہیں) کیا نبی ﷺ صرف رسول تھے اور کچھ نہ تھے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اگر اس آیت کا پس منظر پیش نگاہ ہو تب یہ حصر بڑا ہی معنی خیز اور پُر مغز معلوم ہوتا ہے۔ صحابہ کرام کے ذہن میں تھا کہ نبی ﷺ کیسے شہید ہو سکتے ہیں، اللہ رب العزت اس شبہہ کو سرے سے رفع کرنے کے لئے یہ حصر استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص زید کے متعلق سوال کرتا ہے کہ اس وقت زید بیٹھا ہے، سویا ہے یا کھڑا ہے۔ وہ آپ سے بیک وقت کئی ایک سوال کرتا ہے تو ان سوالوں کے جواب میں آپ کہتے ہیں کہ زَيْدٌ الْقَائِمُ زید صرف کھڑا ہے۔ خبر میں حصر پیدا کرنے سے باقی سوال از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اسی آیت مبارکہ کے پس منظر کو دیکھا جائے تو بعینہ یہی صورت حال ہے کہ لوگوں کے ذہن میں تھا کہ جس طرح عام بادشاہ کو اپنی رعایا کے انتظام و انصرام کو چلانے کے لئے وزراء اور مشیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ رب العزت کو بھی وزراء اور معاونین کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہتے کہ اپنے رب کا نسب بیان کرو۔ اللہ رب العزت نے ان کے تمام سوالوں کا یک قلم جواب دیا، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ اللہ بے نیاز ہی تو ہے۔ اس خبر کو اس پیرائے میں بیان کیا جیسے اللہ رب العزت میں صرف یہی ایک صفت ہے، تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں سرے سے ایسے سوالات جنم ہی نہ لیں۔

سوال: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ لفظ "صمد" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی منزلت رکھتا ہو۔ سطح مرتفع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔ وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

المصمد: ٹھوس چیز۔ جس کا خوف نہ ہو۔

المصمد: سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

بیت مصمد: وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔ **بناء مصمد**: بلند عمارت۔

أصمد إليه الأمر: فلاں نے معاملے میں اس پر اعتماد کیا۔ (لسان)

سوال: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ لفظ "صمد" کی ماثور تفسیر بیان کریں۔

جواب: ہم طوالت کے خوف سے قول کا قائل حذف کر رہے ہیں۔ صمد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔ وہ سردار جس کی سیادت کامل اور انتہا کو پہنچی ہو۔ وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حکم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو، جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے محتاج ہوں، جس کی صفت سے کوئی دوسرا متصف نہ ہو۔ جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔

مزید اقوال اور اقوال کے قائلین جاننے کے لیے تفسیر طبری اور تفہیم القرآن کی طرف مراجعت فرمائیں۔

سوال: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ میں لفظ أحد سے یہ بات از خود ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نہ تو کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔ پھر یہ کیوں فرمایا ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾؟

جواب: اس سوال کے جواب میں صاحب البیان رقم طراز ہیں: یہ بات لفظ أحد میں بھی موجود تھی لیکن قرآن کے مخاطبین چونکہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں بنائے ہوئے تھے، اس لیے مزید ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ کہا تاکہ اللہ کی یکتائی کی حقیقت اس طرح بے نقاب کر دی جائے کہ نہ اشتباہ کی گنجائش باقی رہے، نہ کوئی چیز مزلہ قدم بن سکے۔ (البیان)

سوال: ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ کا محل اعراب بتائیں۔

جواب: ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ یا تو "هو" کی خبر ثالث ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یا جملہ استئنافیہ ہونے کی وجہ سے بغیر محل اعراب کے ہے۔ (اعراب)

سوال: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ میں ظرف "لَهٗ" کو مؤخر کرنے کی بجائے مقدم کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: کلام میں اصل ذات باری تعالیٰ سے مکافات کی نفی مقصود ہے۔ اس لئے ظرف کو مقدم کر کے کلام میں تخصیص پیدا کی ہے۔ "تقديم ما حقه التاخير يفيد الحصر والتخصيص"۔

سوال: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ "كُفُوًا" کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں کہ "كُفُوًا" منصوب کیوں ہے اور "أحد" مرفوع کیوں ہے؟

جواب: "كُفُوًا" كَفَأَ سے اسم ہے۔ ہمزہ کو تخفیفاً واؤ سے بدلا گیا ہے۔ یا اصلاً ہی ناقص واوی ہے۔ "کفو" مماثل، برابر، ہم پلہ اور ہم رتبہ کو کہتے ہیں۔ "كُفُوًا" "يَكُنْ" کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور "اَحَدٌ" "يَكُنْ" کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (اعراب، قاموس)

سُوْرَةُ الْفَلَقِ وَالنَّاسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝٢ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝٣ وَمِنْ شَرِّ
النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝٤ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ
الْخَنَّاسِ ۝٤ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦

سوال: ان دونوں سورتوں کی ماقبل سورت سے مناسبت ذکر کریں۔

جواب: ماقبل سورت میں توحید الوہیت اور ذات باری تعالیٰ کو ہر قسم کے نقص اور عیب سے منزہ قرار دیا گیا ہے۔ ان سورتوں میں ان چیزوں کا بیان ہوا ہے جو توحید میں رخنہ ڈالنے والی ہیں اور اہل توحید کے لئے مزلہ قدم ہو سکتی ہیں اور اس قدر شر انگیز ہیں کہ ان سے اللہ رب العزت کی پناہ طلب کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بیان ہے جن کے ذریعے ان فتنوں سے بچنے کے لئے پناہ مانگی جائے اور ان سورتوں میں مخلوق کے مراتب بیان کئے ہیں جو خالق کائنات کی توحید کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں جیسے انس وجن کے شیاطین۔ پہلی سورت میں مخلوق کے شر، رات کی تاریکی، جادو اور حاسدین کے حسد سے پناہ طلب کی گئی ہے اور دوسری سورت میں جن وانس کے شیاطین سے پناہ مانگی ہے۔ (المنیر)

سوال: ان دونوں سورتوں کا موضوع ومضمون کیا ہے؟

جواب: ان دونوں سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض شریر چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دونوں سورتوں کے آغاز میں پہلے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا تذکرہ ہے بعد میں جس چیز سے پناہ مانگی ہے اس کا تذکرہ ہے۔ سورۃ الفلق میں طلوع صبح کے رب کی تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے سے، جادوگروں، جادوگرنیوں اور حاسدوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

سورۃ الناس میں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے سچے معبود کی ہر اس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار

پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطین جن و انس میں سے ہو پناہ مانگی گئی ہے۔ (تفہیم)

سوال: معوذتین کی فضیلت کے بارے اگر کوئی صحیح روایت ہو تو بیان کریں۔

جواب: امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے معوذتین کی فضیلت میں کئی صحیح اور حسن احادیث نقل کی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی دو سورتیں نہ سکھلاؤں جو ان تمام دو سورتوں سے افضل ہوں جن کو لوگ پڑھتے ہیں عقبہ نے فرمایا جی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کو ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھائیں۔ (أبوداؤد: ۱۴۶۲، حسن)

سوال: معوذتین مکی سورتیں ہیں یا مدنی؟ بالدلیل ذکر کریں۔

جواب: معوذتین کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے شدید اختلاف ہے حتی کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: کیا تجھے وہ آیات یاد ہیں جو آج رات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ وہ بے مثال آیات یہ ہیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (مسلم: ۱۹۲۷)

چونکہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے تھے، اس لیے یہ سورتیں مدنی ہیں۔

بعض روایات کے مطابق جب یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا تو ان کے توڑ کے لیے یہ سورتیں نازل ہوئی۔

البتہ ان سورتوں کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی سورتیں ہیں۔ ویسے بھی کئی واقعات موجود ہیں کہ جہاں درپیش مسئلہ کے حل اور آسانی کے لئے کسی سورت کی تلاوت کی تلقین کی گئی، حالانکہ وہ پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی۔ ممکن ہے معوذتین کا بھی یہی معاملہ ہو۔ (واللہ اعلم) (تفہیم، التحریر)

سوال: کیا معوذتین قرآن پاک کا حصہ ہیں؟ نیز حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن پاک کا حصہ کیوں تسلیم نہیں کرتے تھے؟

جواب: معوذتین کے قرآن پاک کا حصہ ہونے کے بارے کئی مستند روایات ہیں مثلاً حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معوذتین صبح کی نماز میں پڑھیں۔ (ابوداؤد: ۱۴۶۲)

نماز میں قرات صرف قرآن مجید ہی کی ہوتی ہے۔

حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تمہارے لیے ممکن ہو تو نمازوں میں ان

دونوں سورتوں کی قرأت ترک نہ کرنا''۔ (ابن حبان: ۱۸۴۲)

اسی مفہوم کو صحیح مسلم، مسند احمد اور دیگر کتب احادیث کی متعدد روایات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاں معوذتین بطور دم اور دعا نازل ہوئی تھیں، قرآن پاک کا حصہ نہیں۔ اسی لئے ان کے مصحف سے معوذتین ساقط تھیں۔ لیکن جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن کے موقع پر سب صحابہ کرام کا معوذتین کو قرآن میں شامل کرنے پر اتفاق اور اب تک امت کا اسی مصحف پر تواتر سے عمل کرنا دلیل ہے کہ یہ دونوں سورتیں قرآن کا حصہ ہیں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سہو ہوا ہے۔ واللہ اعلم (تفہیم، فتح الباری)

سوال: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ ''قُلْ'' اور ''اَعُوْذُ'' کی صرفی تعلیل بیان کریں۔

جواب: ''قُلْ'' اصل میں اُقْوُلْ تھا۔ واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن، واؤ کی حرکت ماقبل کو دی اُقُوْلْ ہو گیا، اجتماع ساکنین کی وجہ سے حرف علت ساقط ہوا، اُقُلْ رہ گیا۔ فاء کلمہ کے متحرک ہونے کی وجہ سے ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی اسے بھی ساقط کر دیا، قُلْ رہ گیا۔

''اَعُوْذُ'' اصل میں اَعْوُذُ تھا، واؤ متحرک ماقبل حرف صحیح ساکن واؤ کی حرکت ماقبل کو دی، اَعُوْذُ ہو گیا۔

سوال: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ دونوں سورتوں کی ابتدا میں صیغہ قُلْ ہے، جب ہم ان پر عمل کریں تب ہمیں ﴿اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ کہنا چاہیے۔ لیکن ہم ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ کہتے ہیں، اس وقت ہم کس کو مخاطب کر کے صیغہ ''قُلْ'' استعمال کرتے ہیں۔ وضاحت کریں۔

جواب: یہی سوال بعینہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''قیل لی فقلت'' مجھے یہی کہا گیا ہے اور میں نے اسی طرح کہا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس لئے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ (التفسیر القیم)

سوال: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ ''الْفَلَقِ'' کا لغوی و اصطلاحی معنی ذکر کریں۔

جواب: ''الْفَلَقِ'' کا مادہ ف، ل، ق ہے، جس کا معنی پھاڑنا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی﴾ (الانعام: ۹۵) ''الْفَلَقِ'' کا معنی صبح کا تڑکا بھی ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں ''فلق الصبح'' طلوع صبح کے لیے بکثرت مستعمل ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ﴾ (الانعام: ۹۶) لیکن ''الْفَلَقِ'' کے معنی کو عام کرتے ہوئے اس سے مخلوق مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ ساری مخلوق کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً نباتات زمین کو اور بیج کو

پھاڑ کر، تمام حیوانات رحم مادر یا انڈہ توڑ کر اور چشمے وغیرہ پتھر پھاڑ کر نمودار ہوتے ہیں۔ (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾ "غَاسِقٍ" اور "وَقَبَ" کا لغوی و اصطلاحی معنی ذکر کریں۔ نیز بتائیں کہ حضور ﷺ نے چاند کو ﴿هذا الغاسق إذا وقب﴾ کیوں کہا تھا؟

جواب: "غسق اللیل" کا معنی رات کا تاریک ہونا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ (الاسراء: ۷۸) غاسق کا معنی رات بھی اور چاند بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ پکڑ کر چاند کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا ﴿هذا الغاسق إذا وقب﴾ (ترمذی: ۳۳۶۶، صحیح)

غالباً چاند کو آپ ﷺ نے اس لیے غاسق فرمایا کہ چاند جب طلوع ہو کر خوب روشن ہوتا ہے تو وہ رات کا وقت ہی ہوتا ہے۔ (تفہیم)

"وَقَبَ" کا معنی چھا جانا ہے۔ "وقب الظلام" کا معنی تاریکی کا پھیلنا ہے۔

سوال: ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾ میں رات کی تاریکی سے پناہ مانگنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

جواب: چونکہ نقصان دہ اشیاء سانپ بچھو وغیرہ رات کو ہی نکلتے ہیں اور اکثر برے کام، چوریاں، ڈاکے اور غارتگری وغیرہ رات کو ہوتی ہے، نیز اگر اس وقت کے عربوں کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رات کے وقت ہر قبیلے کو غارتگری کا خطرہ رہتا تھا۔ اسی حکمت کے پیش نظر رات کی تاریکی سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حدیث میں ایک اور حکمت کا تذکرہ بھی ہے کہ غروب آفتاب کے وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ ان کے شر سے بچنے کے لیے آپ ﷺ نے بچوں کو غروب آفتاب کے وقت گھروں میں ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری: ۳۳۰۴) واللہ اعلم (تفہیم، تدبر)

سوال: ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ﴾ "النَّفّٰثٰتِ" کی لغوی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں کہ اس سے کون مراد ہے اور صیغہ جمع مؤنث لانے میں کیا حکمت ہے؟ نیز "الْعُقَدِ" کی واحد اور معنی ذکر کریں۔

جواب: "نفث" کا معنی ہے: "نفخ مع تحريك اللسان بدون إخراج ريق فهو اقل من التفل" بغیر تھوک نکالے زبان کو حرکت دیتے ہوئے پھونک مارنا۔ یہ تھوک سے کم ہوتی ہے۔ جبکہ "نفث في العقد" سے مراد جادوگروں کا گرہ میں پھونک مارنا ہے۔ "النَّفّٰثٰتِ" جمع مؤنث اسم مبالغہ ہے اور یہ جادو کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

"النَّفّٰثٰتِ" سے مراد نفوس، جماعتیں اور عورتیں سب ہی ہو سکتے ہیں۔ زیادہ تر عورتیں ہی مراد لی گئی ہیں اور صیغہ مؤنث تغلیباً لایا گیا ہے کیونکہ عرب میں عموماً عورتیں ہی جادو کا کام کرتی تھیں۔ (التحریر، تفہیم، رازی)

الْعُقَدِ: عُقْدَةٌ کی جمع ہے جس کا معنی ہے: گرہ، گتھی۔ (القاموس)

سوال: ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ "حَاسِدٍ" کے ساتھ "إِذَا حَسَدَ" کی قید کیوں لگائی گئی ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص حاسد ہے لیکن کوئی عملی اقدام نہیں کرتا تو وہ حسد مُضر نہیں ہے، لیکن جب حاسد حسد کی آگ بجھانے کے لیے کوئی بھی عملی قدم اٹھاتا ہے تو وہ حسد شر بن جاتا ہے۔ اس لئے حاسد کیساتھ "إِذَا حَسَدَ" کی قید لگائی گئی۔ (تفہیم)

سوال: ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ یہاں حاسد کے حسد سے پناہ مانگی گئی ہے گویا حسد قبیح فعل ہے جسکی سنت میں بھی مذمت بیان ہوئی ہے لیکن دوسری جگہ حدیث میں ہے: "لا حسد إلا فی اثنتین..." (بخاری: ۷۳) ان دو مقامات پر حسد کرنے کی اجازت کیوں دی گئی؟

جواب: ان احادیث میں حسد سے "غبطة" (رشک) مراد ہے کیونکہ ابتداءً عربی کلام میں حسد کا لفظ غبطة پر بول دیا جاتا تھا۔ صاحب روح المعانی نے بطور استشہاد عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں اور امام بخاری بھی اس حدیث پر "غبطة" کا لفظ لائے ہیں۔

حسد اور غبطة میں فرق یہ ہے کہ حسد میں زوال نعمت کی خواہش کی جاتی ہے جبکہ غبطة میں یہ خواہش نہیں ہوتی صرف رشک کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ نعمتیں دے۔

"لا حسد إلاّ فی اثنتین" میں حصر کا مقصد یہ نہیں کہ رشک کسی اور میں جائز نہیں کیونکہ رشک تو ہر اچھی چیز میں ہوسکتا ہے۔ اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اصل رشک کا محل یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنی ان دونوں کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کیلئے حصر کیا گیا ہے۔ (التحریر، روح)

سوال: "رَبِّ، النَّاس، مَلِك، إِلٰه" کی لغوی وضاحت اور مفہوم بیان کریں۔

جواب: رب: رَبَّ يَرُبُّ (ن) سے مصدر ہے۔ بعد میں بطور صفت استعمال ہونے لگا جیسے عَدْلٌ اور خَصْمٌ ہیں۔ یہاں "رَبّ" کا لفظ "النَّاس" کی طرف مضاف ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کو پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا، ان کی ضروریات کو پورا کرنا اور ہر طرح ان کی خبر گیری کرنا۔ اس لئے رب کا مفہوم اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کی قدرت کامل ہو، اس کا علم وسیع ومحیط ہو، وہ اپنی مخلوق کی ضروریات سے واقف ہو اور اس کی رحمت اور احسان کی کوئی انتہاء نہ ہو۔

الناس: یہ لفظ جن وانس پر بولا جاتا ہے اسکی اصل أناس تھی تخفیفاً الناس پڑھا جاتا ہے۔ مادہ: ا، ن، س۔ (لسان) اسکی واحد إنس ہے (تاج) یا إنسان خلاف قیاس ہے۔ (المعجم الوسیط)

ملك کی تفسیر: مالک مطلق جس کی جمع اَمْلَاك وَمُلُوْكٌ آتی ہے۔

"ملك الناس" میں ملك کا لفظ الناس کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام لوگ اس کے تابع فرماں بندے ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے، کوئی اس کی قدرت کاملہ کے دائرے سے باہر نہیں اور اس کو ان پر ہر طرح سے تسلط ہے۔ وہ ان کا سچا بادشاہ ہے جس کی طرف وہ تکلیف اور مصیبت کے وقت رجوع کرتے ہیں اور ان کے تمام امور کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

إله کی تفسیر: اَلِهَ يَاْلَهُ اِلَاهَةٌ سے مصدر بمعنی مفعول ہے۔

"اله الناس" میں اِله یعنی معبود کا لفظ الناس کی طرف مضاف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہی اس کا سچا معبود ہے اور جس طرح اس کی ربوبیت اور بادشاہت میں کوئی شریک نہیں اسی طرح صرف وہی عبادت کا مستحق ہے اور اس کی عبادت میں کسی کو بھی شرکت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ (التفسیر القیم)

سوال: "بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ" کی صفات کے ساتھ پناہ مانگنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: حقیقت میں یہی تین صفات ہیں جن سے کسی کی سب مخلوقات پر برتری ثابت ہوتی ہے۔ جو سب انسانوں کا مربی ہو، وہی حقیقی بادشاہ ہوسکتا ہے اور جو مربی اور حقیقی بادشاہ ہو، وہی سب مخلوقات کا الٰہ اور معبود ہوسکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان تین اعلیٰ ترین صفات کے ساتھ پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ (تدبر، تفہیم)

سوال: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ "الْوَسْوَاسِ" اور "الْخَنَّاسِ" صیغے حل کریں۔

جواب: "الْوِسْوَاسِ" واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو "وَسْوَسَ يُوَسْوِسُ" کا مصدر ہوتا ہے۔ وسوسہ ڈالنا جیسے زِلْزَال زاء کے کسرہ سے ہے سخت ہلانا۔ یہاں "الْوَسْوَاسِ" واؤ کے فتح سے ہے یہ مصدر نہیں بلکہ صفت بمعنی اسم فاعل ہے۔ معنی: وسوسہ ڈالنے والا۔

الْخَنَّاس: خَنَسَ يَخْنِسُ (ن، ض) سے صیغہ مبالغہ ہے۔ معنی: بہت پیچھے ہٹنے والا۔ مادہ: خ، ن، س۔ (تفسیر القرآن الکریم)

سوال: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ "الْوَسْوَاسِ" اور "الْخَنَّاسِ" کا لغوی واصطلاحی معنی ذکر کریں۔

جواب: "وسوس الشيطان فی صدره" کا معنی ہے شیطان کا کسی کے دل میں غلط اور برا خیال ڈالنا۔ "الْوَسْوَاسِ" کا معنی ہے دل میں برے خیالات ڈالنے والا، شیطان۔

"خنس فلان" کا معنی ہے کسی کا نظروں سے چھپ جانا، کسی کا پیچھے رہ جانا اور "الْخَنَّاسِ" لوگوں کو دھوکہ دینے

کے لیے نظروں سے دور رہنے والا اور لوگوں کے پیچھے بھاگنے والا، مراد شیطان ہے۔

سوال: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ کا سلیس ترجمہ اور مفہوم بیان کریں۔

جواب: ترجمہ: وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو ہٹ ہٹ کر آنے والا ہے (پناہ مانگتا ہوں)۔

مفہوم: ہر شر، ہر معصیت کی ابتدا کسی نہ کسی وسوسہ ہی سے ہوتی ہے۔ وسوسہ دل میں آ کر اگر نکل گیا تو انسان محفوظ رہ گیا، لیکن وہی وسوسہ اگر جم گیا تو انسان کو کسی نہ کسی درجہ کی مضرت دینی میں یقیناً پھنسا کر رہتا ہے۔ وسوسہ ڈالنے والے سے پناہ مانگنے کی تعلیم اسی لئے عین حکمت پر مبنی ہے۔ (تفسیر ماجدی)

سوال: ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ کا تعلق کس جملے کے ساتھ ہے؟ نیز "الْجِنَّةِ" کی لغوی وضاحت کریں۔

جواب: یہ جملہ "يُوَسْوِسُ" فعل کی "هو" ضمیر سے حال ہے۔

"الْجِنَّةِ" اسم جمع ہے۔ اس کی واحد جِنِّيٌّ آتی ہے جس کے آخر میں یائے نسبت ہے جو جنوں کی نوع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (التحریر)

سوال: کیا معوذتین یا کسی دوسرے الفاظ کے ساتھ دم کرنا درست ہے؟ اس کی شرعی حیثیت بیان کریں۔

جواب: معوذتین بلکہ مکمل قرآن پاک اور ایسے الفاظ کے ساتھ دم کرنا یا کرانا جائز ہے جس میں شرک یا خرافات وغیرہ نہ ہوں اور ان کا معنی و مفہوم بھی واضح ہو۔

صحیحین، نسائی، ابوداود، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں ایسی متعدد روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوتے وقت معوذات کا خود دم کر کے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے یا بیماری وغیرہ کی حالت میں خود یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ عمل کرانا بھی ثابت ہے۔ (مسلم: ۵۸۴۳)

حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما پر یہ دعا پڑھتے تھے:

"أعيذ كما بكلمات الله التامة من كل شيطان وهامة ومن كل عين لامة" (ابوداؤد: ۴۷۳۹، صحیح)

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس جگہ درد ہوتا ہے وہاں ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھو۔ پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھتے ہوئے ہاتھ پھیرو:

"أعوذ بعزة الله وقدرته من شر ما أجد وأحاذر" (مسلم: ۵۸۶۷)

صحیح مسلم میں عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ہم جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔

ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا اس بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جن چیزوں سے تم جھاڑ پھونک کرتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو۔ (پھر فرمایا) دم وغیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک اس میں شرک نہ ہو۔ (مسلم: ۵۸٦۲)

اس مفہوم کی متعدد روایات صحیح مسلم، مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جھاڑ پھونک کرنا یا کرانا درست ہے لیکن ان الفاظ میں شرک وغیرہ کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔ اور ان کا مفہوم بھی واضح ہونا چاہیے۔ (تفہیم)

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر احادیث کی روشنی میں تسلیم کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو ہوا تھا تو کیا اس سے کفار کا یہ قول درست ثابت نہ ہوا ﴿إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا﴾؟ وضاحت کریں۔

جواب: اولاً تو یہ اصول ہی غلط ہے کہ کوئی حدیث بظاہر قرآن کے مخالف نظر آئے تو اس کا انکار کر دیا جائے۔ ثانیاً اس آیت ﴿إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا﴾ (الاسراء: ٤٧) اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کے ثبوت والی احادیث کے مابین کوئی تعارض نہیں کیونکہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ جادو کے اثر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (معاذ اللہ) پاگل ہو کر نبوت کا دعوی کر دیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کفار کا قول درست ثابت نہ ہوگا کیونکہ جادو کا اثر فقط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نجی زندگی پر ہوا تھا، تشریعی زندگی پر نہیں۔ اس کی تفصیل آئندہ سوالات میں ہے۔

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کئے جانے والے جادو کی نوعیت کیا تھی؟ اور اس جادو کے اثرات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نجی زندگی پر ہوئے تھے یا تشریعی زندگی پر؟

جواب: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کئے جانے والے جادو کے بارے مختصراً عرض ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی زریق کے ایک شخص لبید بن اُعصم نے یہود کے اکسانے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کر کے ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر بنی زریق کے کنویں ذی اُروان کی تہہ میں پتھر کے نیچے چھپا دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس جادو کا اثر ہوتے ہوتے مکمل ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں مزاج میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ آخری چالیس ایام سخت اور آخری تین ایام تو انتہائی سختی میں گزرے۔ اثرات کچھ یوں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت اندر ہی اندر گھلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کام کے بارے خیال کرتے کہ کر لیا ہے، حالانکہ نہیں کیا ہوتا

تھا۔اپنی ازواج مطہرات کے بارے خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں، حالانکہ نہیں گئے ہوتے تھے۔کسی چیز کے بارے خیال فرماتے کہ اسے دیکھا ہے، حالانکہ نہیں دیکھا ہوتا تھا۔لیکن ان سب باتوں میں ایک چیز مشترک تھی کہ تمام اثرات آپ ﷺ کی نجی زندگی پر ہوئے تھے،تشریعی زندگی پر نہیں۔

کوئی ایسی روایت، واقعہ یا شہادت نہیں ملتی کہ آپ ﷺ قرآن پاک بھول گئے ہوں یا اس کو غلط پڑھا ہو۔ نمازیں چھوڑ دی ہوں۔ارکان دین میں تبدیلی کر ڈالی ہو یا اس جیسا کوئی ایسا کام کیا ہو جو دینی تعلیمات کے منافی ہو۔

اگر واقعتا کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو آپ ﷺ کے مخالفین کب موقع ہاتھ سے جانے دیتے؟ وہ تو آپ کی غلطیوں اور لغزشوں کے منتظر تھے کہ کب ایسی حرکت آپ ﷺ سے سرزد ہو اور ہم آپ ﷺ کو معاذ اللہ رسوا کر دیں۔

اگر فرض کر لیں کہ لوگوں کو بھی معلوم نہ ہوا ہو تو پھر قرآن اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی حرف آتا ہے۔ایک طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾(الحجر:۹)اور دوسری طرف نعوذ باللہ نبی ﷺ کی طرف سے قرآن اور دین میں تبدیلی ہوتی رہی اور اللہ تعالیٰ خاموش رہے۔کیسی بعید از عقل بات ہے۔

آخر کار آپ ﷺ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تو آپ ﷺ کو خواب میں اس جادو کا توڑ بتا دیا گیا۔ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ اس کنویں پر پہنچے اور معوذتین پڑھتے گئے اور وہ جادو کی ہوئیں تمام گرہیں کھلتی گئیں۔اس طرح آپ ﷺ نے اس جادو سے نجات پائی۔اس واقعہ کی تفصیل کتب تفسیر اور حدیث میں موجود ہیں۔(تفہیم)

سوال: کیا انبیاء پر جادو ممکن ہے، اگر ممکن ہے تو کیا یہ عصمت انبیاء کے منافی تو نہیں؟

جواب: انبیاء پر جادو ہو جانا ممکن ہے اور ایسا انبیاء کے ساتھ ہونا قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے قرآن پاک میں ہے:﴿فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِیُّهُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰی ○ فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِهٖ خِیۡفَةً مُّوۡسٰی ○ قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰی﴾(ترجمہ:تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں، ان کے جادو کی وجہ سے اس خیال میں ڈالا جاتا تھا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔تو موسیٰ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔ہم نے کہا:خوف نہ کر،یقیناً تو ہی غالب ہے۔)(طٰہٰ:۶۶،۶۸)

جب جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں جادو کی وجہ سے حرکت کرتی محسوس ہوئیں تو موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے تھے۔

ایسا ہونا عصمت انبیاء کے منافی نہیں کیونکہ جب نبی جنگوں میں زخمی ہو سکتے تھے،آپ کو بچھو کاٹ سکتا تھا،تو جادو کیسے عصمت انبیاء کے منافی ہوا؟ حالانکہ آپ ﷺ سے پہلے انبیاء کو شہید بھی کیا گیا تھا۔اسی لیے کئی مفسرین کے ہاں ﴿وَاللّٰهُ یَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾(ترجمہ:اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا)(المائدۃ:۶۷) سے مراد آپ کو ہلاکت اور قتل سے

بچانا ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: "والمراد بالعصمة من الناس حفظ روحه عليه الصلوة والسلام من القتل والإهلاك"

اگر اس سے مراد یہ ہو کہ آپ کو کوئی بھی شخص نقصان نہیں پہنچا سکتا تو غزوات میں آپ ﷺ کا زخمی ہونا آیت ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدۃ:٦٧) کے منافی ہوتا۔ واللہ اعلم (تفہیم، روح)

سوال: پہلی سورت میں معاذ بہ (جس ذات کی پناہ لی گئی ہے) واحد اور معاذ منہ (جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے) متعدد ہیں، جبکہ دوسری سورت میں معاذ بہ متعدد اور معاذ منہ واحد ہے۔ حکمت ذکر کریں۔

جواب: سورۃ الفلق میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت (رب الفلق) کے ساتھ مخلوق کے شر سے عموماً اور مخلوق میں سے تین چیزوں کے شر سے خصوصاً پناہ مانگی گئی ہے (یعنی اندھیری رات، گرہوں میں پھونکنے والیوں اور حاسد کے شر سے)۔ سورۃ الناس میں صرف ایک چیز یعنی ہٹ ہٹ کر وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ مانگی گئی ہے۔ کیونکہ پہلی تین صفات انسان کے جسم و جان کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ جبکہ وسوسہ اس کے ایمان کو نقصان پہنچانے والا ہے اور ایمان کی حفاظت کی فکر جسم و جان سے بدرجہا اہم ہے۔ (تفسیر القرآن الکریم)

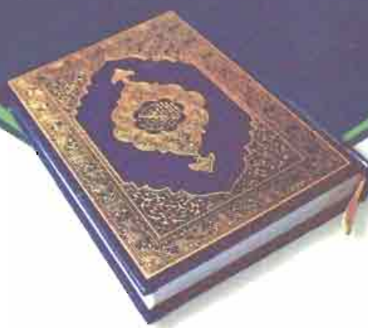
تَمَّتْ بِالْخَيْرِ
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا. اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

مصادر ومراجع

رمز	کتاب	مؤلف	مکتبہ
التحریر	التحریر والتنویر المعروف بتفسیر ابن عاشور	محمد طاہر ابن عاشور	موسسۃ التاریخ العربی بیروت لبنان
روح	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی	شہاب الدین السید محمود الالوسی	داراحیاء التراث العربی بیروت
الکشاف	الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل	جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری	دارالکتاب العربی بیروت
رازی	مفاتیح الغیب، التفسیر الکبیر	فخر الدین الرازی	داراحیاء التراث العربی بیروت
الطبری	جامع البیان عن تاویل أی القرآن المعروف بتفسیر الطبری	ابوجعفر محمد بن جریر الطبری	دار عالم الکتب
البحر	تفسیر البحر المحیط	محمد بن یوسف ابن حیان الاندلسی	داراحیاء التراث العربی
اعراب	الجدول فی اعراب القرآن وصرفہ وبیانہ مع فوائد نحویۃ ھامۃ	محمود صافی	دارالرشید بیروت
المنیر	التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج	الدکتور وھبۃ الذحیلی	دارالفکر
الثمین	التفسیر الثمین	شیخ صالح العثیمین	مکتبۃ الطبری
ابن کثیر	تفسیر القرآن العظیم	اسماعیل ابن کثیر	دارالکتاب العربی

مکمل نام	دراسات لاسلوب القرآن الکریم	محمد عبد الخالق عضیمۃ	دار الحدیث القاھرۃ
معجم النحو	معجم النحو والصرف	عبد الغنی الدقر	قدیمی کتب خانہ کراچی
فتح القدیر	فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر	محمد بن علی الشوکانی	دار ارقم بیروت
تفہیم	تفہیم القرآن	سید ابوالاعلی مودودی	ادارہ ترجمان القرآن لاہور
تدبر	تدبر قرآن	امین احسن اصلاحی	فاران فاؤنڈیشن لاہور
البیان	البیان	جاوید احمد غامدی	المورد لاہور
المحرر	المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز	ابن عطیہ الاندلسی	دار الکتب العلمیہ بیروت
مکمل نام	تفسیر القرآن الکریم (جزء تبارک وعم)	عبد السلام بن محمد	دار العلوم
انوار	انوار البیان فی حل لغات القرآن	علی محمد	مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
القاموس	القاموس الوحید	وحید الزمان قاسمی	ادارہ اسلامیات لاہور
لسان	لسان العرب	ابن منظور	دار الثبات الریاض
تاج	تاج العروس من جواھر القاموس	محمد مرتضی الزبیدی	دار الفکر بیروت
التفسیر القیم	التفسیر القیم لابن القیم	جمعہ: محمد اویس ندوی	مکتبۃ السنۃ المحمدیہ مصر

ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر



اعراب القرآن وتفسیرہ

(تیسواں پارہ، سوالاً جواباً)